Web: www.welayat.com. E-mail: welayatfoundation@gmail.com

انسان شناسی-٤٦

انسان شناسی

مؤلف: حجۃ الاسلام محمود رجبی

مترجم: مولانا سید محمد عباس رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان شناسی

تالیف

حجۃ الاسلام والمسلمین محمود رجبی

مترجم

مولانا سید محمد عباس رضوی

نام کتاب : انسان شناسی

مؤلف : حجۃ الاسلام والمسلمین محمود رجبی

مترجم : مولانا سید محمد عباس رضوی

نظر ثانی : مولانا سید نذر امام نقوی

طباعت : بار دوم

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

سال اشاعت : مارچ ۲۰۱۶ء

قیمت : دوسو (۲۰۰) روپئے

تعاون واشتراک: مجمع جہانی اہلبیتؑ، قم المقدسہ، ایران

ISBN : 978-81-927614-6-6

پریس : پرنٹولا جی انس، کوچہ چہلان دریا گنج دہلی

ناشر

ولایت فاؤنڈیشن، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ''اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقْلَیْنِ، کِتَابَ اللّٰہِ، وَعِتْرَتِی اَھْلَ بَیْتِی مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَالَنْ تَضِلُّوا اَبَداً وَاِنَّھُمَالَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ''

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں تمہارے درمیان دوگرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں:

(ایک) کتاب خدااور (دوسری) میری عترت اہل بیت علیہم السلام، اگر تم انھیں اختیار کئے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں''۔

(صحیح مسلم: ۱۲۲/۷، سنن دارمی: ۴۳۲/۲، مسند احمد: ج ۳ ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹ ۳۶۶/۴ و ۳۷۱۔ ۱۸۲/۵، اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۳: ۱۰۹، ۱۴۸، ۵۳۳ وغیرہ)

عرض ناشر

انسان شناسی ہر دور میں اہل علم وتحقیق اور صاحبان فکر ونظر کے لئے اہم ترین مسئلہ رہا ہے۔انسان شناسی ہی انسانی معارف کی اصل واساس ہے۔انسان کے ظاہری وجسمانی وجود کے علاوہ ایک باطنی وروحانی وجود بھی ہے جس کی شناخت نہایت ضروری ہے۔

انسان کی حقیقت وشخصیت کی شناخت، اس کی خلقت کی غرض وغایت، کیفیت وجود، آغاز وانجام اور معنوی کمال و اخروی سعادت کو قرآنی ہدایات وتعلیمات اور اسلامی دستورات واحکامات کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب ''انسان شناسی'' حجۃ الاسلام والمسلمین محمود رجبی صاحب کی فارسی تالیف ہے جس کا اردو ترجمہ حجۃ الاسلام سید محمد عباس رضوی صاحب نے کیا ہے۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ابتداء ہی میں پوری کتاب کے مطالب کو نقشہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں بنیادی مطالب کا خاکہ اور ہر بحث کا مقام واضح ہوجائے اور مطالعہ میں دقت پیش نہ آئے نیز ہر فصل کے مطالب کو بیان کرنے کے بعد خلاصہ اور آخر میں ٹسٹی سوالات بھی درج کردیئے گئے ہیں تاکہ ان کی مدد سے کتاب کے مطالعہ کے ضمن میں اپنے جوابات کا حل تلاش کیا جاسکے۔

ولایت فاؤنڈیشن اپنے مطبوعاتی سفر کو جاری رکھتے ہوئے کتاب ہٰذا کو طباعت کے مراحل سے گذار کر انسان شناسی کے موضوع پر تحقیق و جستجو کرنے والوں اور انسانیت کی لاج رکھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔انشاء اللہ یہ کتاب معرفت انسان کے لئے ایک وسیلہ وذریعہ قرار پائے گی۔

ولایت فاؤنڈیشن

نئی دہلی

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کے ہر فرد اور ہر قوم نے قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیؐ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کردیا آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل، فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ ولولہ اور شعور نہ رکھتے ہیں تو مذہب عقل وآگہی سے روبرو ہونے کو توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگر چہ رسول اسلام کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت وپاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے سے پیچیدگیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم ہو کر رہ گئی تھی، پھر بھی حکومت وسیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء ودانشور دنیائے اسلام کو پیش کئے جنہوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر، اسلام وقرآن مخالف فکری ونظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام وقرآن اور مکتب اہل بیتؑ کی طرف اٹھی اور مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری ومعنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب وکامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر واشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل وشعور کو جذب کرنے والے افکار ونظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت وطہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری ویکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن وعترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق ومعنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان

وولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے کہ عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدوخال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خونخواروں کی نام نہاد تہذیب وثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کوامن ونجات کی دعوت کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی وتحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکرگزار ہیں اور خودکومؤلفین ومترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیرنظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، حجۃ الاسلام والمسلمین عالی جناب مولانا محمود رجبی صاحب کی گرانقدر کتاب ''انسان شناسی'' کو فاضل جلیل مولانا سید محمد عباس رضوی اعظمی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکرگزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، نیز ہم اپنے ان تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کے ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست

پہلی فصل: مفہوم انسان شناسی

دوسری فصل: ہیومنزم یا عقیدۂ انسان

تیسری فصل: خود فراموشی

چوتھی فصل: انسان کی خلقت

پانچویں فصل: انسان کی فطرت

چھٹی فصل: نظام خلقت میں انسان کا مقام

ساتویں فصل: آزادی واختیار

آٹھویں فصل: مقدمات اختیار

نویں فصل: آخری کمال

دسویں فصل: دنیا و آخرت کا رابطہ

مقدمہ

﴿ ثُمَّ أنشأناهُ خلقاً آخرَ فتبارک اللّٰهُ أحسَنُ الخالِقِينَ ﴾

پھر ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا پس بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔

انسان بہت سے انتخابی عمل کا سامنا کرتا ہے جس میں سے صرف بعض کا انتخاب کرتا ہے، بعض کو دیکھتا ہے، بعض کے بارے میں سنتا ہے اور اپنے ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضاء کو بعض کاموں کی انجام دہی میں استعمال کرتا ہے، قوت جسمانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ فکری، جذباتی اور بہت سے مخلوط و مختلف اجتماعی روابط، علمی ذخائر اور عملی مہارتوں میں اضافہ کی وجہ سے انتخابی دائرے صعودی شکل میں اس طرح وسیع ہو جاتے ہیں کہ ہر لحہ ہزاروں امور کا انجام دینا ممکن ہوتا ہے، لہٰذا انتخاب کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

طریقہ کار کی تعین و ترجیح کے لئے مختلف ذرائع موجود ہیں مثلاً فطری رشد خواہشات کی شدت، عدم تحفظ کا احساس، عادات واطوار، پیروی کرنا، سمجھانا اور دوسرے نفسیاتی و اجتماعی اسباب کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے لیکن سب سے ضروری عقلی اسباب ہیں جو بھی طریقۂ کار کو مدنظر

سورہ مؤمنون، آیت: ۱۴

رکھتے ہوئے ہر ایک کی معراج کمال اور انسانی سعادت کے لئے موثر اور ضروری طریقۂ کار کی تعین وترجیح اور سب سے بہتر واہم انتخاب کے لئے درکار ہیں جو انسانی ارادہ کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کی حقیقی اشرفیت اور برتری کے راز کو انہیں اسباب وعلل اور طریقۂ کار کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیئے۔

اعمال کی اہمیت اور ان کا صحیح انتخاب اس طرح کہ انسان کی دنیا و آخرت کی خوش نصیبی کا ذمہ دار ہو، معیار اہمیت کی شناخت پر موقوف ہے، ان معیاروں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت انسان، کیفیت وجود، آغاز وانجام اور کمال وسعادت اخروی کو سمجھا جائے۔ یہ موضوع ایک دوسرے زاویہ فکر کا محتاج ہے جس کو انسان شناسی کہا جاتا ہے۔

لہٰذا انسان شناسی کو معارف انسانی کی سب سے بنیادی چیز سمجھنا چاہیئے اور اس کا مطالعہ خاص کر ان افراد کے لئے ضروری ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی درست و بے نقص اور عقلی معیار پر استوار ہو۔

اس کتاب میں انسان شناسی کے بنیادی مسائل کی تحقیق پیش کی جائے گی۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ انسان کی حقیقی شخصیت کی شناخت، اس کی پیدائش کا ہدف اور اس ہدف تک رسائی کی کیفیت، قرآنی تعلیمات، اسلامی احکام اور عقلی تحلیل وتجزیہ پر موقوف ہے لہٰذا کتاب کے اکثر مباحث میں انسان شناسی کے نظریات کو قرآن کریم اور دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلے تو یہ کتاب بالمشافہ تدریس کے لئے مرتب کی گئی تھی لیکن ان افراد کی بہت سی درخواستوں کی وجہ سے جو معارف اسلامی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ''موسسۂ (اکیڈمی) آموش وپژوہش امام خمینی'' کے پروگرام میں شرائط ومشکلات کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا ان کے

لئے ایک خصوصی پروگرام "تدریس از راہ دور"[1] منظور کیا گیا جس میں نقش و نگار سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے معانی و مفاہیم کو غیر حضوری شکل میں اور نہایت ہی مناسب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

آپ ابتدائے مطالعہ ہی سے ایک تعلیمی پروگرام کے شروع ہو جانے کا احساس کریں گے اور رہنمائیوں کو اپنے لئے رہنما و راہبر محسوس کریں گے، یہ راہنمائیاں مؤلف اور قاری کے درمیان گفتگو اور مکالمہ کی شکل میں ڈھالی گئی ہیں جو کتاب کے مطالب کو درست و دقیق اور مؤثر انداز میں حاصل کرنے کی ہدایت کرتی ہیں، البتہ بہتر نتیجہ آپ کے مطالعہ پر موقوف ہے۔ ابتدا ہی میں پوری کتاب کے مطالب کو نموداری شکل میں پیش کیا گیا ہے تا کہ کتاب کے بنیادی مطالب کا خاکہ اور ہر بحث کی جگہ مشخص ہو جائے اور کتاب کے مطالعہ میں رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔ ہر فصل کے مطالب خود اس فصل سے مربوط تعلیمی اہداف سے آغاز ہوتے ہیں، ہر فصل کے مطالعہ کے بعد اتنی فہم و توانائی کی ہمیں امید ہے کہ جس سے ان اہداف کو حاصل کیا جا سکے نیز ان رہنمائیوں کے ساتھ ساتھ یاد دہانی کے عنوان سے ہر فصل کے مطالب کو بیان کرنے کے بعد بطور آزمائش سوالات بھی درج کئے گئے ہیں جن کے جوابات سے آپ اپنی توانائی کی مشق اور آزمائش کریں گے، سوالات بنانے میں جان بوجھ کر ایسے مسائل پیش کئے گئے ہیں جو کتاب کے مطالب پر تسلط کے علاوہ آپ کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور حافظہ پر اعتماد کے ساتھ ساتھ مزید غور و فکر کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

---

[1] راہ دور سے تعلیمی پروگرام کی تدوین اور اس کی انجام دہی میں ہم ماہرانہ تحقیقات و مطالعات نیز اکیڈمی کے داخلی و بیرونی معاونین و محققین کی ایک کثیر تعداد کی شب و روز کوشش و محنت، ہمت اور لگن سے بہرہ مند تھے اور ہم ان تمام دوستوں، خصوصاً "پیام نور" یونیورسٹی کے جن دوستوں نے ہماری معاونت کی ہے شکر گذار ہیں۔

اسی طرح ہر فصل کے آخر میں اس کا خلاصہ اور مزید مطالعہ کے لئے منابع ذکر کئے گئے ہیں، ہر فصل کے خلاصہ میں مختلف فصلوں کے مطالب کے درمیان ہماہنگی برقرار رکھنے کے لئے آنے والی فصل کے بعض مباحث کو کتاب کے کلی مطالب سے ربط دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک ''آزمائش'' بھی ہے جس میں کلی مطالب ذکر کئے گئے ہیں تا کہ متن کتاب سے کئے گئے سوالات کے جوابات سے اپنی فہم کی میزان کا اندازہ لگایا جا سکے۔ چنانچہ اگر کتاب کے کسی موضوع کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہر فصل کے آخر میں مطالعہ کے لئے بیان کی گئی کتابوں سے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

مطالب کی سمجھ میں پیش آنے والی مشکلات سے دوچار ہونے کی صورت میں اپنے سوالات کو ادارہ کے ''تدریس از راہ دور'' کے شعبہ میں ارسال کر کے جوابات دریافت کر سکتے ہیں، اسلوب بیان کی روش میں اصلاح کے لئے آپ کی رائے اور اظہار نظر کے مشتاق ہیں، اللہ آپ کی توفیقات میں مزید اضافہ کرے۔

مؤسسہ آموزشی و پژوهشی امام خمینیؒ

مطالعہ کتاب کی مکمل رہنمائی

فصل : ۱

فصل : ۲

فصل: ۳
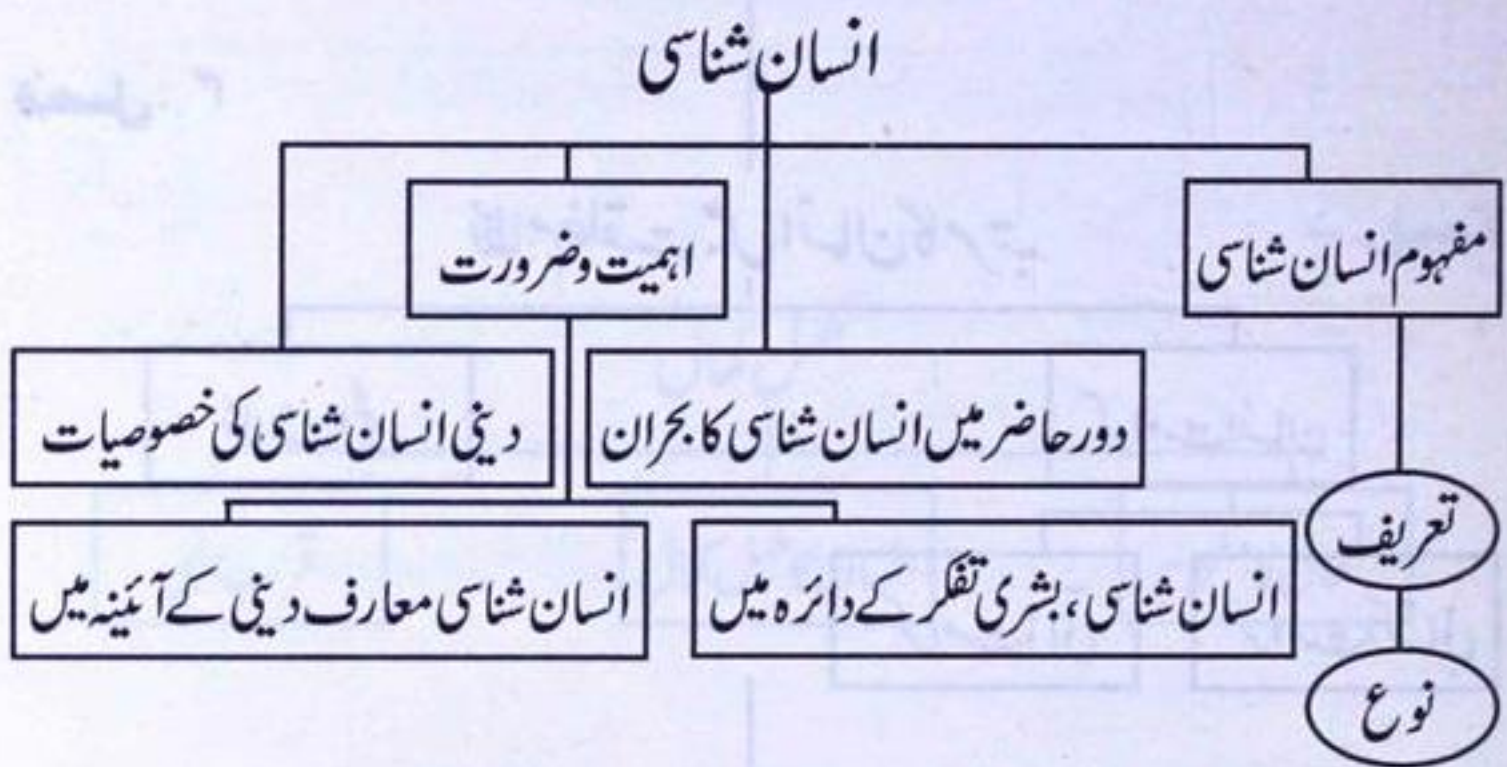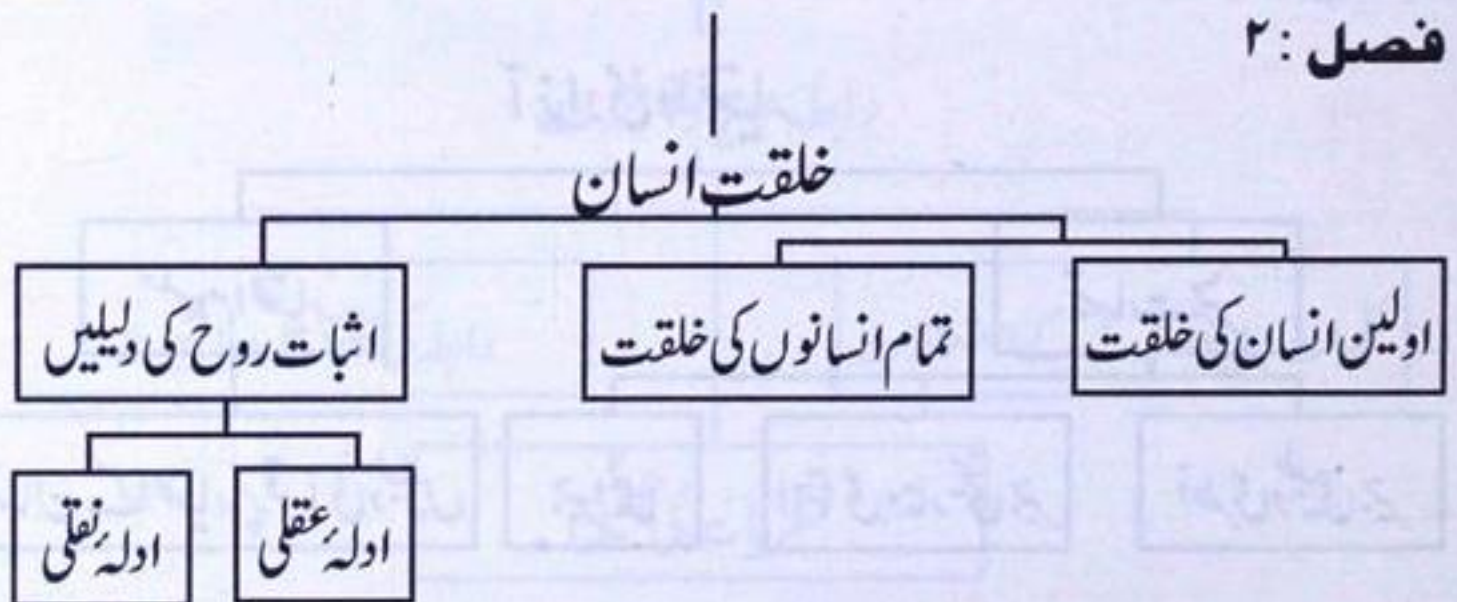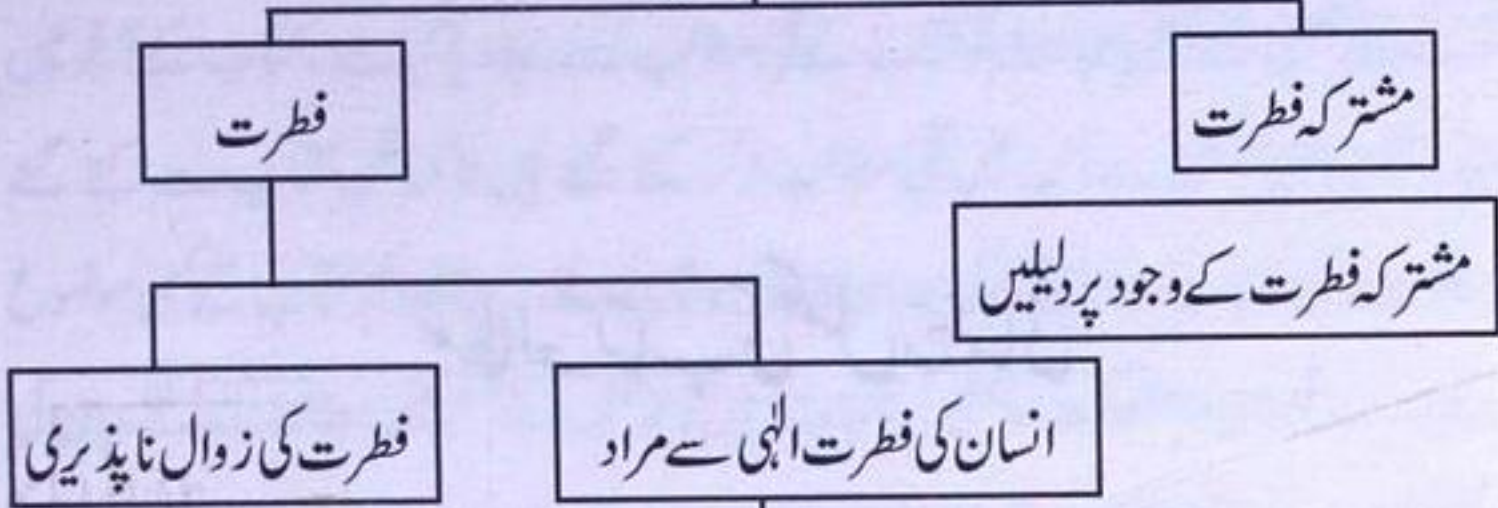
انسانی فطرت
مشترکہ فطرت
فطرت
مشترکہ فطرت کے وجود پر دلیلیں
انسان کی فطرت الٰہی سے مراد
فطرت کی زوال ناپذیری
فصل: ۴
نظام خلقت میں انسان کا مرتبہ
خلافت الٰہی
کرامت انسان
کرامت ذاتی
کرامت اکتسابی
فصل: ۵
آزادی واختیار
مفہوم اختیار
شبہات جبر
انسان کے اختیار پر قرآنی دلیلیں
جبر الٰہی
اجتماعی وتاریخی جبر
فطری وطبیعی جبر

فصل:٦
اختیار کے اصول
عناصر اختیار
آگاہی ومعرفت
ارادہ وخواہش
قدرت وطاقت
فصل:٧
مکمل کمال
کمال کامفہوم
انسان کامکمل کمال
قرب الٰہی
فصل:٨
رابطۂ دنیاوآخرت
کلمات دنیاوآخرت کے استعمالات
رابطہ کی حقیقت وواقعیت
نظریات کی تحقیق

فصل:۹

خودفراموشی
خودفراموشی کے ذمہ دار
قرآن اور خودفراموشی
خودفراموشی کا علاج
ہیگل
نیچ
مارکس

۱

مفہوم انسان شناسی

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔ ''انسان شناسی'' کی تعریف اوراس کے اقسام کو بیان کریں؟

۲۔ جملہ ''انسان شناسی، فکر بشر کے آئینہ میں'' کی وضاحت کریں؟

۳۔ معرفت خدا، نبوت و معاد کا انسان شناسی سے کیا رابطہ ہے دو سطروں میں بیان کریں؟

۴۔ انسان شناسی کے مجموعی اور جزئی موضوعات کی مثالوں کا ذکر کریں؟

۵۔ خود شناسی سے کیا مراد ہے اوراس کا دینی انسان شناسی سے کیا رابطہ ہے بیان کریں؟

۶۔ ''دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران'' میں سے چار موضوعات کی وضاحت کریں؟

خدا، انسان اور دنیا فکر بشر کے تین بنیادی مسائل ہیں جن کے بارے میں پوری تاریخ بشر کے ہر دور میں ہمیشہ بنیادی، فکری اور عقلی سوالات ہوتے رہتے ہیں اور فکر بشر کی ساری کوششیں انہی تین بنیادی چیزوں پر متمرکز اور ان سے مربوط سوالات کے صحیح جوابات کی تلاش میں ہیں۔

بہر حال انسان کی معرفت، اس کی مشکلات کا حل نیز اس کے پوشیدہ اسرار کافی اہمیت کے حامل ہیں، جنہوں نے بہت سے دانشوروں کو اپنے مختلف علوم کے شعبوں میں مشغول کر رکھا ہے۔[1]

مذاہب آسمانی کی تعلیمات میں (خصوصاً اسلام میں) معرفت خدا کے مسئلہ کے بعد معرفت انسان سب سے اہم مسئلہ مانا جاتا ہے، دنیا کا خلق کرنا، پیغمبروں کو مبعوث کرنا، آسمانی کتابوں کا نزول درحقیقت آخرت میں انسان کی خوش نصیبی کے لئے انجام پایا ہے اگرچہ قرآن کی روشنی میں سبھی چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور کوئی بھی چیز اس کے مقابلہ میں نہیں ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کائنات کو ایک ایسے دائرے سے کہ جس کے دو نقطہ ہوں تعبیر کیا گیا ہے جس کی حقیقی نسبت کا ایک سرا اوپر (اللہ) ہے اور دوسرا سرا نیچے (انسان) کی طرف ہے۔[2] اور

---

[1] منجملہ علوم جو انسان اور اس کے اسرار و رموز کی تحلیل و تحقیق کرتے ہیں جیسے علوم انسانی تجربی اور دیگر فلسفے جیسے علم النفس، فلسفہ خودشناسی، فلسفہ اخلاق، فلسفہ عرفان، فلسفہ اجتماعی، فلسفہ علوم اجتماعی، فلسفہ تاریخ وحقوق وغیرہ۔

[2] ایزوتسو، توشی ہیکو، قرآن میں خدا و انسان، ترجمہ احمد آرام، ص ۹۲۔

انسان بھی ایک عرصۂ دراز سے، اپنے وسیع تجربے کے ذریعہ اسی نسبت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جب کہ انسان شناسی کے ماہرین نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ انسان کی معرفت کے اسباب و وسائل، پوری طرح سے انسان کی حقیقت اور اس کے وجودی گوشوں کے حوالے سے ضروری سوالات کا جواب نہیں دے سکتے ہیں لہٰذا آج انسان کو ایسا وجود جس کی شناخت نہ ہو سکی ہو یا انسان کی معرفت کا بحران وغیرہ جیسے الفاظ سے یاد کیا جانے لگا۔

مذکورہ دو حقیقتوں میں غور و فکر ہمیں مندرجہ ذیل چار سوالات سے روبرو کرتا ہے:

۱۔ انسان کے بارے میں کئے گئے بنیادی سوال کون سے ہیں اور انسان کی معرفت میں کیسی کوششیں ہونی چاہیئے اور ان سوالات کے لئے مناسب جوابات تک رسائی کیسے ممکن ہے؟

۲۔ انسان کی معرفت میں بشر کی مسلسل حقیقی تلاش کا سبب کیا ہے؟ اور کیا دوسرے بہت سے اسباب کی طرح فطری جستجو کا وجود ہی ان تمام کوششوں کی وضاحت و تحلیل کے لئے کافی ہے؟ یا دوسرے اسباب و علل کی بھی جستجو ضروری ہے یا انسان کی معرفت کے اہم مسائل اور اس کی دنیوی واخروی زندگی نیز علمی و دینی امور میں گہرے اور شدید رابطوں کو بیان کرنا ضروری ہے؟

۳۔ دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران سے کیا مراد ہے اور اس بحران کی وجوہات اور ان کا تسلسل کیا ہے؟

۴۔ دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران سے نجات کے لئے کیا کوئی بنیادی حل موجود ہے؟ دین اور دینی انسان شناسی کا اس میں کیا کردار ہے؟

مذکورہ سوالات کے مناسب جوابات حاصل کرنے کے لئے اس فصل میں انسان شناسی کے مفہوم کی تحقیق اور اس کے اقسام، انسان شناسی کی ضرورت اور اہمیت، انسان شناسی کے بحران اور اس کی اسباب نیز دینی انسان شناسی کی خصوصیات کے بارے میں ہم گفتگو کریں گے۔

ا۔انسان شناسی کی تعریف

ہر وہ مجموعۂ معرفت جو کسی شخص، گروپ یا طبقہ کا کسی زاویہ سے جائزہ لیتا ہے اس کو انسان شناسی کہا جاسکتا ہے، انسان شناسی کی مختلف اور طرح طرح کی قسمیں ہیں کہ جس کی ایک دوسرے سے خصوصیت یہ ہے کہ اس کی روش یا زاویہ نگاہ مختلف ہے، اس مقولہ کو انسان شناسی کی روش کے اعتبار سے تجربی، عرفانی، فلسفی اور فلسفہ دینی اور انسان شناسی کی نوعیت کے اعتبار سے کلی اور جزئی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔روش اور نوعیت کے اعتبار سے انسان شناسی کی اقسام۔

انسان شناسی کی اقسام

- روش کے اعتبار سے
  - تجربی۔
  - عرفانی۔
  - فلسفی۔
  - دینی
- نوعیت کے اعتبار سے
  - جامع۔
  - اجزاء
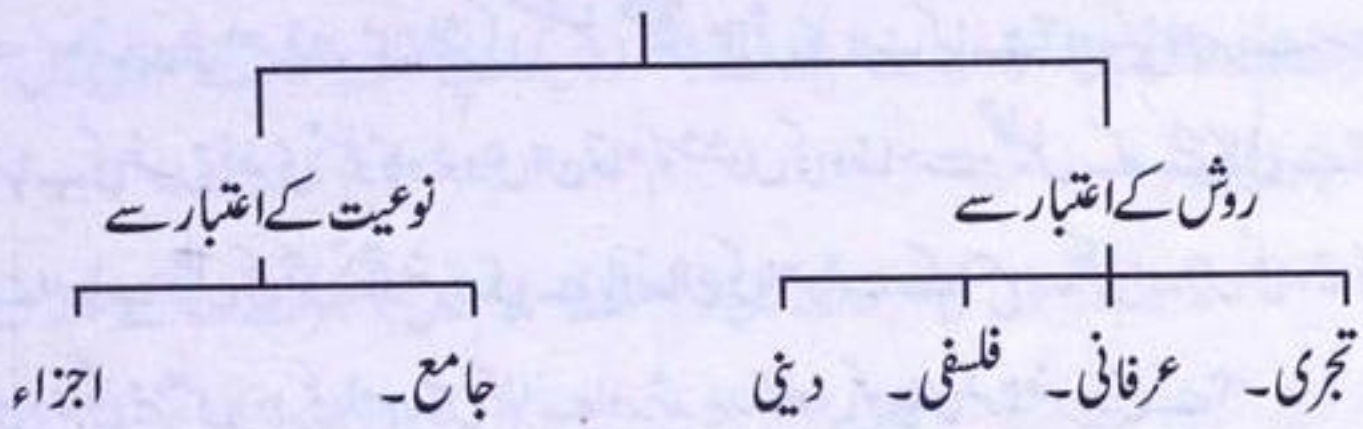
۲۔انسان شناسی کی اقسام

تجربی،عرفانی، فلسفی اور دینی

متفکرین نے انسان کے سلسلہ میں کیئے گئے سوالات اور معموں کو حل کرنے کے لئے پوری تاریخ انسانی میں مختلف طریقہ کار کا سہارا لیا ہے،بعض لوگوں نے تجربی روش سے مسئلہ کی تحقیق کی ہے اور''انسان شناسی تجربی''[1] کی بنیاد رکھی جس کے دامن میں انسانی علوم کے سبھی مباحث موجود ہیں۔[2]

---

[1] انسان شناسی تجربی کو انسان شناسی Anthropology کے مفہوم سے مخلوط نہیں کرنا چاہیئے ،جیسا کہ متن درس میں اشارہ ہو چکا ہے،انسان شناسی تجربی،علوم انسانی کے تمام موضوعات منجملہ Anthropology کو بھی شامل ہے، گرچہ پوری تاریخ بشر میں مختلف استعمالات موجود ہیں لیکن دور حاضر میں علمی اداروں یونیورسٹیوں میں اس کے رائج معانی علوم اجتماعی کے یا علوم انسانی تجربی کے موضوعات میں سے ہے جس میں انسان کی تخلیق کا سبب، آبادی کی وسعت اور اس کی پراکندگی انسانوں کی درجہ بندی،قوموں کا ملاپ،ماحول و مادی خصوصیات اور اجتماعی وسماجی موضوعات، نیز روابط جیسے مسائل کو تجربہ کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔

[2]۔فارسی میں کلمہ علوم انسانی کبھی کلمہ Humanities اور کبھی کلمہ Sciences Social کے مترادف قرار پاتا ہے۔کلمۂ Humanities کا فارسی معنی علوم انسانی یا معارف انسانی قرار دینا بہتر ہے،اس کا ابتدائی استعمال ان انگریزی اور یونانی آثار پر ہوتا تھا جو قرون وسطی میں اہل مدرسہ کی خدا شناسی کے برخلاف انسانی پہلو رکھتا تھا اور آج ان علوم میں استعمال ہوتا ہے جو انسان کی زندگی، تجربہ سلوک و کردار کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔یورپ اور امریکہ میں یہ کلمہ ادبیات، لسان، فلسفہ، تاریخ، ہنر، خدا شناسی اور طبیعی و اجتماعی علوم کی موسیقی کے موضوعات کی جدائی کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور روش کے اعتبار سے علمی و تجربی روش میں منحصر نہیں ہے، معارف دینی بھی جب فکر بشر کا نتیجہ ہوگی تو اسی دائرہ اختیار میں قرار دی جائے گی،اسی

..........بقیہ ۲ نمبر کا حاشیہ اگلے صفحہ پر

بعض لوگوں نے عرفانی سیر وسلوک اور مشاہدہ کو انسان کی معرفت کا صحیح طریقہ مانا ہے اور وہ کوششیں جو اس روش کے تحت انجام پائی ہیں ان کے ذریعہ ایک طرح سے انسان کی معرفت کو حاصل کیا ہے جسے انسان شناسی عرفانی کہا جا سکتا ہے، دوسرے گروہ نے عقلی اور فلسفی تفکر سے انسان کے وجودی گوشوں کی تحقیق کی ہے اور فکری تلاش کے ماحصل کو انسان شناسی فلسفی کا نام دیا گیا ہے اور آخر کار ایک گروہ نے دینی تعلیمات اور نقل روایت سے استفادہ کرتے ہوئے انسان کی معرفت حاصل کی اور انسان شناسی دینی کی بنیاد رکھی ہے، اس کتاب کی آئندہ بحثوں میں جو منظور نظر ہے وہ دینی تعلیمات اور نقل احادیث کے آئینہ میں انسان کی تحقیق ہے لہٰذا انسان شناسی کے باب میں دینی تعلیمات کو ہم آئندہ مباحث میں اپنا موضوع قرار دیں گے اگر چہ انسان شناسی

بقیہ ص: ۳۵ کا حاشیہ......

بنا پر دینی معارف کے تفکرات واعتبارات خدا کی طرف سے اور فطرت سے بالاتر ذات سے حاصل ہونے کی وجہ سے اس گروہ سے خارج ہیں، کلمۂ Social Sciences کا بالکل دقیق مترادف ''علوم اجتماعی تجربی'' ہے اور کبھی انسانی علوم تجربی کا استعمال، طبیعی تجربی علوم کے مدمقابل معنی میں ہوتا ہے اور جامعہ شناسی، نفسیات شناسی، علوم سیاسی واقتصادی حتی مدیریت، تربیتی علوم اور علم حقوق کے موضوعات کو بھی شامل ہے اور کبھی اس کے حصار میں جامعہ شناسی، اقتصاد، علوم سیاسی اور انسان شناسی (Anthropology) بھی قرار پاتے ہیں اور اجتماعی نفسیات شناسی اجتماعی حیات شناسی اجتماعی جغرافیا اور اس کے سرحدی گوشے اور حقوق، فلسفہ اجتماعی، سیاسی نظریات اور طریقہ عمل کے اعتبار سے تاریخی تحقیقات (تاریخ اجتماعی، تاریخ اقتصادی) اس کے مشترکہ موضوعات میں شمار ہوتے ہیں۔ رجوع کریں:

Kuper Adman The Social Sciences Encyclopedian Rotlage and Kogan Paul.

اور فرہنگ اندیشہ نو، بولک بارس وغیرہ، ترجمہ پاشائی نیز:

The Odorson George, A Modern Dictionary of Social Sciences.

فلسفی، تجربی اور عرفانی معلومات بھی بعض جگہوں پر وضاحت اور انسان شناسی دینی میں ان کا تقابل اور ہماہنگی کے بارے میں گفتگو کی جائے گی لہٰذا انسان شناسی میں ہماری روش، نقل روایت اور ایک طرح سے تعبدی یا تعلیمات وحی کی روش ہوگی۔[1]

انسان شناسی خرد و کلاں یا جامع واجزاء

انسان کے بارے میں پوری گفتگو اور انجام دی گئی تحقیق کو دو عام گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، کبھی انسان کی تحقیق میں کسی خاص شخص، کوئی مخصوص گروہ، یا کسی خاص زمان و مکان کو پیش نظر رکھ کر افراد کے سلسلہ میں مفکرین نے سوال اٹھائے ہیں اور اسی کے متعلق جواب لانے میں کامیابی حاصل کی ہے اور کبھی انسان بطور مجموعی کسی شخص یا خاص شرائط زمان و مکان کا لحاظ کئے بغیر مفکرین و محققین کی توجہ کا مرکز قرار پاتا ہے اور انسان شناسی کے راز کشف کئے جاتے ہیں، مثال

---

[1] طریقہ وحی سے مراد یہ ہے کہ واقعیت اور حقائق کی شناخت میں تجربی طریقہ سے استفادہ کرنے کے بجائے عقلی یا شہودی اور روحی الٰہی کے ذریعہ معرفت حاصل کی جائے۔ ایسی معرفت پیغمبروں کے لئے منزل شہود کی طرح ہے اور دوسرے جو مقدس دینی متون کے ذریعہ اسے حاصل کرتے ہیں وہ سندی یا نقلی طریقہ سے حقیقت کو حاصل کرنا ہے۔ اسی بنا پر اس کو روش نقلی بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ کبھی طریقہ وحی سے مراد، دین کے مورد تائید طریقوں کا مجموعہ ہے جو روش تجربی، عقلانی اور شہودی کو اس شرط پر شامل ہے کہ جب وہ واقع نما اور ان کا قطعی ہونا ثابت ہو جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس قسم کی روش کو دینی روش کہنا چاہیئے۔ دینی متون اور منابع کے درمیان صرف وہ اسلامی منابع مورد توجہ ہونے چاہئیں جو ہمارے نظریہ کے مطابق قابل اعتبار ہوں۔ چونکہ تمام منابع اسلامی کے اعتبار سے (خواہ آیات و روایات ہوں) مسئلہ کی تحقیق و تحلیل کے لئے مزید وقت درکار ہے لہٰذا اسلام کا نظریہ بیان کرنے میں تمام مذاہب و فرقوں کے درمیان سب سے مستحکم و متقن منبع دینی یعنی قرآن مجید سے انسان شناسی کے مختلف موضوعات کی تحقیق و تحلیل میں استفادہ کریں گے اور مخصوص موارد کے علاوہ روائی منابع سے استناد نہیں کریں گے، اسی بنا پر مورد بحث انسان شناسی کو اسلامی انسان شناسی یا قرآنی انسان شناسی بھی کہا جاسکتا ہے۔

کے طور پر انسان کے جسمانی طول، عرض، عمق کی بناوٹ کی کیفیت کے بارے میں، اسی طرح اولین انسان یا جسم میں تاریخی اعتبار سے تبدیلی اور تغیر کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے یا ابتدائی انسانوں کے فکری، عاطفی و عملی یا مخصوص سرزمین میں قیام یا معین مرحلۂ زمان میں زندگی گزارنے والے افراد کے طریقۂ زندگی، کلچر، آداب و رسومات کے بارے میں تحقیق و گفتگو ہوتی ہے اور کبھی عام طور پر انسان کے مجبور و مختار، دائمی اور غیر دائمی یا دوسری مخلوقات سے اس کی برتری یا عدم برتری نیز اس کے انتہائی کمال اور حقیقی سعادت و خوش بختی کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے جو کسی ایک فرد یا کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں ہوتی۔ انسان شناسی کی پہلی قسم کو انسان شناسی خرد یا ''جز نما'' اور انسان شناسی کی دوسری قسم کو انسان شناسی کلاں یا ''کل نما'' کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے زاویہ نگاہ سے انسان شناسی کلاں یا کل مورد نظر ہے اسی بنا پر انسان کے سلسلہ میں زمان و مکان اور معین شرائط نیز فرد انسانی کے کسی خاص شخص سے استثنائی موارد کے علاوہ گفتگو نہیں ہوگی، لہٰذا اس کتاب میں مورد بحث انسان شناسی کا موضوع، انسان بعنوان عام ہے اور انسان کو مجموعی طور پر اور مجموعی مسائل کے تناظر میں پیش کیا جائے گا اور وہ تجربی اطلاعات و گزارشات جو کسی خاص انسان سے مختص ہیں یا کسی خاص شرائط و زمان و مکان کے افراد سے وابستہ ہیں اس موضوع بحث سے خارج ہیں۔

۳۔ انسان شناسی کی ضرورت اور اہمیت

انسان شناسی کی ضرورت اور اہمیت کے لئے دو زاویہ نگاہ سے تحقیق کی جاسکتی ہے:

پہلے زاویہ میں، اس مسئلہ کی بشری فکر کے دائرہ میں تحقیق کی جاتی ہے۔

دوسرے زاویہ میں انسان شناسی کی اہمیت کو دینی تعلیمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

الف: انسان شناسی، بشری فکر کے دائرے میں

با مقصد زندگی کی تلاش

انسان کی زندگی کا با مقصد اور بے مقصد ہونا اس کے مختلف تصورات سے پوری طرح مرتبط ہے اور ان مختلف تصورات کو انسان شناسی کی تحقیقات ہمارے لئے فراہم کرتی ہے، مثال کے طور پر اگر انسان شناسی میں ہم یہ تصور ذہن میں بٹھالیں کہ انسان کا کوئی معقول و مناسب ہدف نہیں ہے جس پر اپنی پوری زندگی گذارتا رہے یا اگر انسان کو ایسی مخلوق سمجھا جائے جو زبردستی الٰہی، تاریخی، اجتماعی زندگی گذارنے پر مجبور ہو اور خود اپنی تقدیر نہ بنا سکے تو ایسی صورت میں انسان کی زندگی بے معنی اور کاملاً بے مقصد اور عبث ہوگی، لیکن اگر ہم نے انسان کو باہدف (معقول و مناسب ہدف) اور صاحب اختیار تصور کیا اس طرح سے کہ اپنے اختیار سے تلاش و کوشش کے ذریعہ اس بہترین ہدف تک پہونچ سکتا ہے تو اس کی زندگی معقول و مناسب اور بامعنی و با مقصد تصور کی جائے گی۔[1]

---

[1] معانی زندگی کی تلاش کا مسئلہ نفسیاتی علاج میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور نفسیاتی علاج کے موضوعات میں سے ایک با مقصد علاج (Logotherapy) ہے، با مقصد علاج کے نفسیاتی ماہرین کا عقیدہ ہے کہ تمام نفسیاتی علاج جس کا کوئی جسمانی سبب نہیں ہے زندگی کو با مقصد بنا کر علاج کیا جا سکتا ہے، با مقصد علاج کا موجد ''وکٹر فرینکل'' معتقد ہے کہ زندگی کو ایسا با مقصد بنانا چاہیئے کہ انسان اپنی زندگی گذارنے میں ایک مکمل ہدف کا تصور حاصل کرلے تا کہ اس کے زیر سایہ اس کی پوری زندگی با مقصد ہو جائے اور ایسا کوئی لاجواب سوال جو اس کی زندگی کے با مقصد ہونے کو متزلزل کرے اس کے لئے باقی نہ رہے ایسی صورت میں جب کہ اس کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا کوئی جسمانی سبب نہیں ہے اس طرح قابل علاج ہیں۔ با مقصد علاج کے سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

الف: انسان در جستجوی معنا، ترجمہ اکبر معارفی۔ ب: پزشک وروح، ترجمہ بہزاد بیرشک۔ ج: فریاد ناشنیدہ معنا، ترجمہ بہزاد بیرشک، از وکٹر فرینکل۔

اجتماعی نظام کا عقلی ہونا[1]

تمام اجتماعی اور اخلاقی نظام اس وقت قابل اعتبار ہوں گے جب انسان شناسی کے بعض وہ بنیادی مسائل صحیح اور واضح طور سے حل ہو چکے ہوں جو ان نظاموں کے اصول کو ترکیب وترتیب دیتے ہیں۔ اصل میں اجتماعی شکل اور نظام کے وجود کا سبب انسان کی بنیادی ضرورتوں کا پورا کرنا ہے اور جب تک انسان کی اصلی اور اس کی جھوٹی ضرورتوں کو جدا نہ کیا جا سکے اور اجتماعی نظام انسان کی حقیقی اور اصلی ضرورتوں کے مطابق اس کا اخروی ہدف فراہم نہ ہو سکے تو اس وقت تک یہ نظام منطقی اور معقول نہیں سمجھا جائے گا۔

علوم انسانی کی اہمیت اور پیدائش

''علوم انسانی تبیینی'' سے مراد وہ تجربی علوم ہیں جو حوادث بشر کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں اور صرف تاریخ نویسی اور تعریف کے بجائے حوادث سے مرتبط قوانین واصول کو آشکار کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ ان علوم کا وجود واعتبار انسان شناسی کے بعض مسائل کے حل ہونے پر موقوف ہے، مثال کے طور پر اگر تمام انسانوں کے درمیان مشترکہ طبیعت اور فطری مسائل کے مثبت پہلوؤں کے جوابات تک رسائی نہ ہو سکے اور کلی طور پر انسانوں کے لئے حیوانی پہلو کے علاوہ مشترک امور سے انکار کر دیا جائے تو انسانی علوم کی اہمیت، حیوانی اور معیشتی علوم سے گر جائے گی

۱۔ ''اجتماعی نظام'' سے ہماری مراد ایسا آپس میں مرتبط مجموعہ اور عقائد ونظریات کا منطقی رابطہ ہے جسے کسی معین ہدف کو حاصل کرنے کے لئے اجتماعی روابط کے خاص قوانین کے تحت مرتب کیا گیا ہو جیسے اسلام کا اقتصادی، سیاسی، حقوقی اور تربیتی نظام، اسی بنا پر اس بحث میں اجتماعی نظام کا مفہوم اس علوم اجتماعی سے متفاوت ہے جو مختلف افراد کے منظم روابط اور معاشرہ وسماج کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں اگر چہ کسی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے لیکن اس کا انتزاعی پہلو بہت زیادہ ہے، مذکورہ صراحت کے پیش نظر علمی واجتماعی نظریہ کے دستور اور اجتماعی نظام کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔

اور ایسی حالت میں علوم انسانی کا وجود اپنے واقعی مفہوم سے خالی ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ جائے گا، اس لئے کہ اس صورت میں انسان یا کسی بھی حیوان کا سمجھنا بہت دشوار ہوگا، اس لئے کہ یا خود اسی حیوانی اور معیشتی علوم کے ذریعہ اور ان پر جاری قوانین کا سہارا لے کر اس تک رسائی حاصل کی جائے گی یا ہر انسان کی ایک الگ اور جداگانہ حیثیت ہوگی جہاں ایک نمونہ یا بہت سے نمونے کی تحقیق اور ان نمونوں پر جاری قوانین اور ترکیبات کے کشف سے دوسرے انسانوں کی شناخت کے لئے کوئی جامع قانون حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے جبکہ ان دونوں صورتوں میں علوم انسانی تبیینی اپنے موجودہ مفہوم کے ہمراہ بے معنی ہے، لیکن انسانوں کی مشترکہ فطرت کو قبول کر کے (مشترکہ حیوانی چیزوں کے علاوہ جو انسانوں کے درمیان مشترک ہیں) راہ انکشاف اور اس طرح کے قوانین و مختلف نظام معرفت تشکیل دے کر انسان کے مختلف گوشوں میں علوم انسانی کی بنیاد کو فراہم کیا جا سکتا ہے۔

البتہ اس گفتگو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری مشکلات سے چشم پوشی کر لی جائے جو علوم انسانی کے قوانین کو حاصل کرنے میں درپیش ہیں۔

اجتماعی تحقیقات اور علوم انسانی کا حصول

مزید یہ کہ انسان شناسی کے مسائل علوم انسانی کے اعتبار اور وجود میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، علوم انسانی کے اختیارات اور میدان عمل کی حد بندی کا انسان شناسی کے بعض مباحث سے شدید رابطہ ہے، مثال کے طور پر اگر ہم انسان شناسی کے باب میں روح مجرد سے بالکل انکار کر دیں یا ہر انسان کی اس دنیاوی زندگی کے اختتام سے انسان کی زندگی کا اختتام سمجھا جائے تو انسانی حوادث اور اجتماعی تحقیقوں نیز ہر معنوی موضوع میں، انسان کی موت کے بعد کی دنیا سے رابطہ اور اس دنیاوی زندگی میں اس کے تأثرات سے چشم پوشی ہوگی، اس طرح انسان کے سبھی اتفاقات میں صرف مادی حیثیت سے تجزیہ و تحلیل ہوگی اور انسانی تحقیقیں مادی زاویہ کی طرف

متوجہ ہوکر رہ جائیں گی لیکن اگر روح کا مسئلہ انسان کی شخصیت سازی میں ایک حقیقی عنصر کے عنوان سے بیان ہوتو تحقیقوں کا رخ انسان کی زندگی میں روح وبدن کے حوالے سے تاثیروتاثر کی حیثیت سے ہوگا۔اور علوم انسانی میں ایک طرح سے غیر مادی یا مادی اور غیر مادی سے ملی ہوئی تفسیر وتشریح بیان ہوگی، اس پہلوکو آئندہ مباحث کے ضمن میں اچھی طرح سے واضح کیا جائے گا۔[1]

ب: انسان شناسی، معارف دینی کے آئینہ میں

انسان شناسی کے مباحث کا اصول دین اور اس کے وجود شناسی کے مسائل سے محکم رابطہ ہے نیز فروع دین اور دین کے اہم مسائل سے بھی اس کا تعلق ہے۔ یہاں ہم وجود شناسی اور دین کے حوالے سے اجتماعی انسان شناسی سے رابطے کے بارے میں تین بنیادی اصولوں کے تحت تحقیق کریں گے۔

خداشناسی اورانسان شناسی

انسان شناسی اور خداشناسی کے رابطہ کو سمجھنا (انسان وخدا کی طرف نسبت دیتے ہوئے) شناخت حصولی اورشناخت حضوری دونوں کے ذریعہ ممکن ہے۔[2] یا دوسرے لفظوں میں انسان کی حضوری معرفت خود وسیلہ اور ذریعہ ہے خدا کی حضوری معرفت کا، اوراسی طرح انسان کے سلسلہ

۱۔ موجودہ علوم انسانی کی صرف مادی تحلیلوں، معنوی گوشوں اور غیر فطری عناصر سے غفلت کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: مکتب ہای روان شناسی ونقد آن (خصوصاً نقد مکتب ہا کا حصہ) دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ۔

۲۔ معرفت یا علم حضوری سے مراد عالم اور درک کرنے والے کے لئے خود شئی کے حقیقی وواقعی وجود کا کشف ہونا ہے اور علم حصولی یعنی درک کرنے والے کے لئے حقیقی وخارجی شئی کے وجود کا کشف نہ ہونا ہے۔ بلکہ اس حقیقی اور خارجی شئی کے مفہوم یا صورت کو (جو اس وجود خارجی کو بیان کرتی ہے) درک کرنا ہے اور اس صورت و مفہوم کے ذریعہ اس خارجی شئی کو درک کیا جاتا ہے۔

میں حصولی شناخت بھی خدا اور اس کی عظیم صفات کے بارے میں حصولی شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ پہلی قسم میں عبادت، تزکیہ نفس، عرفانی راستوں کے ذریعہ اور دوسری قسم میں انسانی وجود اور اس کے اسرار و رموز میں غور و فکر کے ذریعہ شناخت ممکن ہے۔ اس کے باوجود یہ مباحث انسان شناسی، جو علم حصولی کے مفاہیم میں لحاظ کئے جاتے ہیں انسان کی حضوری معرفت اور خدا کے سلسلہ میں حضوری شناخت کے موضوع سے خارج ہیں لہٰذا ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔[1]

قرآن مجید خدا کی حصولی معرفت کے ساتھ انسان کی حصولی معرفت کے رابطہ کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿وَ فِی الْاَرض آیاتٌ لِلمُوقِنِینَ وَفِی اَنفُسِکُم أَفَلا تُبصِرُونَ﴾[2]

زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں (خدا کے وجود اور اس کے صفات پر بہت ہی عظیم) ہیں اور تم میں (بھی) نشانیاں (کتنی عظیم) ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

اور دوسری آیت میں بیان ہوا:

﴿سَنُرِیهِم آیاتِنَافِی الآفاقِ وَفِی أَنفُسِهِم حَتیٰ یَتَبَیَّنَ لَهُم اَنَّهُ الحَقُّ﴾[3]

عنقریب ہم اپنی نشانیوں کو پورے اطراف عالم اور ان کے وجود میں دکھائیں گے

---

[1]۔ قابل ذکر یہ ہے کہ انسان کی حقیقی سعادت (انبیاء الٰہی کی بعثت کا ہدف) پروردگار عالم کی عبادت میں خلوص کے ذریعہ ممکن ہے جو اس کی حضوری معرفت کا سبب ہو۔ لیکن ایسی معرفت کا حصول بغیر علمی مقدمات کے ممکن نہیں ہے یعنی اس کی حقیقت اور عظمت کے حوالے سے اس کی حصولی معرفت، نیز اس پر عقیدہ رکھنا، اور مقام عمل میں اس پر پورا اترنا ہے اور انسان شناسی کی تحقیق و تحلیل اس حضوری معرفت کی راہ حصول میں پہلا قدم ہے۔

[2]۔ سورۂ ذاریات، آیت: ۲۰ و ۲۱۔

[3]۔ سورۂ فصلت، آیت: ۵۳۔

یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔[1]

نبوت اور انسان شناسی

نبوت کا ہونا اور اس کا اثبات و رابطہ، انسان شناسی کے بعض مسائل کے حل پر موقوف ہے۔ اگر انسان شناسی میں یہ ثابت نہ ہو کہ وہ فرشتوں کی طرح خدا سے براہ راست یا بالواسطہ رابطہ رکھ سکتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وحی اور پیغمبر کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے؟!

وحی اور منصب نبوت سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو براہ راست یا فرشتوں کے ذریعہ خداوند عالم سے وابستہ ہیں، خداوند عالم ان کے ذریعہ معجزات دکھاتا ہے اور یہ حضرات خدا سے معارف اور پیغامات حاصل کرتے ہیں تا کہ لوگوں تک پہونچائیں، اس حقیقت کو ثابت اور قبول کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس رابطہ کے سلسلہ میں انسان کی قابلیت کو پرکھا جائے۔ نبوت کا انکار کرنے والوں کے اعتراضات اور شبہات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان ایسا رابطہ خداوند عالم سے رکھ ہی نہیں سکتا اور ایسا رابطہ انسان کی قدرت سے خارج ہے، قرآن مجید اس طرح نبوت کا انکار کرنے والوں کے سلسلہ میں فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں:

﴿مَا هَـٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهَـٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ﴾[2]

''یہ (پیغمبر) تم جیسا بشر کے علاوہ کچھ نہیں ... اگر خدا چاہتا (ولی پیغمبر بھیجے) تو فرشتوں کو نازل کرتا، ہم نے تو اس سلسلہ میں اپنے آباء واجداد سے کچھ نہیں سنا''۔

---

[1] مراد معرفت حصولی میں مفاد آیت کا منحصر ہونا نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں حضوری و حصولی دونوں معرفت مراد ہو لیکن ظاہر آیت کے مطابق معرفت حصولی تو ضرور مورد نظر ہے۔

[2] سورۂ مومنون، آیت: ۲۴۔

دوسری آیت میں کافروں اور قیامت کا انکار کرنے والوں سے نقل کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

﴿ماھٰذَا إلّا بَشَرٌ مِثلُکُم یَأکُلُ مِمَّا تَأکُلُونَ مِنہُ وَیَشرَبُ مِمَّا تَشرَبُونَ وَلَئِن أَطَعتُم بَشَراً مِثلَکُم إِنَّکُم إِذاً لَخَاسِرُونَ﴾[1]

کفار اور قیامت کا انکار کرنے والے کہتے ہیں) یہ (پیغمبر) فقط تمہاری طرح ایک بشر ہے جو چیزیں تم کھاتے اور پیتے ہو وہی وہ کھاتا اور پیتا ہے اور اگر تم لوگوں نے اپنے جیسے بشر کی پیروی کرلی، تب تو ضرور گھاٹے میں رہو گے۔

لہٰذا نبوت کا ہونا یا نہ ہونا اس مسئلہ کے حل سے وابستہ ہے کہ کیا انسان اللہ کی جانب سے بھیجے گئے پیغامات وحی کو دریافت کرسکتا ہے یا نہیں؟ مزید یہ کہ نبوت کا ہونا نبوت عامہ کا اثبات اور انبیاء کی بعثت کی ضرورت بھی اسی انسان شناسی کے مسائل کے حل سے وابستہ ہے کہ کیا انسان وحی کی مدد اور خدا کی مخصوص رہنمائی کے بغیر، نیز صرف عمومی اسباب کے ذریعہ معرفت حاصل کرکے اپنی راہ سعادت کو کامل طریقے سے پہچان سکتا ہے؟ یا یہ کہ عمومی اسباب کسب معرفت کے سلسلہ میں کافی ووافی کردار ادا نہیں کرسکتے اور کیا ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لئے کوئی پیغمبر مبعوث ہو؟

معاد اور انسان شناسی

وحی کی روشنی میں انسان کا وجود صرف مادی دنیا اور دنیاوی زندگی ہی سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ اس کے وجود کی وسعت عالم آخرت سے بھی تعلق رکھتی ہے اور اس کی حقیقی زندگی موت کے بعد کی دنیا سے مربوط ہے لہٰذا ایک زاویہ نگاہ سے معاد پر اعتقاد، موت کے بعد انسان کی زندگی کے دوام اور اس کے نابود نہ ہونے کا اعتقاد ہے اور ایسا اعتقاد دراصل ایک طرح سے انسان کے

---

[1] سورۂ مومنون، آیت: ۳۳و۳۴۔

سلسلہ میں ایسی طرز فکر ہے جسے انسان شناسی کے مباحث سے اگر حاصل اور ثابت نہیں کیا گیا تو معاد کے مسئلہ کی کوئی عقلی ضرورت نہیں رہ جاتی اور معاد کا مسئلہ عقلی دلائل کی پشت پناہی سے عاری ہوگا اسی وجہ سے قرآن مجید معاد کی ضرورت وحقانیت پر استدلال کے لئے موت کے بعد انسان کی بقا اور اس کے نابود نہ ہونے پر بھروسہ کرتا ہے اور رسول اکرمؐ سے مخاطب ہوکر منکرین معاد کی گفتگو کو اس طرح پیش کرتا ہے:

﴿وَقَالُوا أَئِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَئِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾[1]

اور (معاد کا انکار کرنے والے) یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب (ہم مر گئے اور بوسیدہ ہو گئے اور) زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ پیدا کئے جائیں گے؟

ان لوگوں کے جواب میں قرآن یوں فرماتا ہے:

﴿بَلْ هُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ☆ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ﴾[2]

ان لوگوں نے زمین میں مل جانے کو دلیل قرار دیا ہے ورنہ معاد کے ہونے اور اس کے تحقق میں کوئی شبہہ نہیں رکھتے ہیں) بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی ملاقات ہی سے انکار کرتے ہیں (اے پیغمبر! اس دلیل کے جواب میں) تم کہہ دو کہ: ملک الموت جو تمہارے اوپر معین ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا (اور تم ناپیدا نہیں ہوؤگے) اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت: ۱۰۔

[2] سورۂ سجدہ، آیت: ۱۰ و ۱۱۔

انسان شناسی اور اجتماعی احکام کی وضاحت

اس سے پہلے انسان کی حقیقی قابلیت اور بنیادی ضرورتوں کی معرفت نیز بنیاد سازی اور معقول وصحیح اجتماعی عادات واطوار کی ترسیم مورد تائید قرار پا چکی ہے۔ لہٰذا ہم یہاں اس نکتہ کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے بعض اجتماعی احکام کو عقلی نقطہ نظر سے قبول کریں اور انہیں انسان شناسی کے بعض مسائل میں استفادہ کریں، اگر چہ دین کے اجتماعی احکام کی درستی وحقانیت علم خدا کے اس لامتناہی سرچشمہ کی وجہ سے ہے کہ جس کی ذات عادل رحیم وکلیم جیسے صفات سے استوار ہے، لیکن اسلام کے بعض اجتماعی احکام کی معقول وضاحت (دینی، عالم کی معرفت میں) اس طرح سے کہ جو لوگ دین کو نہیں مانتے ہیں ان کے لئے بھی معقول اور قابل فہم ہو) صرف انسان شناسی کے بعض مسائل کے جوابات کی روشنی میں میسّر وممکن ہے مثال کے طور پر وحی کی تعلیمات میں، انسان کی حقیقی شخصیت (انسان کی انسانیت) قرب الٰہی (خدا سے قریب ہونا) کی راہ میں گامزن ہونے کی صورت میں سامنے آتی ہے اور خدا سے دور ہونے کا مطلب خود کو فراموش کرنا اور انسانیت کے رتبہ سے گر کر حیوانات سے بدتر ہونا ہے [1] اس مطلب کی روشنی میں، وہ شخص جو اسلام کی حقانیت اور اس پر ایمان لانے کے بعد کسی غرض اور حق کی مخالفت کی وجہ سے اسلام سے منہ موڑ کر کافر (مرتد) ہو جائے تو اس کے لئے پھانسی کا قانون ایک معقول اور مستحکم فعل ہے اس لئے کہ ایسے شخص نے اپنی انسانیت کو جان بوجھ کر گنوایا ہے نیز حیوان اور بدترین مخلوق ہونے کا سہرا باندھ کر معاشرے کے لئے خطرناک جانور [2] میں تبدیل ہو گیا ہے۔

۱۔﴿أولٰئِکَ کَالأنعَامِ بَل هُم أضَلُّ أولٰئِکَ هُمُ الغَافِلونَ﴾ ''وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بہت زیادہ گمراہ ہیں، وہ لوگ بے خبر اور غافل ہیں'' (سورہ اعراف/۱۷۹)

۲۔﴿إنَّ شرَّ الدَّوَابِّ عندَاللّٰهِ الّذِینَ کَفَرُوا فَهُم لایُؤمِنُونَ﴾ ''یقیناً خدا کے نزدیک بدترین جانور وہی ہیں جو کافر ہو گئے ہیں پس وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے'' (انفال/۵۵)

۴۔ دور حاضر میں انسان شناسی کا بحران اور اس کے مختلف پہلو

بہت سی فکری کوششیں جو وجود انسان کے گوشوں کو روشن کرنے کے لئے دوبارہ احیاء ہوئی ہیں انہوں نے بشر کے لئے بہت سی معلومات فراہم کی ہیں، اگر چہ ان معلومات کی جمع آوری میں تحقیق کے مختلف طریقوں کو بروئے کار لایا گیا ہے لیکن ان میں تجربی روش کا حصہ دوسری راہوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ انسان شناسی میں زیادہ حصہ تجربہ کا ہے۔ بہت سے قضایا اور انکشافات جو انسان شناسی کے مختلف مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور وجود انسانی کے تاریک گوشوں کے حوالے سے قابل تحقیق ہیں۔ نیز فراوانی اور اس کے جوانب کی کثرت کی وجہ سے نہ صرف انسان کے ناشناختہ پہلوؤں کو، جیسا کہ چاہیئے تھا واضح کرتے اور اس نامعلوم موجود کی شناخت میں حائل شدہ مشکلات کو حل کرتے، خود ہی مشکلات سے دوچار ہو گئے ہیں۔[۱]

علم کے کسی شعبہ میں بحران کا معنی یہ ہے کہ جن مشکلات کے حل کے لئے اس علم کی بنیاد رکھی گئی ہو وہ علم اس کو حل کرنے سے عاجز ہو اور اپنے محوری و مرکزی سوالات کے جوابات میں مبہوت و پریشان ہو، ٹھیک یہی صورت حال دور حاضر میں انسان شناسی کی ہو گئی ہے، یہ بات ایک سرسری نظر سے معلوم ہو جاتی ہے کہ دور حاضر میں انسان شناسی کی مختلف معلومات، مختلف جہتوں سے بحران کا شکار ہیں۔ انسان شناسی کا ماہر، جرمنی کا فلسفی ''اسکیلر میکس'' لکھتا ہے کہ

''تاریخ کے اوراق میں کسی وقت بھی انسان جس قدر آج معمہ بنا ہوا ہے کبھی

۱۔ ''ہوسرل'' منجملہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے انسان شناسی کے بحران کو بیان کیا ہے، اس نے ''وین'' (مئی ۱۹۵۳) کی اپنی تقریر میں ''یورپ میں انسانیت کے بحران کا فلسفہ'' اور ''پراگ'' (۱۹۳۴/۱۲) کی تقریر میں ''نفسیات شناسی اور یورپ کے علوم کا بحران'' کے عناوین سے اس موضوع پر تقریریں کی ہیں اور اس کی موت کے بعد اس کے مسودوں کو ۱۹۵۴ء میں ایک ضخیم کتاب کی شکل میں ''بحران علوم اروپائی و پدیدار شناسی استعلایی'' کے عنوان سے منتشر کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو، مدرنیتہ و اندیشہ انتقادی، ص ۵۶۔

نہیں تھا۔ مہارتی علوم جن کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہی ہو رہا ہے اور بشر کے مسائل سے مربوط ہیں، یہ بھی ذات انسان کو مزید معمہ بنائے ہوئے ہیں" [1]

دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران کا اندازہ چار طریقوں سے لگایا جا سکتا ہے اور ان چار بنیادی طریقوں سے مراد یہ ہیں:

۱۔ نظری علوم کی ایک دوسرے سے عدم ہماہنگی اور اندرونی نظم سے عاری ہونا۔

۲۔ فائدہ مند اور مورد اتفاق دلیل کا نہ ہونا۔

۳۔ انسان کے ماضی و مستقبل کا خیال نہ کرنا۔

۴۔ انسان کے اہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز ہونا۔

۱: علوم نظری کی آپس میں ناہماہنگی اور اندرونی نظم وضبط کا نہ ہونا

تمام مفکرین مدعی ہیں کہ انسان کے سلسلہ میں ان کا خاکہ اور نظریہ، دنیاوی اور تجربی معلومات وحوادث پر مبنی ہے اور ان کے نظریات کی دنیاوی حوادث سے تائید ہو جاتی ہے لیکن اگر ان نظریات کی سبھی توضیحات کو ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی فطری وحدت مجہول ہے اور ہم انسان کے ایک فرد یا ایسے مختلف افراد سے روبرو نہیں ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔[2] مثال کے طور پر "سلوکی لوگوں" کا عقیدہ (جو انسان کے کردار کو محور تسلیم کرتے ہیں) جیسے اسکینر[3] سیاسی واقتصادی معاشرہ شناس جیسے کارل مارکس[4] معاشرہ شناس جیسے دورکھیم[5] علم الحیات

---

[1] Scheler Max. lasituation de l! hommo dans la monde . p 17
کیسیر ر سے نقل کرتے ہوئے، ارنسٹ، (۱۳۶۰) فلسفہ و فرہنگ، ترجمہ بزرگی نادر زادہ، تہران، موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی، ص ۴۶ و ۴۷۔

[2] کیسیر ر، ارنسٹ، فلسفہ و فرہنگ (ترجمہ) ص ۴۵ و ۴۶۔

[3] B.F. Skinner .

[4] Karl Marx .

[5] Emile Durkheim

کے نظریات کو ماننے والے اور عقیدۂ وجود والے جیسے ژان پل سارٹر[1] کے نظریات انسان کے اختیارات اور آزادی کے بارے میں ملاحظہ کریں کہ کس طرح ایک دوسرے سے ہماہنک اور قابل جمع نہیں ہیں، ''عقیدۂ طرز سلوک رکھنے والے'' اختیار کا ایک سرے سے ہی انکار کرتے ہیں۔ ''مارکس'' انسان کے اختیار اور آزادی کو روابط کے ایجاد اور تاریخی جبر کی پیداوار سمجھتا ہے۔ ''دورکھیم'' اجتماعی جبر کی تاکید کرتا ہے۔ ''حیات شناس افراد'' عناصر حیات کے سرنوشت ساز کردار کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور ''ژان پل سارٹر'' انسان کی بے چوں وچرا آزادی کا قائل ہے کہ جس میں حیات کے تقاضوں سے بالاتر ہو کر مادی دنیا کے تغییر ناپذیر قوانین کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ''اسکیلر میسکس'' اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ گذشتہ دور کے برخلاف آج کے دور میں تجربی انسان شناسی (اپنے تمام انواع کے ساتھ) انسان شناسی فلسفی اور انسان شناسی الٰہی ایک دوسرے کے مخالف یا آپس میں بالکل ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں ان میں انسان کے سلسلہ میں اجماعی نظریہ اور اتحاد نہیں پایا جاتا ہے۔[2]

۲: فائدہ مند اور مورد اتفاق دلیل کا نہ ہونا

طبیعی علوم میں وہ قوانین جن کو علوم طبیعی کے اکثر مفکرین مانتے ہیں ان کے علاوہ تجربی روش کو بھی مفکرین نے آخری دلیل اور حاکم کے عنوان سے قبول کیا ہے، اگرچہ اس کی افادیت کی مقدار میں بعض اعتراضات موجود ہیں لیکن علوم انسانی میں (جیسا کہ ''ارنسٹ کیسیرر''[3] ذکر کرتا ہے کہ) کوئی ایسی علمی اصل نہیں ملتی جسے سبھی مانتے ہوں[4] ایسے موقع پر ایک مفید حاکم و دلیل کی

۱۔ Jean -Paul .

۲۔ اسکیلر میکس۔

۳۔ Earnest Cassirar

۴۔ کیسیرر، ارنسٹ، گذشتہ حوالہ، ص ۴۶

شدید ضرورت ہوتی ہے، اس کے باوجود علمی تحقیق یہ ہے کہ دور حاضر میں ہر انسان شناس اپنے نظریات کے سلسلہ میں عین حقیقت اور تجربی دلیلوں سے ہماہنگی کا مدعی ہے، حالانکہ، تجربی روش جس کو آخری اور مستحکم دلیل و حاکم کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے خود ہی متناقض معلومات فراہم کرتی ہے اور وہ بیان کی گئی مشکلات کو حل کرنے میں مرجع ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے لہٰذا ضروری افادیت سے محروم ہے مزید یہ کہ (مفکرین کے) قابل توجہ گروہ نے مجموعی طور پر حتی ان موارد میں بھی جہاں تجربی علم ہمارے لئے ہماہنگ معلومات فراہم کرتا ہے) اس روش کی افادیت میں شک ظاہر کیا ہے اور تفہیم و حوادث شناسی کے دوسرے طریقۂ کار کی تاکید کی ہے۔

۳: انسان کے ماضی اور مستقبل کا خیال نہ کرنا

تجربی انسان شناسی کے نظریات، انسان کے ماضی اور مستقبل (موت کے بعد کی دنیا) کے سلسلہ میں کوئی گفتگو نہیں کرتے ہیں۔ اگر انسان موت سے نابود نہیں ہوتا ہے (جب کہ ایسا ہی ہے) تو یہ نظریات اس کی کیفیت اور اس دنیاوی زندگی سے اس کے رابطوں کی وضاحت و تعریف سے عاجز ہیں چنانچہ وہ اپنے ماضی سے غافل ہیں، انسان کی سرنوشت اور اس کی خواہش میں معنوی اسباب کا اثر و عمل بھی ایک دوسرا مسئلہ ہے جس کے بارے میں انسان شناسی تجربی کے نظریات کسی بھی وضاحت یا حتمی رائے دینے سے قاصر ہیں۔ انسان شناسی کی دوسری اقسام بھی (دینی انسان شناسی کے علاوہ) اخروی سعادت اور انسانی اعمال کے درمیان تفصیلی اور قدم بہ قدم روابط کے بیان سے عاجز ہیں۔

۴: انسان کے اہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز ہونا

دور حاضر میں انسان شناسی کے نظریے اور مکاتب اس دنیا کے بھی اہم ترین انسانی حوادث کی تفصیل و صراحت سے عاجز ہیں اور اس جہت سے بھی علمِ انسان شناسی بحران کا شکار ہے۔ زبان، اجتماعی اور انسانی حوادث کے اہم ترین ایجادات میں سے ہے اور اس کی اہمیت

اتنی ہے کہ علوم انسانی کے بعض مفکرین کا نظریہ ہے کہ جو مکتب اچھی طرح زبان کی وضاحت پر قادر ہے وہ انسانی حوادث کی بھی صراحت کر سکتا ہے جب کہ دور حاضر میں انسان شناسی، زبان کے بعض گوشوں کی تفسیر و وضاحت سے عاجز ہے۔ مثال کے طور پر وہ نظریات جو انسان کو ایک مشین یا کامل حیوان کا درجہ دیتے ہیں کس طرح ان جدید اصطلاحات و معانی کی ایجاد کی کہ جن کو پہلی مرتبہ انسان مشاہدہ کرتا ہے یا اس طرح کی چیزوں کے سمجھنے میں ذہن انسانی کی صلاحیت اور اس کی ایجادی صلاحیت کی کیونکر وضاحت کر سکتے ہیں؟ یا مثال کے طور پر میدان فہم و تفہیم میں (مقصد کو بیان کرنے کے لئے کلمات کا ایجاد کرنا) جو حیوانات کی آواز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے، انسان کی صلاحیت کی کس طرح وضاحت کریں گے؟ ''چومسکی''[1] معتقد ہے کہ قابلیت اور ایجادات انسان کی زبان کے امتیازات میں سے ہے یعنی ہم سب سے گفتگو کر سکتے ہیں اور زبان کے قوانین اور معانی کی مدد سے ایسے جملات کو سمجھتے ہیں جس کو اس سے پہلے سنا ہی نہ تھا، لہٰذا زبان ماہیت کے اعتبار سے حیوانات کے اپنے مخصوص طریقۂ عمل سے کاملاً جدا ہے۔[2]

---

[1] Chomsky Noam

[2] لسلی، اسٹیونسن ہفت نظریہ دربارہ طبیعت انسان، ص ۱۶۱۔

۵۔دینی انسان شناسی کی خصوصیات

دینی انسان شناسی اپنے مدمقابل اقسام کے درمیان کچھ ایسے امتیازات کی مالک ہے جسے ہم اختصار کے ساتھ بیان کرر ہے ہیں:

جامعیت

چونکہ دینی انسان شناسی تعلیمات وحی سے بہرہ مند ہےاور طریقہ وحی کسی خاص زاویہ سے مخصوص نہیں ہے لہٰذا اس سلسلہ میں دوسری روشوں کی محدودیت معنی نہیں رکھتی ہے بلکہ یہ ایک مخصوص عمومیت کی مالک ہے،اس طرح کہ اگر ہم کسی فرد خاص کے بارے میں بھی گفتگو کریں تو اس گفتگو کوانسان کے سبھی افراد کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کیا جاسکتا ہےاوراس کوفرد خاص کے اعتبار سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ گفتگو کرنے والا کامل اور ہرزاویہ سے صاحب معرفت ہے،مزید دینی انسان شناسی کی معلومات یہ بتاتی ہے کہ یہ انسان شناسی ،انسان کے مختلف افراد کو مدنظر رکھتی ہے نیز جسمانی وفطری، تاریخی وسماجی دنیاوی واخروی،فعلیت واقدار اور مادیت و معنویت کے لحاظ سے بھی گفتگو کرتی ہےاور بعض موارد میں ایسی حقیقتوں کومنظرعام پر لاتی ہے جن کو انسان شناسی کے دوسرے انواع واقسام کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے، دینی تعلیمات میں منظورنظر اہداف ہی دینی انسان شناسی کے مختلف گوشے ہیں جوانتخابی صورت میں انجام پاتے ہیں۔

لہٰذا ہر پہلو کے مسئلہ کو اسی مقدار میں پیش کیا جائے گا جس قدر وہ انسان کی حقیقی سعادت میں اثرانداز ہیں جب کہ اس کی انتخابی عمومیت باقی رہے گی بلکہ انسان شناسی سے مربوط دوسرے موضوعات اس کے دائرہ بحث سے خارج ہوں گے۔

مستحکم وپائیدار

دینی انسان شناسی، تعلیمات وحی سے مستفاد ہے،چونکہ یہ تعلیمات ناقابل خطا اور

کاملاً صحیح ہیں لہٰذا اس قسم کی انسان شناسی پائیداری اور استحکام کا باعث ہوگی جو فلسفی عرفانی اور تجربی انسان شناسی میں قابل تصور نہیں ہے، اگر دینی انسان شناسی میں دینی نظریات کا استفادہ اور انتساب ضروری ہو جائے تو ان نظریات کے استحکام اور بے خطا ہونے میں کوئی شک نہیں ہوگا لیکن انسان شناسی کی دوسری اقسام، تجربی، عقلی یا سیر وسلوک میں خطا اور غلطی کے احتمال کی نفی نہیں کی جاسکتی ہے۔

مبدا اور معاد کا تصور

غیر دینی انسان شناسی میں یا تو مبدا اور معاد سے بالکل عاری انسان کی تحقیق ہوتی ہے (جیسا کہ ہم تجربی انسان شناسی اور فلسفی وعرفانی انسان شناسی کے بعض گوشوں میں مشاہدہ کرتے ہیں) یا انسان کے معاد ومبداء کے بارے میں بہت ہی عام اور مجموعی گفتگو ہوتی ہے جو زندگی اور راہ کمال کے طے کرنے کی کیفیت کو واضح نہیں کرتی ہے لیکن دینی انسان شناسی میں، مبدا اور معاد کی بحث انسانی وجود کے دو بنیادی حصوں کے عنوان سے مورد توجہ قرار پائی ہے اور اس میں انسان کی اس دنیاوی زندگی کے مبداء اور معاد سے رابطہ کی تفصیلات وجزئیات کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے بعثت انبیاء کی ضرورت پر اسلامی مفکرین کی اہم ترین دلیل جن باتوں پر استوار ہے وہ یہ ہیں: دنیا اور آخرت کے رابطہ سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت اور سعادت انسانی کی راہ میں کون سی چیز موثر ہے اور کون سی چیز موثر نہیں ہے اس سے واقفیت اور عقل انسانی اور تجربہ کا ان کے درک سے قاصر ہونا ہے۔[1]

(۱) ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح، راہ وراہنما شناسی، ص ۴۳ و ۴۴۔

بنیادی فکر

دینی انسان شناسی کے دوسرے امتیازات یہ ہیں کہ آپس میں تمام افرادانسان کے مختلف سطح کے رابطہ سے غافل نہیں ہیں اور تمام انسانوں کو مجموعی حیثیت سے مختلف سطح کے ہوتے ہوئے، ایک سانچے اور ایک تناظر میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔اس فکر میں انسان کا ماضی، حال اور مستقبل، جسم وروح، مادی ومعنوی اور فکری رجحانات نیز ان کے آپسی روابط کے تاثرات، شدید مودر توجہ قرار پاتے ہیں۔لیکن تجربی، فلسفی، عرفانی انسان شناسی میں یا تو آپس میں ایسے وسیع روابط سے غفلت ہو جاتی ہے یا اتنی وسعت سے توجہ نہیں کی جاتی ہے بلکہ صرف بعض آپسی جوانب کے روابط سے گفتگو ہوتی ہے۔

خلاصۂ فصل

ا۔انسان کی شناخت اور اس کے وجودی پہلو زمانہ قدیم سے لے کر اب تک مفکرین کی اہم ترین تحقیقات کا موضوع رہے ہیں۔

۲۔ ہر وہ منظومہ معرفت جو کسی شخص، گروہ یا انسان کے ابعاد وجودی پہلو کے بارے میں بحث کرے یا انسان کے سلسلہ میں مجموعی طور پر بحث کرے اس کو انسان شناسی کہا جاتا ہے۔

۳۔انسان شناسی کی مختلف قسمیں ہیں، جو تحقیقی روش یا زاویہ نگاہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔

۴۔اس کتاب میں مورد توجہ انسان شناسی، انسان شناسی کلاں یا جامع ہے جو روائی اور دینی تعلیمات کی روشنی میں یا یوں کہا جائے کہ وحی اور تعبدی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے۔

۵۔انسان شناسی ''کلاں نمائی'' مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے مخصوص اہمیت کی حامل ہے:

ا۔ زندگی کو واضح کرتی ہے۔

۲۔ اجتماعی نظام کو بیان کرتی ہے۔

۳: علوم وتحقیقات کی طرفداری میں موثر ہے۔

۴: دین کے بنیادی اصول اور اس کے اجتماعی احکام کی توضیح سے مربوط ہے۔

۶۔دور حاضر میں انسان شناسی کے نظریات میں عدم ہماہنگی کی وجہ سے جامع اور مفید دلیل و حاکم کے فقدان، انسان کے ماضی و مستقبل سے چشم پوشی اور اس کے اہم ترین حوادث کی وضاحت سے عاجز اور شدید بحران سے روبرو ہے۔

۷۔دینی انسان شناسی ''ہمہ جانبہ'' ہونے کی وجہ سے جامعیت، نا قابل خطا مبداء و معاد پہ توجہ اور دوسرے انسان شناسی کے مقابلہ میں عمدہ کردار کی وجہ سے برتری رکھتی ہے۔

تمرین

اس فصل سے مربوط اپنی معلومات کو مندرجہ ذیل سوالات و جوابات کے ذریعہ آزمائیں اور اگر ان کے جوابات میں کوئی مشکل درپیش ہو تو مطالب کا دوبارہ مطالعہ کریں۔

۱۔ مندرجہ ذیل موارد میں سے کون انسان شناسی ہمہ جانبہ اور مجموعی موضوعات کا جزء ہے اور کون انسان شناسی، جزئی موضوعات کا جزء ہے؟

''سعادت انسان، خود فراموشی، حقوق انسانی، انسانی قابلیت، انسانی ضرورتیں دماغ کی بناوٹ''۔

۲۔ خود شناسی سے مراد کیا ہے اور دینی انسان شناسی سے اس کا کیا رابطہ ہے؟

۳۔ مندرجہ ذیل میں سے کون صحیح ہے؟

الف: تجربی علوم انسانی میں ایک مکتب، انسان محوری ہے؟

ب: تجربی علوم انسانی اور دینی انسان شناسی، موضوع، دائرۂ عمل اور روش کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

ج: حقوق بشر کا یقین اور اعتقاد، انسانوں کی مشترکہ فطرت سے وابستہ ہے۔

د: موت کے بعد کی دنیا پر یقین کا انسان شناسی کے مسائل سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

۴۔ انسان کی صحیح اور جھوٹی ضرورتوں کی شناخت کا معیار کیا ہے؟

۵۔ آپ کے تعلیمی موضوع کا وجود و اعتبار کس طرح انسان شناسی کے بعض مسائل کے حل سے مربوط ہے؟

۶۔ انسانوں کا جانوروں سے امتیاز اور اختلاف، فہم اور انتقال مطالب کے دائرے میں زبان اور آواز کے حوالے سے کیا ہے؟

۷۔ آیا انسان محوری، انسان کی تعظیم وقدر دانی ہے یا انسان کی تذلیل اور اس کو حقیقی قدر ومنزلت سے گرانا ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔ دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران کے سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

......ارتگای گاست، خوسہ، انسان و بحران۔ ترجمہ احمد تدین: تہران۔ انتشارات علمی وفرہنگی۔

......عارف، نصر محمد (۱۹۱۷) **قضایا المنهجیة فی العلوم الانسانیة قاهره: المعهدالعالمی للفکر الاسلامی.**

......کیسیر ر، ارنسٹ (۱۳۶۹) رسالہای درباب انسان درآمدی بر فلسفہ وفرہنگ ترجمہ بزرگ نادرزادہ، تہران: پژوہشگاہ علوم انسانی۔

......گلدنر، الوین (۱۳۶۸) بحران جامعہ شناسی غرب، ترجمہ فریدہ ممتاز، تہران: شرکت سہامی انتشار۔ گنون، رنہ، بحران دنیای متجدد، ترجمہ ضیاء الدین دہشیری۔ تہران: امیر کبیر۔

......والر اشتاین، ایمانویل (۱۳۷۷) سیاست وفرہنگ در نظام متحول جہانی، ترجمہ پیروز ایزدی۔ تہران: نشرنی۔

...... واعظی، احمد، ''بحران انسان شناسی معاصر'' مجلّہ حوزہ و دانشگاہ، شمارہ ۹، ص ۱۰۹۔۹۴ قم دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، زمستان ۱۳۷۵۔

۲۔ معارف دینی اور فکر بشری کے سلسلہ میں انسان شناسی کا اثر چنانچہ اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو:

......دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ درآمدی بہ جامع شناسی اسلامی: مبانی جامعہ شناسی ص ۴۵۔۵۵۔

......محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ ص ۱۵۔۳۵۔

......پیش نیازہای مدیریت اسلامی، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، قم: ۱۳۷۹۔

......واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان در اسلام، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، تہران: سمت، ص ۱۴۔۱۷۔

۳۔ انسان شناسی کی کتابوں کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

......مجلہ حوزہ ودانشگاہ، شمارہ ۹، ص ۱۶۶۔۱۲۸، قم: دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ زمستان ۱۳۷۵۔

۴۔ بعض وہ کتابیں جس میں اسلامی نقطہ نظر سے انسان کے بارے میں بحث ہوئی ہے:

......ایزوٹسوٹوشی ہیکو (۱۳۶۸) خدا وانسان در قرآن، ترجمہ احمد آرام، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی۔

......بہشتی، احمد (۱۳۶۴) انسان در قرآن، کانون نشر طریق القدس۔

......جعفری، محمد تقی (۱۳۴۹) انسان در افق قرآن، اصفہان: کانون علمی وتربیتی جہان اسلام۔

......جوادی آملی، عبد اللہ (۱۳۷۲) انسان در اسلام، تہران، رجاء۔

......حائری تہرانی مہدی (۱۳۷۳) شخصیت انسان از نظر قرآن وعترت۔ قم: بنیاد فرہنگی امام مہدی۔

......حسن زادہ آملی، حسن (۱۳۶۹) انسان وقرآن، تہران: الزہراء۔

......حلبی، علی اصغر (۱۳۷۱) انسان در اسلام ومکاتب غربی۔ تہران: اساطیر۔

......دولت آبادی، علی رضا (۱۳۷۵) سایہ خدایان نظریہ بحران روان شناسی در مسئلہ انسان، فردوس: (۱۳۷۵)۔

......قرائتی، محسن (بی تا) جہان وانسان از دیدگاہ قرآن، قم: موسسہ درراہ حق۔

......قطب، محمد (۱۳۴۱) انسان بین مادیگری واسلام، تہران: سہامی انتشار۔

......محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (جہان شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم: موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

......مطہری، مرتضی (بی تا) انسان درقرآن، تہران: صدرا۔

......نصری، عبداللہ (۱۳۶۸) مبانی انسان شناسی درقرآن، تہران: جہاددانشگاہی۔

......واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان از دیدگاہ اسلام، قم: دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ۔

ہیومنزم یا عقیدۂ انسان

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔انسان کے بارے میں مختلف نظریوں کو مختصراً بیان کریں؟

۲۔ہیومنزم کے معانی و مراد کی وضاحت کریں؟

۳۔ہیومنزم کے چار اہداف و مراتب کی مختصراً وضاحت پیش کریں؟

۴۔ہیومنزم کے نظریہ کی تنقید و تحلیل کریں؟

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان، بشری فکر کا ایک محور ہے جس کے بارے میں وجوداور اہمیت شناسی کے مختلف نظریات بیان ہوئے ہیں، بعض مفکرین نے انسان کو دوسرے موجودات سے بالاتر اور بعض نے اسے حیوانات کے برابر اور کچھ نے اس کو حیوان سے کمتر و ناتواں اور ضعیف بیان کیا ہے، معرفت کی اہمیت کے اعتبار سے بھی بعض نے اس کو اشرف المخلوقات، بعض نے متوازن (نہ بہتر اور نہ خراب) اور بعض نے انسان کو برا ذلیل اور پست کہا ہے، آئندہ مباحث میں ہم بعض مذکورہ بالا نظریات کو اجمالاً بیان کریں گے اور اس سلسلہ میں دینی نظریات بھی پیش کریں گے۔

ایک دوسرے زاویہ سے انسان کی حقیقی شخصیت اور اس کی قابلیت ولیاقت کے بارے میں دو بالکل الگ بلکہ متضاد نظریات بیان کئے گئے ہیں، ایک نظریہ کے مطابق انسان بالکل آزاد اور خود مختار مخلوق ہے جو اپنی حقیقی سعادت کی شناخت اور اس تک دسترسی میں خود کفیل ہے، اپنی تقدیر کو خود بناتا ہے، خود مختار، بخشی ہوئی قدرت مطلقہ کا مالک اور ہر طرح کے بیرونی فریضہ سے (خواہش وارادہ سے خارج) مطلقاً آزاد ہے۔

دوسرے نظریہ کے مطابق انسان کے لئے قدرت شناخت کا ہونا لازم ہے نیز واقعی سعادت کے حصول کے لئے الٰہی رہنمائی کا محتاج ہے وہ خدائی قدرت کی ہدایت اور اس کی تدبیر کے زیر اثر اپنی سعادت کے لئے تکالیف اور واجبات کا حامل ہے جو خدا کی طرف سے پیغمبروں کے ذریعہ اس کے اختیار میں قرار دی جاتی ہیں۔

یہ دونوں نظریات، پوری تاریخ بشر میں نسبی یا مطلق طور پر انسانوں پر حاکم رہے ہیں، لیکن اس حاکمیت کی تاریخی سیر کے متعلق تجزیہ وتحلیل ہمارے ہدف کے پیش نظر ضروری نہیں ہے اور اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ لہٰذا پہلے نظریہ کی حاکمیت کے سلسلہ کی آخری کڑی کی تحقیق کریں گے جو تقریباً ۴ اسو سال سے ہیومنزم [1] یا انسان کی شخصیت کے عنوان سے مرسوم ہے، اور ۶ سو سال سے خصوصاً آخری صدیوں میں اکثر سیاسی، فکری اور ادبی مکاتب اس بات سے متفق ہیں کہ ہیومنزم نے مغرب کو اپنے اس نظریہ سے مکمل طور پر متاثر کیا ہے اور بعض مذاہب الٰہی کے پیروکاروں کو بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے۔

ہیومنزم کا مفہوم ومعنی

اگر چہ اس کلمہ کے تجزیہ وتحلیل اور اس کے معانی میں محققین نے بہت ساری بحثوں اور مختلف نظریوں کو بیان کیا ہے اور اپنے دعوے میں دلیلیں اور مثالیں بھی پیش کی ہیں، لیکن اس کلمہ کی لغوی تحلیل وتفسیر اور اس کا ابتدائی استعمال ہمارے مقصد کے سلسلہ میں زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ لہٰذا اس لغوی تجزیہ وترکیب کے حل وفصل کے بغیر اس مسئلہ کی حقیقت اور اس کے پہلوؤں کی تحقیق کی جائے گی، اس لئے ہم لغت اور اس کے تاریخی مباحث کے ذکر سے چشم پوشی نظر کرتے ہیں، اور اس تحریک کے مفہوم ومطالب کی تاریخی وتحلیلی پہلو سے بحث کرتے ہیں جو آئندہ مباحث کے محور کو ترتیب دیتے ہیں۔ [2]

---

[1] .Humanism

[2] کلمہ ہیومنزم کے سلسلہ میں لغت دیکھنے اور تاریخی معلومات کے لئے۔ ملاحظہ ہو: احمد، بابک، معماری مدرنیتہ، ص ۸۳، ۹۱۔ لالانڈ آنڈرہ، فرہنگ علمی وانتقادی فلسفہ کلمۂ Humanism کے ذیل میں۔

.Lewis W, Spitz Encyclopedia of Religion

.Abbagnano, Nicola Encyclopedia of Philosophy

''ہیومنزم'' ہراس فلسفہ کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے مخصوص اہمیت و منزلت کا قائل ہو اور اس کو ہر چیز کے لئے میزان قرار دیتا ہو، تاریخی لحاظ سے انسان پسندی یا ہیومنزم ایک ادبی سماجی، فکری اور تعلیمی تحریک تھی، جو چند مراحل کے بعد سیاسی، اجتماعی رنگ میں ڈھل گئی تھی، اسی بنا پر اس تحریک نے تقریباً سبھی فلسفی، اخلاقی، ہنری اور ادبی اور سیاسی مکاتب کو اپنے زیر اثر کرلیا تھا یا یوں کہا جائے کہ تمام مکاتب (دانستہ یا نادانستہ) اس میں داخل ہوگئے تھے، کمیونزم ۱ سود پرستی ۲ مغربی روح پرستی ۳ شخص پرستی ۴ وجود پرستی ۵ آزاد پرستی ۶ حتی لیبرلزم ۷ لوتھر مارٹن ۸ عیسائیت کی اصلاح کرنے والے کے اعتبار سے سبھی انسان پسندی میں شریک ہیں اور ان میں ہیومنزم کی روح پائی جاتی ہے۔ ۹ یہ تحریک عام طور پر روم اور یونان قدیم سے وابستہ تھی ۱۰ اور اکثر یہ تحریک غیر دینی اور اونچے طبقات نیز روشن فکر حلقہ کی حامی و طرفدار رہی ہے، ۱۱ جو ۱۳ ویں صدی کے اواخر میں اٹلی کے جنوب میں ظاہر ہوئی، اور پورے اٹلی میں پھیل گئی، اس کے بعد جرمن، فرانس، اسپین اور انگلینڈ میں پھیلتی چلی گئی اور مغرب میں اس کو ایک نئے سماج کے روپ میں شمار کیا جانے لگا۔ عقیدۂ انسان پسندی

---

۱ Communism۔ ۲ Pragmatism۔ ۳ Spiritualism

۴ Personalism۔ ۵ Existentialism۔ ۶ Liberalism

۷ Protestantism۔ ۸ Luther,Martin۔ ۹۔ لالاند، آندرہ، گذشتہ حوالہ

۱۰ پٹراک (Francesco Petratch) اٹلی کا مفکر و شاعر (۱۳۰۴۔۱۳۷۴) سوال کرتا تھا ''تاریخ روم کی تحلیل و تفسیر کے علاوہ تاریخ کیا ہوسکتی ہے؟ ملاحظہ ہو: احمدی، بابک، معمای مدرنیتہ ص ۹۲ و ۹۳۔ بیورا کہارٹ (Burackjardt Jacob) (۱۸۱۸۔۱۸۹۷) کہتا تھا: ''آتن'' ہی وہ تنہا دنیا کی سند تاریخ ہے جس میں کوئی صفحہ رنج آور نہیں ہے، ہیگل کہتا تھا: یورپ کے مدہوش لوگوں میں یونان کا نام، وطن دوستی تھا۔ ڈیوس ٹونی، ہیومنزم، ترجمہ عباس فجر، ص ۱۷، ۲۱، ۲۳۔

۱۱ مفکرین کی حکومت سے مراد لائق لوگوں کا حاکم ہونا نہیں ہے بلکہ معاشرہ کے اونچے طبقات کی حکومت ہے۔

اس معنی میں بنیادی ترین ترقی[1] کا پیش خیمہ ہے اور ترقی پسند مفکرین، انسان کو مرکز ومحور بنا کر عالم فطرت اور تاریخ کے زاویہ سے انسان کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انساپسندی کا رابطہ اور قدیم یونان سے تھا اور انسان کو محور قرار دے کر گفتگو کرنے والوں کا خیال یہ تھا کہ انسان کی قابلیت، لیاقت روم اور قدیم یونان کے زمانہ میں قابل توجہ تھی، چونکہ قرون وسطی میں چشم پوشی کی گئی تھی، لہٰذا نئے ماحول میں اس کے احیاء کی کوشش کی جانی چاہیئے، ان لوگوں کا یہ تصور تھا کہ احیاء تعلیم وتعلم کے اہتمام اور مندرجہ ذیل علوم جیسے ریاضی، منطق، شعر، تاریخ، اخلاق، سیاست خصوصاً قدیم یونان اور روم کی بلاغت وفصاحت والے علوم کے رواج سے انسان کو کامیاب وکامران بنایا جا سکتاہ ہے جس سے وہ اپنی آزادی کا احساس کرے، اسی بنا پر وہ حضرات جو مذکورہ علوم کی تعلیم دیتے تھے یا اس کی ترویج وتعلیم کے مقدمات فراہم کرتے تھے انہیں ''ہیومنیسٹ'' کہا جاتا ہے۔[2]

ہیومنزم کی پیدائش کے اسباب

ہیومنزم کی پیدائش کے اسباب وعلل کے بارے میں بحث وتحقیق مزید وضاحت کی طالب ہے لیکن یہاں صرف دو اہم وجوہات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

ایک طرف تو بعض دینی خصوصیات اور کلیسائی نظام کی حاکمیت مثلاً عیسائیت کے احکام اور بنیادی عقائد کا کمزور ہونا، فہم دین اور اس کی آگاہی پر ایمان کے مقدم ہونے کی ضرورت عیسائیت کی بعض غلط تعلیمات جیسے کہ انسان کو فطرتاً گنہگار سمجھنا، بہشت کی خرید وفروخت عیسائیت کا علوم عقل کے خلاف ہونا، علمی وعقلی معلومات پر کلیسا کی غیر قابل قبول تعلیمات کو تحمیل کرنا وغیرہ نے اس زمانے کے رائج ونافذ دینی نظام یعنی عیسائیت کی حاکمیت سے روگردانی کے اسباب فراہم

---

[1] Renaissance

[2] ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی: ہیومنزم: ص ۱۷ Abbagnano Nicola Ibid

کیے، نیز روم اور قدیم یونان کو آئیڈیل قرار دیا کہ جس نے انسان اور اس کی عقل کو زیادہ اہمیت دی ہے اور دوسری طرف بہت سے ہیومنیسٹ حضرات نے جو صاحب قدرت مراکز سے مرتبط تھے اور دین کو اپنی خواہشات کے مقابلہ میں سخت رکاوٹ سمجھ رہے تھے گذشتہ گروہوں کی حکومت کے لئے راہ حل مہیا کرنے میں سیاسی تبدیلی اور تجدد پسندی کی [1] عقلی تفسیر اور اس کی منفی مشکلات کی توجیہ کرنے لگے، ''ڈیوس ٹونی'' [2] کے بقول وہ لوگ سات چیزوں کے ماڈرن پہلوؤں کی توجیہ، دین اور اس کی عظمت واہمیت پر حملہ اور کلیسائی نظام کو اپنا طریقۂ کار قرار دینا [3] اور عوام کی ذہنیت کو دین اور دینی علماء سے خراب کرنا نیز دین کی سیاست اور اجتماع سے جدائی کی ضرورت پر کمر بستہ ہو گئے۔ مذکورہ دو سبب سے اپنی حفاظت کی تلاش میں کلیسا، اجتماع اور سیاست کے میدان سے دین کے پیچھے ہٹ جانے کا ذریعہ بنا، اس تحریک میں دین اور خدا کے سلسلہ میں نئی نئی تفسیریں جیسے خدا کو ماننا لیکن دین اور عیسائی تعلیمات کا انکار کرنا، دین میں شکوک اور بدعتیں [4] نیز کسی بھی دین اور اس کی عظمت واہمیت میں لاتعلقی ولا پرواہی [5] دینی تقدس اور اقدار کے حوالے سے [6] مختلف طریقۂ عمل اور نئے انداز میں تعلیمات دینی کی توضیح وتفسیر شروع ہوگئی۔

ہیومنزم کے اجزائے ترکیبی اور نتائج [7]

ہیومنزم کی روح اور حقیقت، جو ہیومنزم کے مختلف گروہوں کے درمیان مشترکہ عنصر کو تشکیل دیتی ہے اور ہر چیز کے محور ومرکز کے لئے انسان کو معیار قرار دیتی ہے [8] اگر اس گفتگو کی

---

[1] Modernity ۔ [2] Davis,Toni ۔ [3] ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی، ہیومنزم ص ۱۷۱۔

[4] Religios Ploralism ۔ [5] Tolerance ۔ [6] Protestantism

[7] ماڈرن انسان کے متنوع ہونے اور ہر گروہ کے مخصوص نظریات کی بنا پر ان میں سے بعض مذکورہ امور ہیومنزم کے الحاق واتحاد میں سے ہے اور بعض دوسرے امور اس کے عملی نتائج وضروریات میں سے ہیں۔ قابل ذکر یہ ہے کہ نتائج سے ہماری مراد عملی وعینی نتائج وضروریات سے اعم ہے۔

[8] لالانڈ، آندرہ، گذشتہ مطلب، ڈیوس ٹونی، گذشتہ مطلب، ص ۲۸۔

منطقی ترکیبات اور ضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو جو معلومات ہمیں انسان پسندی سے ملی ہے ہمارے مطلب سے بہت ہی قریب ہے، یہاں ہم ان میں سے صرف چار کی تحقیق وتفتیش کریں گے۔

عقل پرستی [1] اور تجرباتی رجحان [2]

ہیومنزم کی بنیادی ترکیبوں میں سے ایک عقل پرستی، خود کفالت پر اعتقاد، انسانی فکر کا اپنی شناخت میں آزاد ہونا، وجود، حقیقی سعادت اور اس کی راہ دریافت ہے۔[3] معرفت کی شناخت میں ہیومنیسٹ افراد کا یہ عقیدہ تھا کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو فکری توانائی سے کشف کے قابل نہ ہو اسی وجہ سے ہر وہ موجود کہ جس کی شناخت کے دو پہلو تھے، ماوراء طبیعت جیسے خدا، معاد، وحی اور اعجاز وغیرہ (جس طرح دینی تعلیمات میں ہے) اس کو وہ لوگ غیر قابل اثبات سمجھتے تھے اور اہمیت، شناخت میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ قانونی ضرورتوں کو انسان کی عقل ہی کے ذریعہ معین کرنا چاہیئے۔ ہیومنزم ایک ایسی تحریک تھی جو ایک طریقہ سے اس روائتی آئین کے مدمقابل تھی جو دین و وحی سے ماخوذ تھے اسی بنا پر یہ ہیومنزم، دین کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے۔[4] انسانی شان ومنزلت کے نئے نئے انکشافات سے انسان نے اپنی ذات کو خداپرست کے بجائے عقل پرست موجود کا عنوان دیا، علم پرستی یا علمی دیوانگی [5] ایسی ہی فکر کا ماحصل ہے۔ ہیومنسٹ حضرات اٹھارہویں صدی میں ہیوم [6] (۱۷۱۱۔۱۷۷۶) کی طرح معتقد تھے کہ کوئی ایسا اہم سوال کہ جس کا حل علوم انسانی میں نہ ہو، وجود نہیں رکھتا ہے۔ اومنیسٹ حضرات کی قرون وسطی سے دشمنی اور یونان قدیم سے گہرا رابطہ بھی اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ لوگ یونان قدیم کو تقویت عقل اور قرون وسطی کو جہل وخرافات کی حاکمیت کا دور سمجھتے تھے۔

۱۔ Rationalism ۔ ۲۔ Em[iricism ۔ ۳۔ Abbagnano ۔ ۴۔ Ibid

۵۔ Scientism ۔ ۶۔ HumeDavid ۔ ۷۔ ڈیوس ٹونی، ہیومنزم، ص ۱۶۶۔

یہ عقل اور تجربہ پرستی کی عظیم وسعت، دین و اخلاق کے اہم اطراف میں بھی شامل ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ سبھی چیز منجملہ اخلاقی قواعد، بشر کی ایجاد ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔[1] والٹر لپمن[2] کتاب ''اخلاقیات پر ایک مقدمہ''[3] میں لکھتا ہے کہ ہم تجربہ میں اخلاقی معیار کے محتاج ہیں۔ اس انداز میں زندگی بسر کرنا چاہیئے جو انسان کے لئے ضروری اور لازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے ارادہ کو خدا سے منطبق کریں بلکہ شرائط سعادت کے اعتبار سے ان کے ارادہ کو اچھی شناخت سے منطبق ہونا چاہیئے۔[4]

استقلال

ہیومنسٹ حضرات معتقد ہیں کہ: انسان دنیا میں آزاد آیا ہے لہٰذا صرف ان چیزوں کے علاوہ جن کو وہ خود اپنے لئے انتخاب کرے ہر قید و بند سے آزاد ہونا چاہیئے۔ لیکن قرون وسطی کی بنیادی فطرت نے انسان کو اسیر نیز دینی اور اخلاقی احکام کو اپنے مافوق سے دریافت شدہ عظیم چیزوں کے مجموعہ کے عنوان سے اس پر حاکم کر دیا ہے[5] ہیومنزم ان چیزوں کو ''خدا کے احکامات اور بندوں کی پابندی'' کے عنوان سے غیر صحیح اور غیر قابل قبول سمجھتا ہے۔[6] چونکہ اس وقت کا طریقۂ کار اور نظام ہی یہ تھا کہ قبول کیا جائے اور ان کی تغییر اور تبدیلی کا امکان بھی نہ تھا۔[7] لہٰذا یہ چیزیں ان

1۔ لالانڈ، آنڈرہ، گذشتہ حوالہ۔

2۔ Walter Lippmann

3۔ A preface to Morals

4۔ لالانڈ آنڈرہ، گذشتہ حوالہ۔

5۔ Abbagnano,Nicola,Ibid

6۔ آر بلاسٹر لکھتا ہے: ہیومنزم کے اعتبار سے انسان کی خواہش اور اس کے ارادے کی اصل اہمیت ہے، بلکہ اس کے ارادے ہی، اعتبارات کا سرچشمہ ہیں اور دینی اعتبارات جو عالم بالا میں معین ہوتے ہیں وہ انسان کے ارادے کی حد تک پہونچ کر ساقط ہو جاتے ہیں، (آر بلاسٹر، آنتھونی: ظہور و سقوط لبر لیزم، ص ۱۴۰)۔

7۔ لالاند، آندرہ، گذشتہ حوالہ۔

کی نظر میں انسان کی آزادی اور استقلال کے منافی تھیں۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ انسان کو اپنی آزادی کو طبیعت وسماج میں تجربہ کرنا چاہیئے اور خود اپنی سرنوشت پر حاکم ہونا چاہیئے، یہ انسان ہے جو اپنے حقوق کو معین کرتا ہے نہ یہ کہ مافوق سے اس کے لئے احکام وتکالیف معین ہوں۔ اس نظریہ کے اعتبار سے انسان حق رکھتا ہے اس لئے اس پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔ بعض ہیومنزم مثلاً ''میکس ہرمان'' نے[1] جس نے کہ شخص پرستی کو رواج دیا تھا اس نے افراط سے کام لیا وہ معتقد تھا کہ: لوگوں کو اجتماعی قوانین کا جو ایک طرح سے علمی قوانین کی طرح ہیں پابند نہیں بنانا چاہیئے[2] وہ لوگ معتقد تھے کہ صرف کلاسیکل (ترقی پسند) ادبیات نے انسان کی شخصیت کو پوری طرح سے فکری اور اخلاقی آزادی میں پیش کیا ہے[3] اس لئے کہ وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ جیسا بھی عقیدہ ونظریہ رکھنا چاہتا ہے رکھ سکتا ہے اور احکام اخلاقی وقانونی کو ایک نسبی امر، قابل تغییر اور ناپایدار بتایا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ سیاسی، اخلاقی اور قانونی نظام کو انسان اور اس کی آزادی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وہ نہ صرف دینی احکام کو نفاذ کے لئے ضروری نہیں جانتے تھے بلکہ ہر طرح کا تسلط اور غیر ہیومنزم چیزیں منجملہ قرون وسطی کے بنیادی مراکز (کلیسا، شہنشاہیت[4] اور قبیلہ والی حکومتیں یا حکام ورعیت) کو بالکل اسی نقطہ نگاہ کی بنا پر بے اہمیت وبے اعتبار جانتے تھے۔[5]

۱۔ Hermann, Max۔

۲۔ ڈیوس ٹونی، گذشتہ حوالہ ص ۳۴۔

۳۔ لالاند، آندرہ، گذشتہ حوالہ۔

۴۔ Imperial۔

۵۔ Feudaism.

لاتعلقی وستی

۱۶ و ۱۷ اویں صدی کی دینی جنگوں کے نتیجہ میں صلح وآشتی کے ساتھ باہم زندگی گزارنے کے امکان پر مختلف ادیان کے ماننے والوں کے درمیان گفتگو اور لاتعلقی وستی کی تاکید ہوئی ہے اور دینی تعلیمات کی وہ روش جو ہیومنزم کا احترام کرتی تھی لاتعلقی وستی کی روش سے بہت زیادہ متاثر ہوئی، اس نظریہ میں لاتعلقی کا مطلب یہ تھا کہ مذاہب ایک دوسرے سے اپنے اختلافات کو بحال رکھتے ہوئے باہم صلح وآتشی سے زندگی گذار سکیں لیکن جدید انسان پسندی کے لاتعلقی وستی سے اس فکر کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کے دینی اعتقادات اسی کی ذات کا سرچشمہ ہیں اور اس کے علاوہ کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ ان اعتقادات کے اندر، بنیادی اور اساسی چیز وحدت ہے کہ جس میں عالمی صلح کا امکان موجود ہے، ہیومنسٹ اس دنیا کے اعتبار سے خدا کی یوں تفسیر کرتا ہے کہ: عیسیٰ کا خدا وہی فلسفی بشر کی عقل ہے جو مذہب کی شکل میں موجود ہے۔[1] اس زاویہ نگاہ سے مذاہب میں لاتعلقی وستی یعنی مسالمت آمیز زندگی گزارنے کے علاوہ فلسفہ اور دین کے درمیان میں بھی لاپرواہی موجود ہے، جب کہ یہ گذشتہ ایام میں ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یہ چیز قدیم یونان اور اس کی عقل پسندی کی طرف رجوع کی وجہ نہیں تھی۔ یہ نظریہ جو ہر دین اور اہم نظام کی حقانیت اور سعادت کے انحصاری دعوے پر مبنی ہے کسی بھی اہم نظام اور معرفت کو حق تسلیم نہیں کرتا اور ایک طرح سے معرفت اور اہمیت میں مخصوص نسبت کا پیروکار ہے اسی بنا پر ہر دین اور اہم نظام کی حکمرانی صرف کسی فرد یا معاشرہ کے ارادہ اور خواہش پر مبنی ہے۔

---

[1] Ibid

سیکولرزم [۱]

اگرچہ ہیومنزم کے درمیان خدا اور دین پر اعتقاد رکھنے والے افراد بھی ہیں اور انسان پرستی (انسان کی اصالت کا قائل ہونا) کو مومن اور ملحد میں تقسیم کرتے ہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہیومنزم کو بے دین اور دشمن دین نہ سمجھیں تو کم از کم خدا کی معرفت نہ رکھنے والے اور منکر دین ضرور ہیں، اور ہیومنزم کی تاریخ بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ خدا کی اصالت کے بجائے انسان کو اصل قرار دینا ہی باعث بنا کہ ہیومنزم افراد قدم بہ قدم سکولریزم اور الحاد نیز بے دینی کی طرف گامزن ہو جائیں۔ خدا اور دینی تعلیمات کی جدید تفسیر کہ جس کو "لوتر" جیسے افراد نے بیان کیا ہے کہ خدا کو ماننا نیز خدا اور آسمانی دین کی مداخلت سے انکار منجملہ عیسائی تعلیم سے انکار، طبیعی دین (مادی دین) [۲] اور طبیعی خدا پسندی کی طرف مائل ہونا جسے "ولٹر" [۳] (۱۶۹۴-۱۷۷۸) اور "ہیگل" [۴] (۱۷۷۰-۱۸۳۱) نے بھی بیان کیا ہے، اور "ہیکسلی" [۵] جیسے افراد کی طرف سے دین اور خدا کی جانب شکاکیت کی نسبت دینا اور "فیور بیچ" [۶] (۱۷۷۵-۱۸۳۳) "مارکس" [۷] (۱۸۱۸-۱۸۸۳) نیز ملحد اور مادہ پرستوں نے دین اور خدا کا بالکل انکار کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یہ ایسے مراحل ہیں جنہیں ہیومنزم طے کر چکا ہے۔ البتہ غور و فکر کی بات یہ ہے کہ ہیگل جیسے افراد کے نزدیک اس خدا کا تصور جو ادیان ابراہیمی میں ہے بالکل الگ ہے۔ دین اور خدا کی وہ نئی تفسیر جو جدید تناظر میں بیان ہوئی ہے وہ ان ادیان کی روح سے سازگار نہیں ہے اور ایک طرح سے اندرونی طور پر دینی افکار و اہمیت کی منکر اور انہیں کھوکھلا کرنے والی ہے۔ بہر حال ہیومنزم کی وہ قسم

۱۔ Secularism۔ ۲۔ Deism۔ ۳۔ Voltaire۔

۴۔ Hegel, Friedrich۔ ۵۔ Huxley, Julian۔

۶۔ Feuerbach, von Anseim

۷۔ Mark, Karl

جو مومن ہے اس کے اعتبار سے بھی خدا اور دین اساسی اور اصلی عامل شمار نہیں ہوتے بلکہ یہ انسانوں کی خدمت کے لئے آلہ کے طور پر ہیں، یہ انسان ہے جو اصل اور مرکزیت رکھتا ہے، ڈیوس ٹونی لکھتا ہے:

یہ کلمہ (ہیومنزم) انگلینڈ میں یکتا پرستی[۱] حتی خدا شناسی کے عنوان سے ناپسندیدگی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور یہ قطعاً عیسائیوں اور اشراقیوں کی صورت حال سے سازگار نہیں تھا عام طور پر یہ کلمہ الٰہی تعلیمات سے ایک طرح کی آزادی کا متضمن تھا۔ ت۔ ھ۔ ہیکسلی[۲] ڈارونیزم کا برجستہ مفکر اور چارلز بریڈلیف[۳] قومی سکولریزم کی انجمن کے مؤسس نے روح یعنی اصل ہیومنزم کی مدد کی اور اس کو فروغ بخشا تاکہ اس کے ذریعہ سرسخت عیسائیت کے آخری توہمات کو بھی ختم کر دے۔[۴]

نیز وہ اس طرح کہتا ہے کہ:

''گسٹ کانٹ''[۵] مادی اور غیر مادی افکار کے اقسام سے عناد، عوام پسند ہیومنزم کے مفہوم کا یکتا پرستی یا الحاد اور سکولریزم میں تبدیلی کا باعث ہوا ہے جو آج بھی موجود ہے اور اس کی

۱۔ یکتا پرستی یا توحید (Unitarianism) سے مراد عیسائیت کی اصلاح کرنے والے فرقہ کی طرف سے بیان کئے گئے توحید کا عقیدہ ہے جو کیتھولیک کلیسا کی طرف سے عقیدۂ تثلیث کے مقابلہ میں پیش کیا گیا ہے اور یہ ایک اعتبار سے عیسائیت کی نئی تفسیر تھی جو ظاہراً مقدس متون کی عبارتوں سے ناسازگار اور عیسائی مفکرین کی نظر میں دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے مترادف تھی۔ اور عام طور پر یہ کلمہ الٰہی تعلیمات سے آزادی کا متضمن تھا۔

۲۔ Thomas, Henry, Hexley

۳۔ وہ پارلیمنٹ کا ممبر اور National Reformer جریدہ کا مدیر اعلیٰ تھا جس نے قسم کھانے کی جگہ انجیل کی تائید کے سلسلہ میں مجلس عوام سے ۶۰ سال تک مقدمہ لڑا۔

۴۔ ڈیوس ٹونی، ہیومنزم، ص ۳۷

۵۔ August , Conte

تحریک کو ۱۹ ویں صدی میں انجمنوں کی تاسیس کے درمیان مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔[۱] مثال کے طور پر عقل پسندی (اصالت عقل کے قائل) جرائد، اخلاق اور قومی سکولر یزم کی انجمنیں۔

''ڈیوس ٹونی'' اپنی کتاب کے دوسرے حصہ میں عیسائی ہیومنزم مومنین کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ، عیسائیت اور ہیومنزم کا الحاق اختلافات سے چشم پوشی کر کے انجام پایا جس کی وجہ سے عیسائی ہیومنزم کی ناپایدار ترکیب میں فردی ہیومنزم کے نقش قدم موجود تھے۔ یعنی خداوند متعال جو ہر چیز پر قادر ہے اور کائنات کی ہر چیز سے باخبر ہے اور فردی ارادہ کی آزادی کے درمیان تناقض، ایسے تناقض ہیں جو ''فیلیپ سیڈنی''[۲] اڈمونڈ اسپنسر[۳] کریسٹوفر مارلو[۴] جان ڈان[۵] اور جان ملٹن[۶] جیسے اصلاح پسند ہیومنسٹ کی عبارتوں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔[۷] محمد نقیب العطاس بھی لکھتا ہے: ''نطشہ'' کا نعرہ ''کہ خدا مر گیا ہے'' جس کی گونج آج بھی مغربی دنیا میں سنی جا سکتی ہے اور آج عیسائیت کی موت کا نوحہ خصوصاً پروٹسٹوں یعنی اصلاح پسندوں کی طرف سے کہ جنہوں نے ظاہراً اس سرنوشت کو قبول کرتے ہوئے مزید آمادگی سے زمانے کے ساتھ ساتھ طریقۂ عیسائیت کی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اصلاح پسندوں نے ہیومنزم کے مقابلہ میں پیچھے ہٹتے ہوئے عیسائیت کو اندرونی طور پر بدل دیا ہے۔[۸] ''ارنسٹ کیسیرر'' دور حاضر میں اصطلاحات (رسانس) پر جاری فکر کی توصیف میں جو ہیومنزم سے لیا گیا ہے اور اس سے ممزوج ومخلوط ہے لکھتا ہے:

۱۔ گذشتہ حوالہ، ص ۱۴۱۔ ۲۔ Philip,Sidney ۔

۳۔ Edmund, Spenser ۔ ۴۔ Chirs Topher Marlowe ۔

۵۔ John, Don ۔

۶۔ John Milton.

۷۔ العطاس، محمد نقیب، اسلام ودینوی گری، ترجمہ احمد آرام، ص ۳و۴۔

۸۔ کیسیرر، ارنسٹ، فلسفہ روشنگری، ترجمہ یداللہ موقن، ص ۲۱۰۔

ایسا لگتا ہے کہ تنہا وسیلہ جو انسان کو تعبد اور پیش داوری سے آزاد اور اس کے لئے حقیقی سعادت کی راہ ہموار کرتا ہے وہ پوری طرح سے مذہبی اعتقاد اور اقدار سے دست بردار ہونا اور اس کو باطل قرار دینا ہے، یعنی ہر وہ تاریخی صورت کہ جس سے وہ وابستہ ہے اور وہ ستون کہ جس پر اس نے تکیہ کیا ہے اس کی حاکمیت کی تاریخ اور عملی کارکردگی کے حوالے سے اس کے درمیان بہت گہرا فاصلہ ہے کہ جس کو ہیومنزم کے نظریہ پر اساسی و بنیادی تنقید تصور کیا جاتا ہے اور دور حاضر میں اصطلاحات کی عام روش، دین میں شکوک اور تنقید کا آشکار انداز ہے۔[1]

ہیومنزم کے نظریہ پر تنقید و تحقیق

فکر و عمل میں تناقض

فکر و عمل میں تناقض یعنی ایک فکری تحریک کے عنوان سے ہیومنزم کے درمیان اور انسانی معاشرہ پر عملی ہیومنزم میں تناقض نے انسان کی قدر و منزلت کو بلند و بالا کرنے کے بجائے اس کو ایک نئے خطرے سے دوچار کر دیا اور انسان پرستی کے مدعی حضرات نے اس کلمہ کو اپنے مفادات کی فراہمی کے لئے غلط استعمال کیا ہے۔ شروع ہی میں جب حق زندگی آزادی و خوشی اور آسودگی کے تحت ہیومنزم میں انسانی حقوق کے عنوان سے گفتگو ہوتی تھی تو ایک صدی بعد تک امریکہ میں کالوں کو غلام بنانا قانونی سمجھا جاتا تھا[2] اور معاشرہ میں انسانوں کی ایک کثیر تعداد ماڈرن انسان پرستی کے نام سے قربان ہوتی تھی[3] ''نازیزم''[4] ''فاشیزم''[5] ''اسٹالینزم''[6] امپریالیزم[7] کی تحریکیں

---

[1] کیسیرر، ارنسٹ، فلسفہ روشنگری، ترجمہ یداللہ موقن، ص: ۲۱۰۔

[2] احمد بابک، معماری مدرنیتہ ص ۱۱۱۔ ڈیوس ٹونی، گذشتہ حوالہ ص ۳۶۔

[3] گذشتہ حوالہ، ص ۲۰۔

[4] Nazism۔

[5] Fascism

[6] Stalinism۔

[7] Imperialism.

ہیومنزم کی ہم فکر اور ہم خیال تھیں [1] اسی بنا پر بعض مفکرین نے ضد بشریت، انسان مخالف تحریک دھوکا دینے والی باتیں، ذات پات کی برتری کی آواز جیسی تعبیروں کو نازیزم اور فاشیزم کی ایجاد جانا ہے اور ان کو انسان مخالف طبیعت کو پرورش دینے نیز مراکز قدرت کا جواز پیش کرنے والا بتایا ہے[2] اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی جرم ایسا ہو جو انسانیت کے نام سے انجام نہ پایا ہو۔[3]

ہیومنزم کے ناگوار نتائج اور پیغامات ایسے تھے کہ بعض مفکرین نے اس کو انسان کے لئے ایک طرح کا زندان وگرفتاری سمجھا اور اس سے نجات پانے کے لئے لائحہ عمل بھی مرتب کیا ہے۔[4]

فکری حمایت کا فقدان

ہیومنزم کے دعوے کا اور ان کے اصول کا بے دلیل ہونا، ہیومنزم کا دوسرا نقطہ ضعف ہے۔ ہیومنسٹ اس سے پہلے کہ دلیلوں اور براہین سے جس کا دعویٰ کر رہے تھے نتیجہ حاصل کرتے کلیسا کی سربراہی کے مقابلہ میں ایک طرح کے احساسات وعواطف میں مبتلا ہو گئے، چونکہ فطرت پرستی سے بے حد مانوس تھے لہٰذا روم وقدیم یونان کے فریفتہ وگرویدہ ہو گئے۔ ''ٹامس جفرسن''[5] نے امریکا کی آزادی کی تقریر میں کہا ہے کہ

ہم اس حقیقت کو بدیہی مانتے ہیں کہ تمام انسان مساوی خلق ہوئے ہیں۔[6]

---

[1] ڈیوس ٹونی، وہی مدرک، ص ۵۴، ۶۴، ۸۴۔

[2] ملاحظہ ہو گذشتہ حوالہ ص ۲۷۔ ۳۶۔ ۴۵۔ ۴۶، ۵۴۔ ۶۲۔ ۶۴۔ ۸۴۔ ۹۴، ۱۴۷، ۱۷۸ او احدی با بک گذشتہ حوالہ ص ۹۱۔ ۹۳۔ ۱۱۰۔ ۱۲۲

[3] احمدی، بابک، گذشتہ حوالہ ص ۱۱۲۔

[4] ڈیوس ٹونی، گذشتہ حوالہ، ۱۷۸۔

[5] Thomas,Jeferson

[6] گذشتہ حوالہ، ص ۱۱۰۔

''ڈیوس ٹونی'' لکھتا ہے کہ

عقلی دور (ترقی پسند زمانہ) کا مذاق اڑانے والی اور نفوذ والی کتاب جس نے محترم معاشرہ کو حتی حقوق بشر کی کتاب سے زیادہ ناراض کیا ہے، وہ مقدس کتاب ہے جو عالم آخرت کے حوادث اور سرزنش سے بھری ہوئی ہے اس کا طریقہ اور سیاق وسباق تمام مسخروں اور مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑانا ہے۔ بعض ہیومنسٹ حضرات نے بھی ہیومنزم کی حاکمیت کی توجیہ کی اور اسے اپنے مفادات کی فراہمی کا موقع ومحل سمجھا۔

ہیومنسٹ کی طرف سے بیان کئے گئے مجموعی مفاہیم کے بارے میں ''ڈیوس ٹونی'' یہ جانتے ہوئے کہ اس کو مفادات کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے لکھتا ہے کہ

اس میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیشہ خود سے سوال کرے کہ اس عظیم دنیا میں بلند مفاہیم کے پشت پردہ کون ساشخصی اور علاقائی فائدہ پوشیدہ ہے؟[۱] مجموعی طور پر ہیومنسٹ، انسان کی قدرومنزلت اور فکری اصلاح کے لئے کوئی پروگرام یا لائحہ عمل طے نہیں کرتے تھے بلکہ گذشتہ معاشرہ کی سرداری کے لئے بہت ہی آسان راہ حل پیش کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ''لیونارڈو برونی''[۲] نے لکھا تھا کہ تاریخی تحقیق ہمیں اس بات کا سبق دیتی ہے کہ کیسے اپنے بادشاہوں اور حاکموں کے حکم اور عمل کا احترام کریں اور بادشاہوں، حاکموں کو اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ کیسے اجتماعی مسائل کا لحاظ کریں تاکہ اپنی قدرت کو اچھی طرح سے حفظ کرسکیں[۳] غرض کہ ہروہ چیز جو قرون وسطی کی نفی کرے یہ لوگ اس کا استقبال کرتے تھے اور اس کی تاکید بھی کرتے تھے۔ کلیسا کی حاکمیت، خداودین کا نظریہ انسان کا فطرتاً گناہگار اور بدبخت ہونا، معنوی ریاضت

۱۔ ڈیوس ٹونی: گذشتہ حوالہ ص ۳۶۔

۲۔ Leonardo Bruni

۳۔ احمد، بابک، گذشتہ حوالہ ص ۹۱ و ۹۳۔

نیز جسمانی لذتوں سے چشم پوشی اور صاحبان عقل وخرد سے بے اعتنائی یہ ایسے امور تھے جو قرون وسطی میں معاشرہ پر سایہ فگن تھے اور ہیومنسٹوں نے کلیسا کی قدرت وحاکمیت سے مقابلہ کرنے کے لئے، خدا پسندی اور دینی اعتقادات کو پیش کیا اور انسان کی خوش بختی، جسمانی لذتوں اور صاحبان خرد کو اہمیت دینے نیز حقوق اللہ اور اخلاقی شرط وشروط سے انسان کو آزاد کرنے کے لئے آستین ہمت بلند کی۔[1] وہ لوگ علی الاعلان کہتے تھے کہ: قرون وسطی کے زمانے میں کلیسا نے جو حقوق و اقدار انسان سے سلب کر لئے تھے، ہم اس کو ضرور پلٹائیں گے۔[2]

بہر حال انسان پسندی (اصالت انسان) کے عقیدے نے ہر چیز کے لئے انسان کو میزان ومرکز بنایا اور ہر طرح کی بدی اور مطلق حقائق کی نفی، نیز فطرت سے بالاتر موجودات کا انکار منجملہ خدا اور موت کے بعد کی دنیا (آخرت) کے شدت سے منکر تھے۔ آخر وہ کس دلیل کی بنا پر اتنا بڑا دعویٰ پیش کرتے ہیں؟ ان کے پاس نہ ہی معرفت وجود اور نہ ہی انسانوں کی کاملا آزادی و اختیار[3] پر کوئی دلیل ہے اور نہ ہی خدا کے انکار اور اس کے قوانین اور روح سے بے نیازی پر کوئی

---

[1] ویل ڈورانٹ لکھتا ہے کہ ہیومنسٹوں نے دھیرے دھیرے اٹلی کے عوام کو خوبصورتی سے شہوت کے معنی سمجھائے جس کی وجہ سے ایک سالم انسانی بدن کی کھلی ہوئی تہذیب (خواہ مرد ہو یا عورت خصوصا برہنہ) پڑھے لکھے طبقوں میں رائج ہوگی۔ ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن، ج ۵ ص ۹۷۔ ۹۸ جان ہرمان بھی لکھتا ہے کہ قرن وسطی کے اواخر میں بھی بہت سی گندی نظموں کا سلسلہ رائج ہو گیا تھا جو زندگی کی خوشیوں سے مکمل استفادہ کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ رنڈل جان ہرمان، سیر تکامل عقل نوین، ص ۱۲۰۔

[2] Abangnano, Nicola Ibid.

[3] انسان محوری کا نظریہ رکھنے والوں میں سے بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان بہت زیادہ اختیارات کا حامل ہے ان کا کہنا ہے کہ انسان جس طریقہ سے چاہے زندگی گذار سکتا ہے۔ ژان پل، سارٹر کہتا ہے کہ: اگر ایک مفلوج انسان دوڑ میں ممتاز نہ ہو سکتا ہو تو یہ خود اس کی غلطی ہے، اسی طرح وہ لوگ اعمال کے انجام دینے (عامل خارجی کو بغیر مد نظر رکھتے ہوئے خواہ حقوقی، سنتی، اجتماعی، سیاسی، غیر فطری افعال) میں انسان کی ترقی سمجھتے ہیں۔

دلیل ہے اور نہ ہی شناخت کی اہمیت کے سلسلہ میں کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی بشر کے افکار و خیالات آرزوؤں، خواہشوں نیز حقوقی و اخلاقی اہمیتوں پر کوئی ٹھوس ثبوت ہے اور نہ ہی فلسفی اور عقلی مسائل کو بعض انسان پرست فلاسفہ کی نفسیاتی تحلیلوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ عقلی و نقلی دلیلیں نیز شواہد و تجربات اس کے خلاف دلالت کرتے ہیں، اگر چہ انسان اسلامی تعلیمات اور ادیان ابراہیمی کی نگاہ میں مخصوص منزلت کا حامل ہے اور عالم خلقت اور کم از کم اس مادی دنیا کو انسان کامل کے توسط سے انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اس کی تابع ہے۔ لیکن جیسا کہ متعدد دلیلوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کا سارا وجود خدا سے وابستہ اور اس کے تکوینی اور تشریعی تدبیر کے ماتحت ہے اور اسی کا محتاج ہے اور اس کی مدد کے بغیر تکوینی اور تشریعی حیثیت سے انسان کی سعادت غیر ممکن ہے۔

فطرت اور مادہ پرستی

متفقہ طور پر ہیومنزم کے ماننے والوں نے فطرت پسندی کو انسان سے مخصوص کیا ہے اور اس کو ایک فطری موجود اور حیوانات کے ہم پلہ بتایا ہے۔ حیوانوں (چاہے انسان ہو یا انسان کے علاوہ) کے درجات کو صرف فرضی مانتے ہیں۔[1] انسان کے سلسلہ میں اس طرح کے فکری نتائج اور ایک طرف فائدہ کا تصور، مادی لذتوں کا حقیقی ہونا اور دنیائے مغرب کی تباہی اور دوسری طرف سے ہر طرح کی اخلاقی قدر و منزلت، معنوی حقوق، معنوی کمالات اور ابدی سعادت کی نفی کی ہے۔

ہم آئندہ مباحث میں ثابت کریں گے کہ نہ تو انسان حیوانوں کے برابر ہے اور نہ ہی مادی اور فطری اعتبار سے منحصر ہے اور نہ ہی اس کی دنیا صرف اسی مادی دنیا سے مخصوص ہے، انسان ایک جہت سے غیر مادی پہلو رکھتا ہے اور دوسری جہت سے انسان موت سے نابود نہیں ہوتا اور اس

[1] فولادوند، عزت اللہ "سیر انسان شناسی در فلسفہ غرب از یونان تا کنون" نگاہ حوزہ، شمارہ ۵۳ و ۵۴، ص: ۱۰۴۔۱۱۱۔

کی زندگی مادی زندگی میں محدود نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا آخری کمال خدا سے قریب ہونا اور خدا جیسا ہونا ہے جس کی کامل تجلی گاہ عالم آخرت ہے جیسا کہ وجود شناسی کے مباحث میں ثابت ہو چکا ہے، خدا صرف ایک فرضی موجود اور انسان کی آرزو، خیالات اور فکری محصول نہیں ہے بلکہ اس کا ایک حقیقی و واقعی وجود ہے نیز وہ تمام وجود کا مرکز اور قدر و منزلت کی خواہشوں کی آماجگاہ ہے سارے عالم کا وجود اس سے صادر ہوا ہے اور اسی سے وابستہ ہے اور اس کی تکوینی و تشریعی حکمت و تدبیر کے ماتحت ہے۔

ہیومنزم اور دینی فکر

عقل و خرد، خدائی عطیہ ہے اور روایات کی روشنی میں باطنی حجت ہے جو خدا کی ظاہری حجت یعنی انبیاء کے ہمراہ ہے، لہٰذا ہیومنزم کی مخالفت کو، عقل و صاحبان خرد کی مخالفت نہیں سمجھنا چاہیئے، وہ چیزیں جو ہیومنزم کی تنقید کے سلسلہ میں بیان ہوتی ہیں وہ عقل کو اہمیت دینے میں افراط خدا اور عقل کو برابر سمجھنا یا عقل کو خدا پر برتری دینا اور عقل پرستی کو خدا پرستی کی جگہ قرار دینا ہے۔ دین کی نگاہ میں عقل انسان کو خدا کی طرف ہدایت کرتی ہے اور اس کی معرفت و عبادت کی راہ ہموار کرتی ہے، امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''العَقلُ مَاعُبدَ بِه الرَّحمٰن و اکتسِبَ بِه الجنَان''[1]

عقل وہ ہے جس کے ذریعہ خدا کی عبادت ہوتی ہے اور بہشت حاصل کی جاتی ہے

اور ابن عباس سے بھی نقل ہوا ہے کہ فرمایا:

''رَبّنَایعرفُ بالعقلِ ویُتوسل إلَیه بالعَقلِ''[2]

ہمارا خدا عقل کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے اور عقل ہی کے ذریعہ اس سے رابطہ برقرار ہوتا ہے۔

---

[1] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار ج ۱، ص ۱۱۶ و ۱۷۰۔

[2] گذشتہ مدرک ص ۹۳۔

عقل کا صحیح استعمال، انسان کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ یوں ہی آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ کی ربوبیت کے زیر سایہ ہے۔ نیز اخلاقی اقدار اور حقوقی اہمیت کے اصول، عقل اور الٰہی فطرت کی مدد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن عقل کی رہنمائی اور توانائی کی یہ مقدار جیسا کہ وہ لوگ خود بھی اس بات پر شاہد ہیں کہ نہ ہی ہیومنزم کی فرد پرستی کا مستلزم ہے اور نہ ہی انسان کی حقیقی سعادت کے حصول کے لئے کافی ہے، وہ چیزیں جو عقل ہمارے اختیار میں قرار دیتی ہے وہ کلی اصول اور انسان کی ضرورتوں کی مبہم فراہمی اور افراد کے حقوق اور انصاف کی رعایت نیز انسان کی بلند و بالا قدر و منزلت، آزادی اور آمادگی اور اس کی قابلیت کی سیرابی ہے۔ لیکن حقیقی سعادت کے لئے بیان کئے گئے میزان و حدود اور اس کے مصادیق و موارد کا پہچاننا ضروری ہے۔ وہ چیزیں جو عقل بشر کی دسترس سے دور ہیں وہ ہیومنزم نظریے خصوصاً ہیومنزم تجربی (او مانیزم کی ایک قسم ہے) کے حامی اس سلسلہ میں یقینی معرفت کے عدم حصول کی وجہ سے مختلف ادیان و مکاتب کے ہر فرضی نظریہ کو پیش کرتے ہیں اور معرفت و سماجی پلورالیزم کے نظریہ کو قبول کرتے ہیں۔[1] تاریخی اعتبار سے اس طرح کے فلسفہ اور نظریات، نوع بشر کو آزادی اور سعادت کی دعوت دینے کے بجائے خوفناک حوادث و مصائب کی سوغات پیش کرتے ہیں[2] اور ان نتائج کو صرف ایک اتفاقی امر اور اچانک وجود میں آنے والا حادثہ نہیں سمجھنا چاہیئے، اگر انسان کو خود اسی کی ذات پر چھوڑ دیا جائے اس طرح سے کہ وہ کسی دوسری جگہ سے رہنمائی اور زندگی ساز ضروری پیغام دریافت نہ کرے

1۔ مومنٹگ کہتا ہے کہ "ہم کو تجربہ کے ذریعہ حقیقت تک پہنچنا چاہیئے، لیکن دنیا حتی کہ انسان کے بارے میں یقین حاصل کرنا مشکل ہے اور یہ تمام چیزیں منجملہ اخلاقی اصول خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہمیں تمام آداب و رسوم کا احترام کرنا چاہیئے اور معاشرے کے پلورالیزم کو قبول کرنا چاہیئے (فولادوند، عزت اللہ، گذشتہ مدرک)۔

2۔ ملاحظہ ہو معماری مدرنیۃ، فصل ہفتم۔

تو جذبات، غصبیہ اور شہویہ قوتیں جو فطری طور سے فعال رہتی ہیں اور ہمیشہ ارتقاء کی طرف گامزن ہیں ساتھ ہی ساتھ اس کی خواہش بھی اس پر حاکم ہو جائے گی اور اس کی عقل سلیم نہ صرف ان امور کے ماتحت ہو جائے گی بلکہ ناپسندیدہ اعمال کی انجام دہی کے لئے عقلی بہانے تراشتی پھرے گی۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ

﴿اِنَّ الانسَان لَیَطغیٰ أن رَاہُ استَغنَی﴾[1]

یقیناً انسان سرکشی کرتا ہے اس لئے کہ وہ خود کو بے نیاز سمجھتا ہے۔

بے قید و شرط آزادی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ ہیومنزم کے ماننے والے معتقد تھے کہ انسانی اقدار حمایت اور طرفداری کے لئے بس فلسفی قوانین ہیں، دینی عقاید و اصول اور انتزاعی دلیلیں انسانی اقدار اور اس کی اہمیت کو پیش کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں[2] انسان کو چاہیئے کہ خود اپنی آزادی کو فطرت (مادہ) اور معاشرہ میں تجربہ کرے ایک نئی دنیا بنانے اور اس میں خاطر خواہ تبدیلی اور بہتری لانے کی صلاحیت انسان کے اندر پوری پوری موجود ہے۔[3]

ایسی بکھری ہوئی اور بے نظم آزادی جیسا کہ عملاً ظاہر ہے بجائے اس کے کہ انسان کی ترقی کی راہیں اور اس کی حقیقی ضرورتوں کو فراہم کریں انسان پر ستم اور اس کی حقیقی قدر و منزلت اور حقوق سے چشم پوشی کا ذریعہ ہوگئی اور مکتب فاشیزم و نازیزم کے وجود کا سبب بنی۔ ''ہارڈی'' کتاب ''بازگشت بہ وحی'' کا مصنف اس کے نتیجہ کو ایک ایسے سانحہ سے تعبیر کرتا ہے کہ جس کا ہدف غیر متحقق ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

۱۔ سورۂ علق ۶ و ۷۔

۲۔ Encyclopedia Britanica.

۳۔ Abbagnona, Nicola, Ibid.

بے وقفہ کمال کی جانب ترقی اور پھر اچانک اس راہ میں شکست کی طرف متوجہ ہونا ۱۹ ویں صدی میں یہی وہ موقع ہے جس کو ''سانحہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو ماڈرن (ترقی پسند) ہونے کی حیثیت سے مشخص ہے۔[۱]

حقیقی اور فطری رغبت کی وجہ سے وجود میں آئی انسان کی خود پسندی میں تھوڑا سا غور و خوض ہمیں اس نتیجہ تک پہونچاتا ہے کہ اگر انسان کی اخلاقی اور حقوقی آزادی دینی تعلیمات کی روشنی میں مہار نہ ہو، تو انسان کی عقل، ہوس پرستی اور بے لگام حیوانی خواہشات کے زیر اثر آکر ہر جرم کو انجام دے سکتی ہے۔[۲] قرآن مجید اور اسلامی روایات بھی اس نکتہ کی طرف تاکید کرتے ہیں کہ وحی سے دور رہ کر انسان خود اور دوسروں کی تباہی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ نیز خود کو اور دوسروں کو سعادت ابدی سے محروم کرنے کے علاوہ اپنی دنیاوی زندگی کو بھی تباہ و برباد کرتا ہے[۳] یہی وجہ ہے کہ قرآن انسان کو (ان شرائط کے علاوہ جب وہ خود کو خدائی تربیت و تعلیم کے تحت قرار دیتا ہے) خسارت والا اور شقی سے تعبیر کرتا ہے ﴿إِنَّ الإنسَانَ لَفِي خُسرٍ إلّا الَّذِينَ آمنُوا وَعَمِلُوا الصَّالحَاتِ وَ تَوَاصَوا بِالحقِّ وتَوَاصَوا بِالصَّبرِ﴾[۴] یقیناً انسان خسارے میں ہے مگر وہ افراد جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں'' اور دوسری طرف ہیومنزم کی بے حد و حصر آزادی کہ جس میں فریضہ اور عوامی مصلحتوں کی رعایت اور ذمہ داری کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، اس نظریہ میں ہر انسان کے حقوق

۱۔ ڈیوس ٹونی، گذشتہ حوالہ، ص ۴۴ و ۴۵۔

۲۔ ڈیوس ٹونی کہتا ہے: ایسا لگتا ہے کہ جفرسون اور اس کے مددگار ۱۷۷۶ کے بیانیہ میں مندرج عمومی آزادی کو اپنے غلاموں یا ہمسایوں میں بھی رواج دیتے تھے۔

۳۔ اس سلسلہ میں قرآن کے نظریہ کی وضاحت آئندہ مباحث میں ذکر ہوگی۔

۴۔ سورۂ عصر ۲ و ۳۔

(واجبات کے علاوہ) کے بارے میں بحث ہوتی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے حق کو بجالائے نہ کہ اپنی تکلیف اور ذمہ داری کو، اس لئے کہ اگر کوئی تکلیف اور ذمہ داری ہے بھی تو حق کے سلسلہ ادائیگی میں اسے آزادی ہے۔[1]

اجتماعی صورت میں ہیومنزم کے ماننے والوں کی آزادی یعنی جمہوریت نیز حقوقی اجتماعی قوانین کے حوالے سے نسبی آزادی کے قائل ہیں جو دینی نظریہ سے مناسبت نہیں رکھتے۔

ہمارے دینی نظریہ کے مطابق سبھی موجودات کا وجود خدا کی وجہ سے ہے اور تمام انسان مساوی خلق ہوئے ہیں نیز ہر ایک قوانین الٰہی کے مقابلہ میں ذمہ دار ہے اور حاکمیت کا حق صرف خدا کو ہے۔ پیغمبر، ائمہ اور ان کے نائبین، ایسے افراد ہیں جن کو ایسی حاکمیت کی اجازت دی گئی ہے۔ حقوقی اور اخلاقی امور جو اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور معین ہوئے ہیں ثابت اور غیر متغیر ہیں۔ دین کی نگاہ میں اگر چہ افراد کے حقوق معین و مشخص ہیں جن کو عقل اور انسانی فطرت مجموعی اعتبار سے درک کرتی ہے لیکن حدو حصر کی تعیین اور ان حقوق کے موارد اور مصادیق کی تشخیص خدا کی طرف سے ہے اور تمام افراد، الٰہی فریضہ کے عنوان سے ان کی رعایت کے پابند ہیں، ہیومنزم کی نظر میں انسانوں کی آزادی کے معنی دینی اعتقادات کو پس پشت ڈالنا اور اس کے احکام سے چشم پوشی کرنا ہے لیکن اسلام اور آسمانی ادیان میں انسانوں کے ضروری حقوق کے علاوہ بعض

---

[1] ہم یہاں اس مسئلہ کا ذکر کرنا نہیں چاہتے کہ انسان کا مکلف ہونا بہت ہی معقول اور فائدہ مند چیز ہے یا اسی طرح حق اور حق پسند ہونا بھی معقول ہے۔ لیکن ہم مختصراً بیان کریں گے کہ سماجی فرائض اور دوسروں کے حقوق کے درمیان تلازم پائے جانے کی وجہ سے الٰہی اور دینی فرائض مورد قبول ہونے کے علاوہ اسے مستحکم عقلی حمایت بھی حاصل ہے دنیاوی فائدہ اور افراد معاشرہ کے حقوق کی فراہمی کے اعتبار سے ہیومنزم حق پرستی پر برتری رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس معتبر نظام میں جب کہ ہر فرد اپنا حق چاہتا ہے اس کے باوجود اگر کوئی دوسروں کے حقوق کی رعایت کے مقابلہ میں احساس ذمہ داری کرتا ہے تو وہ خود کو خداوند منان کی بارگاہ میں جواب گو سمجھتا ہے۔

مقدسات اور اعتقادات کے لئے بھی کچھ خاص حقوق ہیں جن کی رعایت لازم ہے۔ مثال کے طور پر انسان پسندی کا عقیدہ رکھنے والے کے اعتبار سے جس نے بھی اسلام قبول کیا ہے اسلام کو چھوڑ کر کافر و مشرک ہونے یا کسی دوسرے مذہب کے انتخاب کرنے میں بغیر کسی شرط کے آزاد ہے۔ لیکن اسلام کی رو سے وہ مرتد ہے (اپنے خاص شرائط کے ساتھ) جس کی سزا قتل یا پھانسی ہے جیسا کہ پیغمبرؑ اور معصومین علیہم السلام کو ناسزا (سب) کہنے کی سزا پھانسی ہے لیکن ہیومنزم کی نگاہ میں ایسی سزا قابل قبول نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک پیغمبرؑ وائمہ معصومین اور دیگر افراد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

لاتعلقی وسستی

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ انسان پسندی کا عقیدہ رکھنے والے مطلقاً لاتعلقی ولاپرواہی کی حمایت وطرف داری کرتے ہیں اور اس کو قرون وسطی کے رائج تہذیب سے مقابلہ کی نشانی اور قدیم یونان وروم کی طرف بازگشت نیز آزادی اور انسانی قدر ومنزلت کا تقاضا جانتے ہیں۔ انہوں نے تمام کامیابیوں کو انسانی کارنامہ اور فکر بشر کا نتیجہ سمجھا ہے شناخت کے حوالے سے، شکاکیت ونسبیت کے نظریہ سے وابستہ ہیں۔ وہ لوگ اعتبارات ضروریات اور افکار کے ایک خاص مجموعہ کی تائید نیز حاکمیت اور اس سے دفاع کو ایک غیر معقول بات تصور کرتے ہیں۔

یہ نظریہ مذاہب آسمانی کی تعلیمات خصوصاً اسلام سے مختلف جہتوں میں نہ صرف یہ کہ سازگار نہیں ہے بلکہ متضاد بھی ہے، ایک طرف تسامح وتساہل کے اصول (انسان اور اعتبارات و معرفت کے درمیان رابطہ) دینی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے اور دینی تفکر میں خداوند عالم کی ذات نقطۂ کمال ہے نہ کہ انسان کی ذات اور یہ اہمیت ومنزلت یقینی معرفت کی حمایت سے مزین ہے اور دوسری طرف اسلام ہر دین کے (حتی ادیان غیر الٰہی) اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ

تساہل وتسامح کو قبول نہیں کرتا بلکہ کفر والحاد کے مقابلہ میں صلح و آشتی کو نا قابل تسلیم جانتا ہے۔[1]
خاص طور سے دوسرے الٰہی ادیان کے ماننے والوں کے سلسلہ میں اسلام، نرمی کا برتاؤ بھی معقول انداز ہی میں کرتا ہے، اور اسلامی معاشرے نیز مسلمانوں کے درمیان دوسرے مذاہب کی تبلیغ قابل قبول نہیں ہے، ان لوگوں کو حکومت اسلامی کے قوانین کے خلاف کسی عمل کے انجام دینے اور علنی طور پر محرمات اسلام کے مرتکب ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ ان قوانین کے حصار میں اسلام نہ صرف دوسرے ادیان کے ماننے والوں سے نرمی کے برتاؤ کی تاکید کرتا ہے بلکہ ان سے نیکی کی وصیت کرتا ہے اور قید و بند اور ظلم سے انسانوں کو رہائی دلانے کے لئے اپنی تلاش جاری رکھتا ہے اور ان لوگوں کی فریادرسی کرتا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں انصاف چاہتے ہیں نیز یہ مسلمانوں کی علامتوں اور وظائف میں سے ہے کہ وہ مظلوموں کی فریادرسی کریں۔

[1] البتہ وہ فکر و اندیشہ جو ایک اندرونی اور غیر اختیاری فعل ہے ہماری بحث سے خارج ہے، اور کسی ایمان وفکر سے وابستہ ہونا اور اس کا نشر کرنا تفکرات کے لئے اختیار کا امکان فراہم کرنا یا اس کو باقی رکھنا یہ ہے کہ وہ امر اختیاری ہو۔

خلاصۂ فصل

ا۔ انسان کی حقیقی شخصیت اور اس کی قابلیت اور توانائی کے سلسلہ میں دو بالکل مختلف نظریات موجود ہیں:

ایک نظریہ انسان کو پوری طرح سے مستقل، مختار اور ہر طرح کی ذمہ داری سے عاری موجود جانتا ہے اور دوسرا نظریہ خدا سے وابستہ نیز خدا کی طرف اس کے محتاج ہونے کا قائل ہے اور پیغمبروں کی مدد سے خدا کی مخصوص ہدایت سے بہرہ ور اور خداوند عالم کے قوانین کے انجام دینے کا اس کو ذمہ دار مانتا ہے۔

۲۔ انسان شناسی کا عقیدہ رکھنے والوں (نظریہ اول کے ماننے والوں) نے انسان کو ہر چیز کا معیار قرار دے کر کلیسا کی تعلیمات اور عیسائیت کے قدیمی دین کو خرافات تصور کیا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق فکری مثال تلاش کرنے کے لئے روم وقدیم یونان کے افکار کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں۔

۳۔ انسان شناسی کا نظریہ رکھنے والے افراد قدیم یونان سے استفادہ کرتے ہوئے عیسائیت کی نفی کرنے لگے اور ''دین اور خدا کی نئی تفسیر، دین اور عیسائی تعلیمات کی نفی، خدا کا اقرار اور ہر خاص دین کی نفی، دین میں شکوک اور آخر کار دین اور خدا سے مکمل طور پر انکار کر دیا ہے''۔

۴۔ انسان شناسی اور انسان پر مبنی انحصار جو شروع میں ایک ادبی، فلسفی تحریک تھی آہستہ آہستہ فکری، سماجی تحریک میں تبدیل ہوگئی جو بھی علمی، ہنری، فلسفی، اخلاقی حتی دینی نظام اور قوانین پر حاوی ہوگئی اور کمیونیزم، پریکماٹیزم، لبرلیزم اور پروٹسٹنٹ (اصلاح پسند عیسائیت) کو وجود میں لانے کا سبب بن گئی۔ اسی بنا پر آج انسان شناس حضرات، ملحد انسان پرست اور موحد انسان پرست میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

۵۔ ہیومنزم کے بنیادی خمیر کا عقل پسندی کی حد سے زیادہ تجربات پر اعتماد کرنا نیز حریت پسندی کے مسئلہ میں زیادتی سے کام لینا، لاتعلقی و سستی اور سکولر یزم جیسے اجزاء تشکیل دیتے ہیں۔

۶۔ ہیومنزم کے بنیادی اجزاء، انتہا پسندانہ پہلوؤں کی وجہ سے میدان عمل میں فاشیزم اور نازیزم کے نظریات سے جا ملے، جس کی وجہ سے یہ موضوع، انسان دوستی اور مطلقا خواہشات انسانی کی اہمیت اور اس کی اصالت کے قائل ہونے نیز عقل کے خطا پذیر ہونے کا یہ طبیعی نتیجہ ہے۔

۷۔ انسان کو خدا کی جگہ تسلیم کرنا، مضبوط فکری انحصاریت کا نہ ہونا، حد سے زیادہ تجربہ اور انسانی عقل کو اہمیت دینا اور شناخت کی قدر و منزلت اور شناخت کی معرفت میں نسبیت کا قائل ہونا یہ ایسے سست ستون ہیں جن سے ہیومنزم دوچار ہے۔

تمرین

اس فصل سے مربوط اپنی معلومات کو مندرجہ ذیل سوالات و جوابات کے ذریعہ آزمائیں:

۱۔ ہیومنزم اور شخص پرستی کے درمیان نسبت کو بیان کریں؟

۲۔ اسلام کی نظر میں ایمان، اعمال اور اعتبارات میں لاتعلقی اور سستی کا کیا مقام ہے؟ مثال کے ذریعہ واضح کریں؟

۳۔ ''آتیتکم بالشریعة السهلة السّمحَة'' سے مراد کیا ہے اور سہولت اور سماحت کے درمیان کیا فرق ہے؟

۴۔ ان آیات میں سے دو آیت جو خود ہمارے اور دوسرے الٰہی ادیان کے ماننے والوں سے مسلمانوں کے نرم برتاؤ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں بیان کریں؟

۵۔ حقیقی راہ سعادت کے حصول میں انسانی عقل کی ناتوانی پر ایک دلیل پیش کریں؟

۶۔ آزادی اور استقلال، سستی، بے توجہی اور نرمی کا برتاؤ، مغربی عقل پرستی ہیومنزم اور دینی اصول میں عقل پر بھروسہ کرنے کے درمیان فرق کو بیان کریں؟

مزید مطالعہ کے لئے

احمدی، بابک (۱۳۷۷) معمای مدرنیتہ، تہران: نشر مرکز۔

احمدی، بابک مدرنیتہ واندیشہ انتقادی، تہران: نشر مرکز۔

بلیسٹر، آر (بی تا) ظہور وسقوط لیبرالیزم، ترجمہ عباس مخبر، تہران: نشر مرکز (بی تا)۔

بیوارکہارٹ، جیکب، (۱۳۷۶) فرہنگ رنسانس در ایتالیا، ترجمہ محمد حسن لطفی تہران انتشارات طرح نو۔

ڈیوس ٹونی (۱۳۷۸) لیبرالیزم ترجمہ عباس مخبر، تہران: چاپ مرکز۔

رجبی، فاطمہ (۱۳۷۵) لیبرالیزم، تہران: کتاب صبح۔

رنڈال، جان ہرمن (۱۳۷۶) سیر تکامل عقل نوین، ترجمہ ابوالقاسم پایندہ تہران، انتشارات علمی وفرہنگی، ایران۔

سلیمان پناہ، سید محمد: ''دین وعلوم تجربی، کدامین وحدت؟'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ۔ شمارہ ۱۹، ص ۱۱، ۵۴۔

صانع پور، مریم، (۱۳۷۸) نقدی بر مبانی معرفت شناسی ہیومنیسٹی۔ تہران: اندیشہ معاصر۔

فولادوند، عزت اللہ: سیر انسان شناسی در فلسفہ غرب از یونان تا کنون'' مجلّہ نگاہ حوزہ، شمارہ ۵۳ و ۵۴۔

کیسیرر، ارنسٹ (۱۳۷۰) فلسفہ روشنگری: ترجمہ یداللہ موقن، تہران، نیلوفر۔

لبرلیزم سے مربوط کتابیں، روشنگری (رنسانس) وپسامدرنیزم، ہیومنزم کی ترکیبات و انسان مداران کی تالیفات۔

گیڈنز، انھونی (۱۳۷۷) فرہنگ علمی انتقادی فلسفہ۔ ترجمہ غلام رضا وثیق تہران: فردوسی ایران۔

نوذری، حسین علی (۱۳۷۹) صورت بندی مدرنیتہ وپست مدرنیتہ، تہران چاپخانہ علمی و فرہنگی ایران۔

نہادنمایندگی رہبری دردانشگاہہا، بولتن اندیشہ۔ شمارہ۲و۳۔

واعظی، احمد (۱۳۷۷) ''لیبرالیزم'' مجلّہ معرفت، شمارہ ۲۵ ص ۲۵۔۳۰، قم موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

ویل ڈورانٹ (۱۳۷۱) تاریخ تمدن، ترجمہ صفدرتقی زادہ وابوطالب صارمی جلد پنجم، تہران، انتشارات وآموزشی انقلاب اسلامی، ایران۔

ملحقات

ہیومنزم کے سلسلہ میں دانشوروں کے مختلف نظریات، اس کے عناصر اور اجزاء میں اختلاف کی بنا پر ہے جو ہیومنزم کے نتائج اور موضوعات کے درمیان موجود ہیں اور اس کے ماننے والوں کے نظریات میں نسبتاً زیادہ تنوع کی وجہ ان کی تجرباتی، اجتماعی اور سماجی صورتحال نیز ہیومنزم کے سلسلہ میں دانشوروں کی طرف سے مختلف نظریات پیش ہوئے ہیں۔

ایک طرف تو ایسے دانشور ہیں جو اس نظریہ کو ایک انسانی مخالف تحریک سمجھتے ہیں جو انسانوں کے لئے سوائے خسارے کے کوئی پیغام نہیں دیتی اور اس کے بارے میں ان کی تعبیرات یوں ہیں ''دھوکہ دینے والا مفہوم، قوم کی برتری اور غیر قابل وضاحت فردکی حکمرانی کی آواز درندگی کی وضاحت وجواز اور تخفیف نیز ماڈرن دور کی آشکار انداز میں نابرابری شخصی آزادی پسندی اور فردی مفادات کا پورا ہونا، نازیزم وفاشیزم کی بے ہودہ پیداوار اور ان کا وجود، ماحول حیات کو ویران کرنے والی انسانی مخالف عادتوں اور فطری قوتوں پر حملہ آور قوتوں کو پرورش دینا جو آخر کار انسان کی ویرانی پر ختم ہوتا ہے، خوفناک اور ویران کرنے والی قوت جو آرام وسکون کا برتاؤ نہیں کرتی ہے، خیالی اور جھوٹے دعوے، امپریالیزم کے ہم رتبہ وہم مرتبہ، اسٹالینزم کی ایک دوسری تعبیر اور عیسائیت کے بعد کے احوال کے لئے ایک خطرناک چیز، آخری صدی میں ایک بناوٹی مفہوم جو ایک عظیم دستور کے عنوان سے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دینے کے لائق ہے، معاشرے کے بلند طبقہ نیز قدرت واقتدار کے مرکز کی تاویل وتوجیہ، شاہنامہ فکر جو ایک خاص طبقے کے مفادات کی تاکید کرتی ہے اور جس کو اپنی آغوش میں لے کر اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے، ہر جرم کا نتیجہ، متناقض معانی اور مختلف پیغامات سے پر، ایسے سانحہ کا پیش خیمہ جس کا مقصد پورا ہونے والا نہیں ہے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی: گذشتہ حوالہ، ص ۲۷، ۳۶، ۴۵، ۴۶، ۵۴، ۶۲، ۶۴، ۸۴، ۹۴، ۱۴۷، ۱۷۸۔ احمدی، بابک گذشتہ حوالہ ص ۹۱، ۹۳، ۱۱۰، ۱۲۲۔

دوسری طرف ہیومنزم کا دفاع کرنے والے ہیں جن کی کوشش انسان اور اس کی صلاحیت کو کمال بخشنا ہے، نیز فکری اور اخلاقی آزادی کو پورا کرنا، انسان کی زندگی کو عقلانی بنانا، انسان کی آزادی اور شرافت کی حمایت کرنا اور اس کی ترقی کی راہ ہموار کرنا اور مکمل طور پر مقابلہ مبارزہ کرنے والا اور جہل وخرافات کے مقابلہ میں کامیاب ہونے والا بتایا ہے۔[1]

اگرچہ ہیومنزم کے بعض منفی پہلوؤں کو انسان پرستی کا دعویٰ کرنے والوں کی غلط فکر سمجھنا چاہیئے لیکن یہ تحریک جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ کم از کم اس طرح کے ناپسندیدہ حوادث کے واقع ہونے کے لئے ایک مناسب ذریعہ تھی اور اس کا دعویٰ کرنے والوں کی کثیر تعدا اور ان کی بعض تاریخ، منفی پہلو سے آمیختہ تھی۔

عوامی عقل کو محور قرار دینا اور ایسے دینی واخلاقی اقدار کی مخالفت جو معاشرے کے افراد کو معنوی انحرافات، دوسروں کے حقوق پر جارحیت اور فساد پر کنٹرول کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں جس کا نتیجہ ماڈرن اسباب وامکانات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ غیر شائستہ افراد کے وجود میں آنے کی راہ ہموار کرنا اور ناگوار حوادث کے جنم لینے کا سبب نیز ان حوادث کی عقلی توجیہ بھی کرنا ہے۔

ہیومنزم کے نظریات میں اختلافات اور ہیومنزم کی تعریف میں مشکلات کا سبب اس کے ماننے والوں کے مختلف نظریات ہیں، بعض افراد مدعی ہوئے ہیں کہ ان مختلف نظریات کے درمیان کوئی معقول وجہ اشتراک نہیں ہے اور ان نظریات کو ہیومنزم کے کسی ایک نمونہ یا سلسلہ سے نسبت نہیں دی جاسکتی ہے اسی بناء پر ہیومنزم کی تعریف کے مسئلہ کو ایک سخت مشکل سے روبرو ہونا پڑا اور وہ لوگ معتقد ہیں کہ ہمارے پاس ایک ہیومنزم نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیومنزم کے مختلف انواع کو مندرجہ ذیل عناوین سے یاد کرتے ہیں:

---

[1] ملاحظہ ہو: ڈیوس ٹونی، گذشتہ حوالہ، ص۹۔

۱۵ویں صدی میں اٹلی کے مختلف شہری ریاستوں کا مدنی و معاشرتی ہیومنزم ۱۶ ویں صدی میں یورپ کے پروٹسٹل فرقہ کا ہیومنزم، ماڈرن آزاد و روشن خیال انقلاب کا فردی ہیومنزم، یورپ کے سرمایہ دار طبقے کا رومینٹک ہیومنزم، انقلابی ہیومنزم جس نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا، لیبرل ہیومنزم جو انقلابی ہیومنزم کو مہار کرنے کے درپے تھا، نازیوں کا ہیومنزم، نازیوں کے مخالفین کا ہیومنزم، ہیڈگر، انسان مخالف ہیومنزم، فوکو اور آلتوسر کی انسان پسندی کے خلاف ہیومنزم وغیرہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مختلف ہیومنزم کے مشترکات کو ایک نظریہ میں سمویا جاسکتا ہے کہ جس میں ہر ایک، ہیومنزم کے مختلف درجات کے حامل ہیں اور ہم نے اس تحقیق میں ہیومنزم کے مشترکات اور ان کے مختلف نتائج اور آثار کو مودر توجہ قرار دیا ہے۔

خود فراموشی

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔ بے توجہی کے مفہوم کی اختصار کے ساتھ وضاحت کریں؟

۲۔ بے توجہی کے مسئلہ میں قرآن کریم کے نظریات کو بیان کریں؟

۳۔ بے توجہ انسان کی خصوصیات اور بے توجہی کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے کم از کم پانچ موارد کی طرف اشارہ کریں؟

۴۔ فردی اور اجتماعی بے توجہی کے سدباب کے لئے دین اور اس کی تعلیمات کے کردار کو بیان کریں۔

۵۔ بے توجہی کے علاج میں عملی طریقوں کی وضاحت کریں؟

دوسری فصل میں ہم نے بیان کیا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے حصہ میں اٹلی اوراس کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں میں ادبی، ہنری، فلسفی اور سیاسی تحریک وجود میں آئی جوانسان کی قدر ومنزلت کی مدعی تھی جب کہ قرون وسطی میں انسان جیسا چاہیئے تھا مورد توجہ قرار نہیں پاسکا اوراس دور میں بھی انسان ایک طرح سے بے توجہی کا شکار رہا ہے، ان لوگوں نے اس دور کے (نظام کلیسائی) موجودہ دینی نظام سے دوری اور روم وقدیم یونان کے صاحبان عقل کی طرف بازگشت کوان حالات کے لئے راہ نجات مانا ہے اوراس طرح ہیومنزم ہر چیز کے لئے انسان کو معیار و محور قرار دینے کی وجہ سے ایک مجموعی فکر کے عنوان سے مشہور ہوا ہے۔

گذشتہ فصل میں ہیومنزم کی پیدائش، اس کی ترکیبات وضروریات، مقدار انطباق اور اس کی دینی اوراسلامی تعلیمات سے سازگاری کی کیفیت کے سلسلہ میں گفتگو کی تھی اوراس فصل میں ہمارا ارادہ ہیومنزم کی بنیادی چیزوں میں سے ایک یعنی بے توجہی کے مسئلہ کو بیان کرنا ہے جو بعد کی صدیوں میں بہت زیادہ مورد توجہ رہا ہے یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو ہیومنسٹوں نے نادرست تصور کیا ہے اور بعض نے اس مسئلہ کواس دور کے ہیومنزم کی غلط تحریک کی ایجاد بتایا ہے۔

لاتعلقی کا مفہوم

ہماری دنیا کی ملموسات ومحسوسات میں سے فقط انسان کا ہی وہ وجود ہے جواپنی حقیقی شخصیت کو بدل سکتا ہے، چاہے تو خود کو بلندی بخشے یا خود کو ذلت اور پستی میں تبدیل کر دے اس

طرح صرف انسان کی ذات ہے جو اپنی حقیقی شخصیت کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرتا ہے یا اپنے سے غافل ہو کر خود کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی حقیقی شخصیت یعنی اپنے ضمیر کو بیچ کر بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔[1]

انسان شناسی کے اہم ترین مسائل میں سے ایک انسان کا خود سے بے توجہ ہو جانا ہے جو علوم انسانی کے مختلف موضوعات میں بھی مورد توجہ رہا ہے، یہ مفہوم جو یورپ کی زبانوں میں Alienation سے یاد کیا جاتا ہے معاشرہ شناسی، نفسیات، فلسفی اعتبارات (اخلاقی اور حقوقی) حتی ماہرین نفسیات کے مفہوم سے سمجھا جاتا ہے اور زیادہ تر علوم انسانی کے مختلف شعبوں میں اسی کے حوالے سے گفتگو ہوئی ہے۔ کبھی اس مفہوم کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ ''ڈورکھیم'' کہتا ہے:

انسان کی بے نظمی Anomic معرفت نفس اور اس کے مثل، شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو شامل ہوتی ہے اور کبھی اس نکتہ کی تاکید ہوتی ہے کہ بے توجہی کے مفہوم کو ان مفاہیم سے ملانا نہیں چاہیئے۔[2]

یہ لفظ Alienation [3] ایک عرصہ تک کبھی مثبت پہلو کے لئے اور زیادہ تر منفی اور

---

[1] خود فراموشی کا مسئلہ انسان کی ثابت اور مشترک حقیقت کی فرع ہے اور جو لوگ بالکل انسانی فطرت کے منکر ہیں وہ اپنے نظریہ اور مکتب فکر کے دائرے میں خود فراموشی کے مسئلہ کو منطقی انداز میں پیش نہیں کر سکتے ہیں۔

[2] اس کلمہ کے مختلف ومتعدد استعمالات اور اس میں عقیدہ کثرت کی روشنی میں بعض مدعی ہیں کہ یہ مفہوم فاقد المعنی یا مہمل ہو گیا ہے۔

(۳) یہ کلمہ اور اس کے مشتقات انگریزی زبان میں مبادلہ، جدائی، دوری، عقل کا فقدان، ہزیان بکنا، جن زدہ ہونا، خراب کرنا، پراکندہ کرنا اور گمراہ کرنے کے معنی میں ہے اور فارسی میں اس کلمہ کے مقابلہ میں بہت سے مترادف کلمات قرار دیئے گئے ہیں جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

باقی حاشیہ اگلے ص پر.........

مخالف پہلو کے مفہوم سے وابستہ تھا۔[۱] کلمۂ حقیقی ہیگل[۲]، ''فیور بیچ'' اور ''ہس''[۳] کے ماننے والوں کی وجہ سے ایک سکولریزم مفہوم سمجھا گیا ہے۔ وہ چیزیں جو آج سماجی اور علمی حلقوں میں مشہور ہیں اور یہاں پر جو مدنظر ہے وہ اس کا منفی پہلو ہے، اس پہلو میں انسان کی ایک حقیقی اور واقعی شخصیت مدنظر ہوتی ہے کہ جس کے مخالف راہ میں حرکت اس کی حقیقی ذات سے فراموشی کا سبب بن جاتی ہے اور اس حقیقی شخصیت سے غفلت انسان کو پرائی قوتوں کے زیر اثر قرار دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے سے ماسواء کو اپنا سمجھتا ہے اور اس کی اپنی ساری تلاش اپنے غیر کے لئے ہوتی ہے۔ خود سے بے توجہی، مختلف گوشوں سے دانشوروں کی توجہ کا مرکز ہوگئی ہے۔ جس میں اختیار یا جبر، فطری یا غیر فطری، مختلف شکلیں، ایجاد کرنے والے عناصر اور اس کے نتائج کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے تمام گوشوں، نظریات نیز اس کے دلائل کی تحقیق و تنقید کو اس کتاب میں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ضروری، لہٰذا ان موارد میں ایک سرسری اشارہ کرنے پر ہی اکتفاء کریں گے۔

خود فراموشی، نا چاہنا، بے رغبتی، خود سے بے توجہی، بے توجہی کا درد، خود سے غافل ہونا، سست ہونا، جن زدہ ہونا، بیگانہ ہونا، بیگانوں میں پھنسنا، دوسروں کو اپنی جگہ قرار دینا، دوسروں کو اپنا سمجھنا اور خود کو غیر سمجھنا وغیرہ، اس مقالہ میں رائج مترادف کلمہ ''خود کو بھول جانا'' انتخاب کیا گیا ہے، اگرچہ ہم ''دوسرے کو اپنا سمجھنا'' والے معنی ہی کو مقصود کی ادائیگی میں دقیق سمجھتے ہیں۔

۱۔ غنوصیوں نے میلاد مسیح سے پہلے قرن اول میں اور میلاد مسیح کے بعد قرن دوم میں نیز ''وون کاسٹل'' (۱۔۱۱۳۷۔۱۰۸۸ام) نے اس کو نفس انسان کی گمراہی سے رہائی، نیرنگی اور دوبارہ تولد کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ہگل بھی مثبت و منفی خود فراموشی کا قائل ہے، لیکن دوسرے مفکرین و ادیان الٰہی اور اس کے ماننے والے خود فراموشی کو منفی و غیر اخلاقی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: بدوی، عبد الرحمن موسوعۃ الفلسفہ، طہ فرج، عبد القادر، موسوعۃ علم النفس والتحلیل النفسی۔

۲۔ Pauer

۳۔ Hess

''خودفراموشی'' کے مسائل کو بنیادی طور پر ادیان آسمانی کی تعلیمات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ آفاقی ادیان ہی ہیں کہ جنھوں نے ہر مکتب فکر سے پہلے اس مسئلہ کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے نیز اس کے خطرے سے آگاہ کیا ہے اور اس کی علامتوں کو بیان کرتے ہوئے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی عملی حکمت پیش کی ہے۔ اس کے باوجود انسانی واجتماعی علوم کے مباحث میں فنی علمی طریقہ سے ''خودفراموشی'' کے مفہوم کی وضاحت اور تشریح کو ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کے بعض دانشوروں خصوصاً ''ہیگل، فیورباخ اور مارکس'' کی طرف نسبت دی گئی ہے۔[1] ادین اور ''خودفراموشی'' کے درمیان رابطہ کے سلسلہ میں ان تینوں مفکروں کے درمیان وجہ اشتراک یہ ہے کہ تینوں خود دین کو انسان کی خودفراموشی کی وجہ مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ: جب دین کو درمیان سے ہٹادیا جائے گا تو انسان ایک دن اپنے آپ کو درک کرلے گا۔ اور کم از کم جب تک دین انسان کی فکر پر حاوی رہے گا انسان ''خودفراموشی'' کا شکار رہے گا۔[2] یہ بات ٹھیک آسمانی ادیان

---

[1] مذکورہ تین مفکروں کے علاوہ تھامس ہابز Thomas Hobbes ۱۶۷۹۔۱۵۸۸ بینڈکٹ اسپینوزا (Benedict Spinoza ۱۶۷۷۔۱۶۳۲) جان لاک (John Locke ۱۷۰۴۔۱۶۳۲) ژان ژاک روسو (Jean Jacquess Rousseau ۱۷۷۸۔۱۷۱۲) میکس اسکلر (Max Scheler ۱۸۸۵۔۱۸۰۹) جان فشے (Johann Fichte ۱۸۶۲۔۱۸۴۱) ولفگیگ گوئٹے (Wolfgang Goethe ۱۸۳۲۔۱۷۴۹) ویلیم وون ہمبولٹ (Wilhelm Von Humboldt ۱۸۳۵۔۱۷۶۷) سورن کیر کیگارڈ (Soren Kier Kegaard ۱۸۵۵۔۱۸۱۳) پال ٹیلیچ (Paul Tillich ۱۹۶۵۔۱۸۸۶) منجملہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خودفراموشی کے مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: زورنثال و۔۔۔ الموسوعۃ الفلسفیۃ، ترجمہ سمیر کرم، بدوی، عبدالرحمٰن، موسوعۃ الفلسفیۃ۔ زیادہ، معن، الموسوعۃ الفلسفیۃ العربیۃ۔

[2] اگرچہ ہیگل نے دو طرح کے دین کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک وہ دین جو انسان کو ذلیل وخوار کرکے

باقی حاشیہ اگلے ص پر.........

کی فکر کا نقطہ مقابل ہے خصوصاً خود فراموشی کے مسئلہ میں اسلام وقرآن کے خلاف ہے، بہر حال حقیقی طور پر دینی نقطہ نظر سے ''خود فراموشی'' کا مسئلہ ایک مستقل شکل میں مسلمان مفکرین کے نزدیک مورد توجہ قرار نہیں پایا ہے لہٰذا صاحبان فکر کی جستجو کا طالب ہے۔

قرآن کی روشنی میں ''خود فراموشی'' کے مسئلہ کو اس ارادہ سے بیان کیا گیا ہے تا کہ ہم بھی ایک ایسا قدم بڑھائیں جو اسلام کے نظریہ سے اس کی تحلیل و تحقیق کے لئے نقطۂ آغاز ہو، اس لئے ہم بعض قرآنی آیات کی روشنی میں ''خود فراموشی'' کے مسئلہ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

قرآن اور خود فراموشی کا مسئلہ

بحث شروع کرنے سے پہلے اس نکتہ کی یاد دہانی ضروری ہے کہ ''خود فراموشی'' کا مسئلہ بیان کرنا، اس خاکہ سے بالکل مربوط ہے جسے انسان کی شخصیت وحقیقت کے بارے میں مختلف مکاتب فکر نے پیش کیا ہے اور مختلف مکاتب میں اس خاکہ کی تحقیق و تحلیل اس کتاب کے امکان سے خارج ہے اسی لئے صرف اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن کی روشنی میں انسان کی حقیقت کو اس کی ابدی روح ترتیب دیتی ہے جو خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی طرف واپس ہو جائے گی، انسان کی حقیقت ''اسی سے'' اور ''اس کی طرف'' ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾[1] ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ

بقیہ پچھلے ص کا حاشیہ......

خداؤں کے حضور میں قربانی کرتا ہے جیسے یہودیت اور دوسرا دین وہ ہے جو انسان کو حیات اور عزت دیتا ہے۔ پہلے قسم کا دین خود فراموشی کی وجہ سے ہے لیکن دوسرے قسم کے دین کی خصوصیات حقیقی ادیان پر منطبق نہیں ہے صرف ایک عرفانی نظریہ اور معارف دینی کے ذریعہ ان دونوں کو ایک حد تک ایک دوسرے سے منطبق سمجھا جا سکتا ہے، اگر چہ ہیگل، خدا اور روح وعقل کے بارے میں ایک عمومی بحث کرتا ہے لیکن ھگل کا خدا، عام طور پر ان ادیان کے خدا سے جس کا مومنین یقین رکھتے ہیں بالکل الگ ہے اور وہ خدا کو عالی ومتعالی، عظیم، خالق ماسوا، انسان پر مسلط اور انسانوں کے اعمال کے بارے میں سوال کرنے والا موجود نہیں سمجھتا ہے۔

[1] سورۂ بقرہ، ۱۵۶۔

سے انسان کی صحیح و دقیق شناخت، خدا سے اس کے رابطہ کو مدنظر رکھے بغیر ممکن نہیں ہے، انسان کا وجود خدا سے ملا ہوا ہے اس کو خدا سے جدا اور الگ کرنا گویا اس کے حقیقی وجود کو پردۂ ابہام میں ڈال دینا ہے، اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے غیر الٰہی مکتب میں غفلت برتی گئی ہے یا اس سے انکار کیا گیا ہے دوسری طرف انسان کی حقیقی زندگی عالم آخرت میں ہے جسے انسان اس دنیا میں اپنی مخلصانہ کوشش اور ایمان کے ساتھ آمادہ کرتا ہے، لہٰذا قرآن کی نگاہ میں ''خود فراموشی'' کے مسئلہ کو اسی تناظر میں مورد توجہ قرار دینا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں دوسرا پہلو جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ''خود فراموشی'' کا نام دینے والوں نے انسان اور اس کی زندگی کو دنیاوی زندگی میں اور مادی و معنوی ضرورتوں کو بھی دنیاوی زندگی میں محصور کر دیا ہے اور مسئلہ کے سبھی گوشوں پر اسی حیثیت سے نگاہ دوڑائی ہے مزید یہ کہ ان میں سے بعض دنیا پرستوں کے فلسفی اصولوں کو قبول کر کے ایک آشکار اختلاف میں مبتلا ہو گئے اور انسان کو دوسری غیر مادی اشیاء کی حد تک گرا کر مسئلہ کو بالکل نادرست اور غلط بیان کیا ہے، ایسی حالت میں جو چیز غفلت کا شکار ہوئی ہے وہ انسان کا حقیقی وجود ہے اور حقیقت میں اس کی ''خود فراموشی'' کا مفہوم ہی مصداق اور ''خود فراموشی'' کا سبب بھی ہے۔

قرآن مجید نے بارہا غفلت اور خود کو غیر خدا کے سپرد کرنے کے سلسلہ میں انسان کو ہوشیار کیا ہے اور بت پرستی، شیطان اور خواہشات نفس کی پیروی نیز آباؤ اجداد کی چشم بستہ تقلید کے بارے میں سرزنش کی ہے۔ انسان پر غلبۂ شیطان کے سلسلہ میں بارہا قرآن مجید میں آگاہ کیا گیا ہے، اور جن و انس اور شیاطین کے وسوسہ سے انسان کے خطرۂ انحراف کی تاکید ہوئی ہے۔[1] اسلامی نظریہ اور انسانی معاشرہ میں بیان کئے گئے مفاہیم سے آشنائی قابل قبول اور لائق درک و فہم

---

[1]۔ یہ مفاہیم روایات میں بھی مذکور ہیں، ان مفاہیم سے مزید آگاہی کے لئے نہج البلاغہ کی طرف رجوع کریں مرتضیٰ مطہری، سیری در نہج البلاغہ، ص ۲۹۱۔۳۰۶۔

ہیں، جب کہ اگر ان پر ''خودفراموشی'' کے مسئلہ کی روشنی میں توجہ دی جائے تو معلومات کے نئے دریچے کھلیں گے، لیکن ''خودفراموشی'' اور ضرر جیسے مفاہیم جو بعض آیات میں ذکر ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی ضروری مفاہیم ہیں جن پر مزید توجہ کی ضرورت ہے اور انسان کو غور کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں، لیکن کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان ''خودفراموشی'' کا شکار ہو جائے اور خود کو بھول جائے یا یہ کہ خود کو بیچ دے؟ کیا خود کو ضرر پہنچانا بھی ممکن ہے؟ انسان ضرر اٹھاتا ہے اور اس کا ضرر موجودہ امکانات کے کھو دینے کے معنی میں ہے، لیکن خود کو نقصان پہنچانے کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے اور کس طرح انسان اپنی ذات کے حوالے سے ضرر سے دوچار ہوتا ہے؟ قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے کہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾

اور ان جیسے نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو انہیں کے نفسوں سے غافل کردیا۔[1]

اور دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ﴾

کتنی بری ہے وہ چیز جس کے مقابلہ میں ان لوگوں نے اپنے نفسوں کو بیچ دیا۔[2]

سورۂ انعام کی ۱۲ ویں اور ۲۰ ویں آیت میں فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾

جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا وہ لوگ تو ایمان نہیں لائیں گے۔

اس طرح کی آیات میں بعض مفسرین نے کوششیں کی ہیں کہ کسی طرح مذکورہ آیات کو

۱۔ سورۂ حشر ۱۹۔

۲۔ سورۂ بقرہ ۹۰۔

انسان سے مربوط افعال، خود فراموشی، خود فروشی اور خسارے میں تبدیل کر دیا جائے تا کہ عرف میں رائج مفہوم کے مطابق ہو جائے، لیکن اگر خود انسان کی حقیقت کو مدنظر رکھا جائے اور ''خود فراموشی'' کے زاویہ سے ان آیات کی طرف نظر کی جائے تو یہ تعبیریں اپنے ظاہر کی طرح معنی و مفہوم پیدا کر لیں گی، بہت سے لوگوں نے دوسرے کو اپنا نفس سمجھتے ہوئے اپنی حقیقت کو فراموش کر دیا یا خود کو غفلت میں ڈال دیا ہے اور اپنی حقیقت سے غفلت، ترقی نہ دینا بلکہ اسے گرانا یعنی یہ اپنا نقصان ہے اور جو بھی اس عمل کو مثال کے طور پر کسی لالچ اور حیوانی خواہشات کے لئے انجام دیتا ہے اس نے خود کو بیچ دیا اور اپنے آپ کو حیوانوں سے مشابہ کر لیا ہے البتہ قرآن کی نظر میں مطلقاً خود فراموشی کی نفی کی گئی ہے لیکن خود فراموشی کی ملامت اس وجہ سے ہے کہ انسان خود کو تھوڑے سے دنیاوی فائدہ کے مقابلہ میں بیچ دیتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ''خود فراموشی'' کے مسئلہ میں قرآن کا نظریہ اور اس کے موجدوں (ہیگل، فیور بیچ اور مارکس) کی نظر میں بنیادی فرق ہے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ان تینوں نظریات میں ''خود فراموشی'' کے اسباب میں سے ایک، دین ہے اور دین کو انسان کی زندگی سے الگ کرنا ہی اس مشکل کے لئے راہ نجات ہے، لیکن قرآن کی روشنی میں مسئلہ بالکل اس قضیہ کے برخلاف ہے۔ انسان جب تک خدا کی طرف حرکت نہ کرے اپنے آپ کو نہیں پا سکتا، نیز خود فراموشی میں مبتلا رہے گا۔ ہم دوبارہ اس موضوع پر گفتگو کریں گے اور ایک دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ پر غور کریں گے۔

بہر حال قرآن کی روشنی میں خود فراموشی ایک روحی، فکری، اسباب و علل اور آثار و حوادث کا حامل ہے۔ بے توجہ انسان جو دوسروں کو اپنی ذات سمجھتا ہے وہ فطری طور پر دوسرے کے وجود کو اپنا وجود سمجھتا ہے اور یہ وجود جیسا بھی ہو ''خود فراموش'' انسان خود ہی اس کے لئے مناسب مفہوم مرتب کر لیتا ہے، اکثر جگہوں پر یہ دوسرا مفہوم ایک ایسا مفہوم ہے جو خود فراموش انسان پر فکر

کے اعتبار سے عارض ہوتا ہے۔[1]

خود فراموشی کے نتائج

غیر کو اصل قرار دینا

خود فراموش اپنے تمام یا بعض افعال میں دوسرے کو اصل قرار دیتا ہے۔[2] اور آزمائشوں احساس درد، مرض کی تشخیص، مشکلات وراہ حل، ضرورتوں اور کمالات میں دوسروں کو اپنی جگہ قرار دیتا ہے۔ اور اپنے امور کو اسی کے اعتبار سے قیاس کرتا ہے اور اس کے لئے قضاوت وانتخاب کرتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، قرآن مجید سود خور انسانوں کے سلسلہ میں کہتا ہے کہ:

﴿الَّذِينَ يَاكُلُونَ الرِّبا لَايقُومُونَ إلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِى يَتَخَبَّطُهُ الشَيطَانُ مِنَ المَسِّ ذٰلِکَ بِأنَّهُم قَالُوا إنَّمَاالبَيعُ مِثلُ الرِّبَا...﴾[3]

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے (کوئی کام انجام نہیں دیتے ہیں)[4]

۱۔ قرآن مجید اور روایات میں جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کے خود اپنے نفس سے رابطہ کے سلسلہ میں متعدد و مختلف مفاہیم بیان ہوئے ہیں مثال کے طور پر خود فراموشی، خود سے غافل ہونا، اپنے بارے میں کم علمی و جہالت، خود فروشی اور خود کو نقصان پہنچانا وغیرہ ان میں سے ہر ایک کی تحقیق و تحلیل اور ایک دوسرے سے ان کا فرق اور خود فراموشی سے ان کے روابط کو بیان کرنے کے لئے مزید وقت و تحقیقات کی ضرورت ہے۔

۲۔ کبھی انسان بالکل خود سے غافل ہو جاتا ہے اور کبھی اپنے بعض پہلوؤں اور افعال کے سلسلہ میں خود فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے اسی بنا پر کبھی اپنے بعض پہلوؤں میں حقیقت کو غیروں کے حوالہ کر دیتا ہے۔

۳۔ سورۂ بقرہ ۲۷۵۔

۴۔ ﴿لا يقُومُونَ إلّا كَمَايَقُومُ ...﴾ جملہ کے مراد میں دو نظریے ہیں: جیسا کہ اس مقالہ میں ذکر ہوا ہے، پہلا نظریہ یہ ہے کہ آیت دنیا میں رباخوار انسان کے رفتار و کردار کو بیان کر رہی ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ آخرت میں رباخواروں کے رفتار و کردار کی نوعیت کو بیان کرنا مقصود ہے، اکثر مفسرین نے دوسرے نظریہ کو انتخاب کیا ہے لیکن رشید رضا نے ''المنار'' میں اور مرحوم علامہ طباطبائی نے ''تفسیر المیزان'' میں پہلے نظریہ کا انتخاب کیا ہے: ملاحظہ ہو، رشید رضا، تفسیر المنار، ج ۳ ص ۹۴ علامہ طباطبائی، المیزان ج ۲ ص ۴۱۲۔۴۱۳۔

مگر اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے لپٹ کے (ضرر پہنچا کر) خبط الحواس بنا دیا ہو (اس کی استقامت کو ختم کر دیا ہو) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ اس بات کے قائل ہو گئے کہ جس طرح خرید و فروش ہے اسی طرح سود بھی ہے۔

آیۂ شریفہ کے مفاد میں تھوڑی سی فکر بھی پڑھنے والے کو اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ آیت میں سود اور سود کھانے والوں کو محور بنانے کی بنیاد پر اس بحث کی فطری انداز کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کہا جائے: سود کھانے والوں کے لئے ایسے حالات پیدا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سود کھانے والے یہ کہتے تھے کہ سود، خرید و فروش کی طرح ہے اور اگر خرید و فروش میں کوئی حرج نہیں ہے تو سود میں بھی کوئی حرج نہیں ہے لیکن جیسا کہ ملاحظہ ہوا ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: سود کھانے والوں نے کہا خرید و فروش ربا کی طرح ہے، اس سخن کی توجیہ و توضیح میں بعض مفسروں نے کہا ہے:

یہ جملہ معکوس سے تشبیہ اور مبالغہ کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی گفتگو کا تقاضا یہ تھا کہ ربا کو خرید و فروش سے تشبیہ دی جاتی، مبالغہ کی وجہ سے قضیہ اس کے برعکس ہو گیا اور خرید و فروش کی ربا سے تشبیہ ہو گئی ہے۔[1] بعض مفسرین معتقد ہیں کہ چونکہ سود خور اپنے اعتدال کو کھو بیٹھا ہے لہٰذا اس کے لئے خرید و فروش اور ربا میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ ربا، خرید و فروش کی طرح ہے اسی طرح ممکن ہے یہ بھی کہے کہ خرید و فروش ربا کی طرح ہے۔ اس نے ان دونوں کے درمیان مساوات برقرار کیا ہے۔[2]

ان دو توجیہوں میں مناقشہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ توضیح و تبیین سے بہتر یہ ہے کہ خود سے بے توجہی اور دوسروں کو اصل قرار دینے کے اعتبار سے مطلب کی وضاحت کی جائے خود سے بے توجہ انسان جو دوسرے کو اصل قرار دیتا ہے دوسروں کے شان و احترام کے

۱۔ آیہ شریفہ کے ذیل میں شیعہ و سنی تفاسیر منجملہ روح المعانی و مجمع البیان کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ ملاحظہ ہو: علامہ طباطبائی، المیزان ج ۲ ص ۴۱۵۔

لئے بھی اصل کا قائل ہے اور کبھی فرعی مسائل اور گوشوں میں اصل دوسروں کو بناتا ہے، سود خور انسان کی نگاہ میں سود خوری اصل ہے اور خرید و فروش بھی ربا کی طرح ہے جب کہ حقیقت میں وہ یہ سوچتا ہے کہ ربا میں نہ صرف کوئی حرج ہے بلکہ سود حاصل کرنے کا صحیح راستہ رباخوری ہے نہ کہ خرید و فروش ہے، خرید و فروش کو بھی فائدہ حاصل کرنے میں ربا سے مشابہ ہونے کی وجہ سے جائز سمجھا جاتا ہے۔ سود خور انسان کو ایسا حیوان سمجھتا ہے جو جتنا زیادہ دنیا سے فائدہ اٹھائے اور بہرہ مند ہو وہ کمال اور ہدف سے زیادہ نزدیک ہے اور سود خوری اس بہرہ مندی کا کامل مصداق ہے لہٰذا خرید و فروش کی بھی اسی طرح توجیہ ہونی چاہیئے۔

نفسیاتی توازن کا درہم برہم ہونا

اگر انسان اپنے آپ سے بے توجہ ہو جائے اور اپنے اختیار کی باگ ڈور دوسرے کے ہاتھ سپرد کردے تو وہ دو دلیلوں سے اپنے توازن کو کھودے گا: پہلی دلیل یہ ہے کہ دوسرے کا طرز عمل چونکہ اس کے وجود کے مطابق نہیں ہے لہٰذا عدم توازن سے دوچار ہو جائے گا اور دوسری دلیل یہ ہے کہ دوسرا مختلف اور متعدد موجودات کا حامل ہے لہٰذا اگر دوسرا موجودات کی کوئی خاص نوع ہو مثال کے طور پر انسانوں میں بہت سے مختلف افراد ہیں، یہ مختلف موجودات یا متعدد افراد کم از کم مختلف و متضاد خواہشات کے حامل ہیں جو اپنے آپ سے بے توجہ انسان کے توازن کو درہم برہم کردیتے ہیں۔ قرآن مجید مشرکین کو اپنے آپ سے بے توجہ مانتے ہوئے کہتا ہے:

﴿أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾

کیا جدا جدا معبود اچھے ہیں یا خدائے یکتا و غلبہ پانے والا۔[1]

مزید یہ بھی فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ یوسف، آیت: ۳۹

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَ رَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ هَل يَستَوِيَانِ مَثَلاً..﴾[1]

خدا نے ایک مثل بیان کی ہے کہ ایک شخص ہے جس میں کئی (مالدار) جھگڑالو شریک ہیں اور ایک غلام ہے جو پورا ایک شخص کا ہے کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟

﴿لا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُم عَن سَبِيلِهِ﴾[2]

اور دوسرے راستوں (راہ توحید کے علاوہ جو کہ مستقیم راہ ہے) پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے تتر بتر کر دیں گے۔

سورۂ بقرہ کی ۲۷۵ویں آیت بھی جیسا کہ ذکر ہو چکی ہے سود خور انسان کے اعمال کو اس مرگی زدہ انسان کی طرح بتاتی ہے جس میں توازن نہیں ہوتا ہے اور اس کے اعمال میں عدم توازن کو فکری استقامت اور نفسیاتی توازن کے نہ ہونے کی وجہ بیان کیا ہے۔[3]

ہدف اور معیار کا نہ ہونا

گذشتہ بیانات کی روشنی میں خود فراموش انسان بے مقصدیت سے دوچار ہوتا ہے، وہ خود معقول اور معین شکل میں کسی مقصد کا انتخاب نہیں کرتا ہے اور اپنی زندگی اور اعمال کے سلسلہ میں متردد ہوتا ہے۔ قرآن منافقین کے بارے میں جو خود فراموش لوگوں کا ایک گروہ ہے اس طرح بیان کرتا ہے:

۱۔ سورۂ زمر، آیت: ۲۹۔

۲۔ سورۂ انعام، آیت: ۱۵۳۔

۳۔ رباخور انسان کے رفتار و کردار کے متعادل نہ ہونے کے بارے میں اور اس کے تفکرات کے سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: علامہ طباطبائی، المیزان ج ۲ ص ۴۱۳ و ۴۱۴۔

﴿مُذَبْذَبِينَ ذَالِکَ لَا إِلَىٰ هٰؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ هٰؤُلَآءِ وَ مَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلاً﴾[1]

ان کے درمیان کچھ مردد ہیں نہ وہ مومنین میں سے ہیں اور نہ ہی وہ کافروں میں سے ہیں جسے خدا گمراہی میں چھوڑ دے اس کی تم ہرگز کوئی سبیل نہیں کر سکتے۔[2]

ایسے لوگ حضرت علیؑ کے فرمان کے مطابق "یَمِیلُونَ مَعَ کُلِ رِیح" کے مصداق ہیں (جس سمت بھی ہوا چلتی ہے حرکت کرتے ہیں) اور دوسرے جزء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ متعدد و پراکندہ ہیں، ان کا کوئی معیار نہیں ہے بیگانوں کی کثرت بے معیاری اور بے مقصدیت انسان کے لئے فراہم کرتی ہے۔

حالات کی تبدیلی کے لئے آمادگی وقدرت کا نہ ہونا

خود فراموش انسان جو خود کو غیر سمجھتا ہے وہ اپنی حقیقت سے غافل ہے یا اپنی موجودہ حالت کو مطلوب سمجھتے ہوئے اپنی حالت میں کسی بھی تبدیلی کے لئے حاضر نہیں ہے اور اس کے مقابلہ میں استقامت کرتا ہے یا اپنی اور مطلوب حالت سے غفلت کی بنا پر تبدیلی کی فکر میں نہیں ہے۔ نتیجتاً اپنی حالت کی تبدیلی پر قدرت نہیں رکھتا ہے، چونکہ یہ سب اس کی دانستہ اختیار وانتخاب کی وجہ سے ہے لہٰذا ملامت کے لائق ہے،، بہت سی آیات جو کافروں اور منافقوں کی ملامت کرتے

---

[1] سورۂ نساء ۱۴۳۔

[2] خداوند عالم کا انسان کو گمراہ کرنا اس کی خواہش کے بغیر جبری طور پر نہیں ہے بلکہ یہ انسان ہے جو اپنے غلط انتخاب کے ذریعہ ایسی راہ انتخاب کرتا ہے جس میں داخل ہونے سے ضلالت وگمراہی سے دچار ہوتا ہے اسی بنا پر دوسری آیات میں مذکور ہے کہ خداوند عالم ظالمین (۲۷ ابراہیم) فاسقین (۲۶ بقرہ) اسراف کرنے والے، بالکل واضح حقائق میں شک کرنے والوں (۳۴ غافر) اور کافروں (۷۴ غافر) کو گمراہ کرتا ہے۔

ہوئے ان کی راہ ہدایت کو مسدود اور ان کی دائمی گمراہی کو حتمی بتاتی ہیں مثال کے طور پر ﴿وَمَن يُضلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهُ مِن هَادٍ﴾[1]

''جس کو خدا گمراہ کر دے اس کے لئے کوئی ہادی نہیں ہے''۔

یہی حقیقت ہے کہ جس کی بنا پر یہ لوگ پیغمبروں کی روشن اور قاطع دلیلوں کے مقابلہ میں اپنے تھوڑے سے علم پر خوش ہیں:

﴿فَلَمَّا جَاءَ تهُم رُسُلُهُم بِالبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِنَ العِلمِ﴾

پھر جب پیغمبر (الہی) ان کے پاس واضح و روشن (ان کی طرف) معجزہ لے کر آئے تو جو (تھوڑا سا) علم ان کے پاس تھا اس پر نازاں ہو گئے۔[2]

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿وَمَن أَظلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِأيَاتِ رَبِّهِ فَأَعرَضَ عَنهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَت يَدَاهُ إِنَّا جَعَلنَا عَلىٰ قُلُوبِهِم أَكِنَّةً أَن يَفقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِم وَقراً وَإِن تَدعُهُم إِلىٰ الهُدَىٰ فَلَن يَهتَدُوا إِذاً أَبَداً﴾[3]

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو خدا کی آیتیں یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے روگردانی کرے اور اپنی پہلی کرتوتوں کو جو اس کے ذریعہ انجام پائے بھول بیٹھے ہم نے خود ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ (قرآن) کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے (تاکہ اس کو نہ سن سکیں) اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ بھی تو یہ ہرگز کبھی سدھرنے والے نہیں ہیں۔

---

[1] سورۂ رعد، آیت:۳۳۔ سورۂ زمر، آیت:۲۳و۳۶۔ سوررۂ غافر، آیت:۳۳

[2] سورۂ غافر، آیت:۸۳

[3] سورۂ کہف، آیت:۵۷

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ گذشتہ اعمال کو فراموش کرنا اوران سے استفادہ نہ کرنا، خود فراموشی کا اہم سبب ہے، اس آیت میں بھی حالات کی اصلاح اور تبدیلی پر قادر نہ ہونا خود فراموشی کی نشانی کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔

مادہ اور مادیات کی حقیقت

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ انسان کے حقیقی وجود کو اس کا روحانی اور معنوی پہلو مرتب کرتا ہے، لیکن اگر انسان خود کو غیر سمجھے گا تو ظاہر ہے کہ اس نے دوسرے فرد کے وجود کو اپنا وجود سمجھا ہے۔قرآن کے اعتبار سے بعض خود فراموش افراد ہمیشہ اپنی حقیقی جگہ، حیوانیت کو بٹھاتے ہیں اور جب حیوانیت انسانیت کی جگہ قرار پا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ جو بھی ہے یہی جسم اور مادی نعمتیں ہیں، تو ایسی صورت میں انسان مادی جسم اور حیوانی خواہشات کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کی دنیا بھی مادی دنیا کے علاوہ کچھ نہیں ہے، ایسے حالات میں خود فراموش انسان کہے گا ﴿وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً﴾[1]

''میں گمان نہیں کرتا تھا کہ قیامت بھی ہے'' اور کہے گا کہ:

﴿مَاهِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنيَا نَمُوتُ وَنَحيَاوَمَا يُهلِكُنَا إِلَّا الدَّهرُ﴾[2]

''ہماری زندگی تو بس دنیا ہی ہے، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو تو بس زمانہ ہی مارتا ہے''۔

اس فکر کے اعتبار سے اس انسان کی ضرورتیں بھی حیوانی ضرورتوں کی طرح ہو جائیں گی جیسے کھانا، پینا، اوڑھنا، پہننا اور دوسری دنیاوی لذتوں سے بہرہ مند ہونا:

---

[1] سورۂ کہف، آیت:۳۶۔

[2] سورۂ جاثیہ، آیت:۲۴

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَعَّوْنَ وَيَأكُلُونَ كَمَا تَأكُلُ الْأنعامُ﴾[1]

اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں جانوروں کی طرح کھاتے ہیں اور دنیاوی لذتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں جیسے کہ ان کا کمال اسی مادی فوائد اور دنیاوی کمالات اور اس کی مسرت بخش لذتوں کا حصول ہے۔ ﴿وَفَرِحُوا بِالحَيَاةِ الدُّنيَا﴾[2] ایسے انسان کے لئے ذرا سی جسمانی بیماری بہت ہی اہم اور بے تابی کا سبب بن جاتی ہے ﴿إذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً﴾[3] ''جب اسے تکلیف چھو بھی گئی تو گھبرا گیا''، لیکن معنوی تنزل کی کثرت جس سے وہ دوچار ہوا ہے اور روحی و جسمانی بیماری کا پہاڑ جس سے وہ جاں بلب ہے درک نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اعمال جو بیماری اور سقوط کا ذریعہ ہیں انہیں اچھا سمجھتا ہے اس لئے کہ اگر حیوان ہے تو یقیناً یہ چیزیں اس کے لئے بہتر ہیں اور ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ خود کو حیوان سمجھتا ہے۔

﴿قُل هَل نُنَبِّئُكُم بِالأخسَرِينَ أعمَالاً الَّذِينَ ضَلَّ سَعيُهُم فِي الحَيَاةِ الدُّنيَا وَهُم يَحسَبُونَ أنَّهُم يُحسِنُونَ صُنعاً﴾[4]

تم کہہ دو کہ کیا ہم ان لوگوں کا پتہ بتادیں جو لوگ اعمال کی حیثیت سے بہت گھاٹے میں ہیں، وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی کی سعی و کوشش سب اکارت ہو گئی اور وہ اس خام خیال میں ہیں کہ وہ یقیناً اچھے اچھے کام کرر ہے ہیں۔

ایسا انسان اگر کسی درد کو حیوان کا درد سمجھے، تو علاج کو بھی حیوانی علاج سمجھتا ہے اور سبھی چیزوں کو مادی زاویہ سے دیکھتا ہے، حتی اگر خدا اس کو سزا دے تو عبرت و بازگشت کے بجائے اس سزا کا بھی مادی تجزیہ و تحلیل کرتا ہے۔

---

[1] سورۂ محمد، آیت: ۱۲
[2] سورۂ رعد، آیت: ۲۶۔
[3] سورۂ معارج، آیت: ۲۰۔
[4] سورۂ کہف، آیت: ۱۰۳ و ۱۰۴۔

﴿وَمَا أَرسَلنَا فِی قَریَةٍ مِن نَبِیٍّ إلّا أَخَذنَا أهلَهَا بِالبَأسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُم یَضَّرَّعُونَ ثُمَّ بَدَّلنَا مَکَانَ السَّیِّئَةِ الحَسَنَةَ حَتّیٰ عَفَوا وَّ قَالُوا قَدمَسَّ آبَاءَ نَاالضَّرَّاءُ السَّرَّاءُ فَأَخَذنَاهُم بَغتَةً وَهُم لا یَشعُرُونَ﴾[1]

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر وہاں کے رہنے والوں کو سختی اور مصیبت میں مبتلا کیا تا کہ وہ لوگ گڑگڑائیں، پھر ہم نے تکلیف کی جگہ آرام کو بدل دیا یہاں تک کہ وہ لوگ بڑھ نکلے اور کہنے لگے کہ اس طرح کی تکلیف وآرام تو ہمارے آباءواجداد کو پہنچ چکی ہے تب ہم نے بڑی بولی بولنے کی سزا میں گرفتار کیا اور وہ بالکل بے خبر تھے۔

عقل ودل سے استفادہ نہ کرنا

جو بھی خود فراموشی کا شکار ہوتا ہے وہ شیطان، حیوان یا کسی دوسرے وجود کو اپنی ذات سمجھتا ہے اور اس کے زیر اثر ہو جاتا ہے اور خود کو اسی دنیا اور اس کی لذتوں میں منحصر کر لیتا ہے، آخر کار اپنے انسانی عقل وقلب کی شناخت کے اسباب پر مہر لگا کر حقیقت کی راہوں کو اپنے لئے بند کر لیتا ہے۔

﴿ذٰلکَ بِأنهُم استَحَبُّوا الحَیَاةَ الدُّنیَاعَلیٰ الآخِرَةِ وَأَنَّ اللّٰهَ لایَهدِی القَومَ الکَافِرِینَ أولٰئِکَ الَّذِینَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلیٰ قُلُوبِهِم وَسَمعِهِم وَ أبصَارِهِم وَأولٰئِکَ هُمُ الغَافِلُونَ﴾[2]

اس لئے کہ ان لوگوں نے دنیا کی چندروزہ زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور وہ اس وجہ سے کہ خدا کافروں کو ہرگز منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور ان کی آنکھوں پر خدا نے علامت مقرر کر دی ہے جب کہ وہ لوگ بے خبر ہیں۔

---

[1] سورۂ اعراف، آیت: ۹۴و۹۵۔
[2] سورۂ نحل، آیت: ۱۰۷و۱۰۸۔

قلب وسماعت اوران کی آنکھوں پر مہر لگنا حیوانی زندگی کے انتخاب اوراسی راہ پر گامزن ہونے سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ سب حیوانی زندگی کے انتخاب کا نتیجہ ہے اسی بنا پر ایسا انسان حیوان سے بہت پست ہے ﴿أولٰئِکَ کَالأنعامِ بَل هُم أضَلُّ أولٰئِکَ هُمُ الغافِلُونَ﴾[1] اس لئے کہ حیوانات نے حیوانیت کا انتخاب نہیں کیا بلکہ حیوان خلق ہوئے ہیں اوران کی حیوانیت کی راہ میں خود فراموشی نہیں ہے لیکن انسان جو انسان بنایا گیا ہے اگر حیوانیت کو انتخاب کرے تو یہ اس کے خود فراموش ہونے کی وجہ ہے۔

خود فراموشی اور توحید حقیقی

ممکن ہے کہ کہا جائے کہ مومن انسان بھی خدا کو اپنے آپ پر حاکم قرار دیتا ہے اس کی خواہش کو اپنی خواہش سمجھتا ہے اور جو بھی وہ کہتا ہے عمل کرتا ہے اور توحید وایمان کا نقطۂ اوج بھی سراپا اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کرنا اور خود کو فراموش کرنا ہے، اس طرح سے تو موحد انسان بھی خود فراموش ہے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا کہ انسان کے لئے ایک الٰہی واقعیت و حقیقت ہے جس سے وہ وجود میں آیا ہے اوراسی کی طرف پلٹایا جائے گا، تو اس کی حقیقت و شخصیت، خود خدا سے مربوط اور اسی کے لئے تسلیم ہونا ہی اپنے آپ کو پالینا ہے، خدا ہی ہماری حقیقت ہے اور ہم خدا کے سامنے تسلیم ہو کے اپنی حقیقت کو پالیں گے۔

ع: ہر کس کہ دور ماند از اصل خویش — باز جوید روز گار وصل خویش

جو بھی اپنی حقیقت سے دور ہو گیا وہ ایک دن اپنی حقیقت کو ضرور پالے گا۔

﴿إنَّا لِلّٰهِ وَإنَّا إلَيهِ رَاجِعُونَ﴾[2]

''ہم خدا کے لئے ہیں اوراسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے''۔

---

[1] سورۂ اعراف، آیت:۱۷۹۔

[2] سورۂ بقرہ، آیت:۱۵۶۔

اگر خود کو درک کر لیا تو خدا کو بھی درک کر لیں گے، اگر اس کے مطیع ہو گئے اور خدا کو درک کر لیا تو خود کو گویا پا لیا ہے۔

''در دو چشم من نشستی کہ از من من تری''۔

اگر تم میری آنکھوں میں سما گئے ہو تو گویا تم میں مجھ سے زیادہ منیت ہے۔ اس اعتبار سے حدیث ''مَن عَرفَ نفسَه فَقَد عرفَ رَبَّه''۔ ''جس نے خود کو پہچانا یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا'' اور آیت ﴿وَلا تَکُونُوا کَالَّذِینَ نَسُوا اللّٰهَ فَانسَاهُم أَنفُسَهُم﴾[1] کے لئے ایک نیا مفہوم اور معنیٰ ظاہر ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ بعض آیات میں خود کو اہمیت دینے کی ملامت سے مراد اپنے نفس کو اہمیت دینا اور آخرت سے غافل ہونا اور خدا کے وعدوں پر شک کرنا ہے جیسے یہ آیت:

﴿وَطَائِفَةٌ قَد اَهَمَّتهُم أَنفُسُهُم یَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَیرَ الحَقِّ ظَنَّ الجَاهِلِیَّةِ﴾

اور ایک گروہ جن کو (دنیاوی زندگی) اور اپنی جان کی فکر تھی خدا کے ساتھ زمانہ جاہلیت جیسی بدگمانیاں کرنے لگے۔[2]

اجتماعی اور سماجی بے توجہی (اجتماعی حقیقت کا فقدان)

خود فراموشی کبھی فردی ہے اور کبھی اجتماعی ہوتی ہے، جو کچھ بیان ہو چکا ہے فردی خود فراموشی سے مربوط تھا۔ لیکن کبھی کوئی معاشرہ یا سماج خود فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے اور دوسرے معاشرہ کو اپنا سمجھتا ہے، یہاں بھی دوسرے معاشرہ کی حقیقت کو اپنی حقیقت سمجھتا ہے اور دوسرے معاشرہ کو اصل قرار دیتا ہے۔

---

[1] سورۂ حشر، آیت: ۱۹۔

[2] سورۂ آل عمران، آیت: ۱۵۴۔

تقی زادہ جیسے افراد کہتے ہیں:

ہمارے ایرانی معاشرہ کی راہ ترقی یہ ہے کہ سراپا انگریز ہو جائیں، ایسے ہی افراد ہمارے معاشرہ کو خود فراموش بنا دیتے ہیں، اور اسی طرح کے لوگ مغربی معاشرہ کو اپنے لئے اصل قرار دیتے ہیں اور مغرب کی مشکلات کو اپنے سماج و معاشرہ کی مشکل اور مغرب کی راہ حل کو اپنے معاشرہ کے لئے راہ حل سمجھتے ہیں لیکن جب مغربی لوگ آپ کی مشکل کا حل پیش نہ کر سکے تو یہ کہہ دیا کہ یہ اہمیت نہیں رکھتا ہے کیوں کہ مغرب میں بھی ایسا ہی ہے بلکہ ایسا ہونا بھی چاہیئے اور ایک ترقی یافتہ معاشرے کا یہی تقاضا ہے اور ایسے مسائل تو ترقی کی علامت شمار ہوتے ہیں۔

جب اجتماعی و سماجی مسائل و مشکلات کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہے تو وہ چیزیں جو مغرب میں اجتماعی مشکل کے عنوان سے بیان ہوئی ہیں انہیں اپنے معاشرہ کی مشکل سمجھتے ہیں اور جب کسی مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں تو مغرب کے راہ حل کو تلاش کرتے ہیں اور اس کو کاملاً قبول کرتے ہوئے اس کی نمائش کرتے ہیں حتی اگر یہ کہا جائے کہ شاید ہمارا معاشرہ مغربی معاشرہ سے جدا ہے تو کہتے ہیں پرانی تاریخ نہ دہراؤ، وہ لوگ تجربہ اور خطا کے مرحلہ کو انجام دے چکے ہیں، ایسے افراد اعتبارات، خود اعتمادی، دینی تعلیمات حتی کہ قومی اقدار کو معاشرہ کی شناخت میں اور اجتماعی مسائل اور اس کے بحران سے نکلنے کی راہ میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

جو معاشرے دوسرے معاشرہ کو اپنی جگہ قرار دیتے ہیں وہ دوسرے کے آداب و رسوم میں گم ہو جاتے ہیں، انتخاب و اقتباس نہیں کرتے، کاپی کرتے ہیں، سرگرم نہیں ہوتے بلکہ صرف اثر قبول کرتے ہیں۔ اقتباس وہاں ہوتا ہے جہاں اپنائیت ہو، اپنے رسم و رواج کو پیش کرکے موازنہ کیا گیا ہو اور اس میں بہترین کا انتخاب کیا گیا ہو، لیکن اگر کوئی معاشرہ خود فراموش ہو جائے تو اپنے ہی آداب و رسوم کو نقصان پہونچاتا ہے، تمام چیزوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور خود کو بھول جاتا ہے۔

استکباری معاشروں کا ایک کام یہی ہے کہ ایک معاشرہ کو خود فراموشی کا شکار بنا دیں جب کوئی معاشرہ خود فراموشی کا شکار ہو جائے تو اس کے آداب و رسوم پر یلغار کی ضرورت نہیں ہے۔ ثقافتی مفاہمت کی صورت میں بھی دوسروں کے آداب و رسوم اپنائے جاتے ہیں۔ وہ چیزیں جو آداب و رسوم پر حملہ کا سبب واقع ہوتی ہیں وہ معاشرہ کے افراد ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہیں۔ چہ جائیکہ شرائط ایسے ہوں کہ دشمن فتح و غلبہ کے لئے یعنی آداب و رسوم کو منتقل کرنے کے لئے نہ صرف عناصر بلکہ اپنے پست عناصر کے لئے منظم پروگرام اور پلان رکھتے ہوں تو ایسی صورت میں اس معاشرہ کی تباہی و نابودی کے دن قریب آ چکے ہیں اور آداب و رسوم و اقتدار میں سے کچھ بھی نہیں بچا ہے جب کہ اس کے افراد موجود ہیں اور وہ معاشرہ اپنی ساری شخصیت کھو چکا ہے اور مسخ ہو گیا ہے۔[۱]

ابنای روزگار بہ اخلاق زندہ اند قومی کہ گشت فاقد اخلاق مردنی است

دنیا کے لوگ اپنے اخلاق کی وجہ سے زندہ ہیں، جو قوم اخلاق سے عاری ہو وہ نابود ہونے والی ہے۔

اپنے نئے انداز کے ساتھ علم پرستی[۲] انسان پرستی[۳] مادہ پرستی[۴] نیز ترقی اور پیش رفت کو صرف صنعت اور ٹکنالوجی میں منحصر کرنا آج کی دنیا اور معاشرہ میں خود فراموشی کی ایک جدید شکل ہے۔[۵]

۱۔ اقبال لاہوری: امام خمینی اور مقام معظم رہبری کی دینی اور سماجی دانشوری کی حیثیت سے استقلال و پائداری کی تقویت کے حوالے سے بہت زیادہ تاکید نیز اپنی تہذیب و ثقافت کو باقی رکھنا بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

۲۔ Scientism۔ ۳۔ Humanism۔ ۴۔ Materialism

۵۔ اگرچہ معاشرتی تہذیب سے بیگانگی، انسانی اقدار کے منافی ہے لیکن توجہ رکھنا چاہیئے کہ قومی اور معاشرتی تہذیب خود بہ خود قابل اعتبار نہیں ہوتی بلکہ اسی وقت قابل اعتبار ہے جب اس کے اعتبارات اور راہ و روش انسان کی حقیقی سعادت اور عقلی و منطقی حمایت سے استوار ہوں۔

خودفراموشی کا علاج

خودفراموشی کے گرداب میں گرنے سے بچنے اوراس سے نجات کے لئے تنبیہ اور غفلت سے خارج ہونے کے بعد تقوی کے ساتھ ماضی کے بارے میں تنقیدی جستجو سود مند ہے، اگر فرد یا کوئی معاشرہ اپنے انجام دیئے گئے اعمال میں دوبارہ غور وفکر نہ کرے اور فردی محاسبہ نفس نہ رکھتا ہو اور معاشرہ کے اعتبار سے اپنے اور غیر کے آداب ورسوم میں کافی معلومات نہ رکھتا ہو نیز اپنے آداب ورسوم میں غیروں کے آداب ورسوم کے نفوذ کر جانے کے خطرے سے آگاہ اور فکر مند نہ ہو تو حقیقت سے دور ہونے کا امکان بہت زیادہ ہے اور یہ دوری اتنی زیادہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان خود کو نیز اپنی تہذیب کو فراموش کردے اور خودفراموشی کا شکار ہو جائے ایسے حالات میں اس کے لئے خودفراموشی سے کوئی راہ نجات ممکن نہیں ہے، قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

﴿یاأیُّھاالَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلتَنظُر نفسٌ مَا قَدَّمَت لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰہَ إنَّ اللّٰہَ خَبِیرٌ بِمَا تعمَلُونَ وَلا تکُونُوا کَالَّذِینَ نَسُوا اللّٰہَ فَأنسَاھُم أنفُسَھُم أولٰئِکَ ھُمُ الفَاسِقُونَ﴾[1]

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو، اور ہر شخص کو غور کرنا چاہیئے کہ کل کے واسطے اس نے پہلے سے کیا بھیجا ہے اور خدا سے ڈرتے رہو بیشک جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے، اوران لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے یہی لوگ تو بدکردار ہیں۔

خودفراموشی کی مشکل سے انسان کی نجات کے لئے اجتماعی علوم کے مفکرین نے کہا ہے کہ: جب انسان متوجہ ہو جائے کہ خودفراموشی کا شکار ہو گیا ہے تو اپنے ماضی میں دوبارہ غور وفکر اور اس کی اصلاح کرے کیونکہ وہ اپنے ماضی پر نظر ثانی کئے بغیر اپنی مشکل کے حل کرنے کے سلسلہ میں

---

[1] سورۂ حشر، آیت: ۱۸ و ۱۹۔

کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا ہے، اور آیت میں یہ سلسلہ بہت ہی دقیق اور منظم بیان ہوا ہے جس میں تقویٰ کو نقطۂ آغاز مانا ہے ﴿یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ﴾ اگر زندگی کا محور تقوائے الٰہی ہو تو خدا کے علاوہ انسان پر کوئی دوسرا حاکم نہیں ہوگا اور انسان خود فراموشی کے حوالے سے ضروری تحفظ سے بہرہ ور ہے۔

دوسرا مرحلہ: ان اعمال میں دوبارہ غور وفکر ہے جسے اپنی سعادت کے لئے انجام دیا ہے۔ انسان اس وقت جب وہ کوئی کام خدا کے لئے انجام دیتا ہے ہوسکتا ہے کہ کوئی پوشیدہ طور پر اس پر حاکم ہو جائے لہٰذا ان اعمال میں بھی جس کو خیر سمجھتا ہے دوبارہ غور وفکر کرے اور کبھی اس غور وفکر میں بھی انسان غفلت اور خود فریبی سے دوچار ہو جاتا ہے، اسی بنا پر قرآن دوبارہ فرماتا ہے کہ:

﴿واتَّقُوا اللّٰہَ﴾ ''اللہ سے ڈرو''۔ قرآن مجید کے مایۂ ناز مفسرین اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں کہ

آیت میں دوسرے تقویٰ سے مراد، اعمال میں دوبارہ غور وفکر ہے، اگر انسان اس مرحلہ میں بھی صاحب تقویٰ نہ ہو تو خود فریبی سے دوچار اور خود فراموشی کی طرف گامزن ہو جائے گا قرآن مجید فرماتا ہے کہ اے مومنو! ایسا عمل انجام نہ دو جس کی وجہ سے خود فراموشی سے دوچار ہو کر خدا کو بھول جاؤ، اس لئے صرف اعمال میں دوبارہ غور وفکر کافی نہیں ہے، قرآن کی روشنی میں گذشتہ اعمال کا محاسبہ تقوائے الٰہی کے ہمراہ ہونا چاہیۓ تاکہ مطلوب نتیجہ حاصل ہو سکے۔

آخری اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شاید ماضی میں افراد یا معاشرے خود اپنے لئے پروگرام بنایا کرتے تھے اور اپنے آپ کو خود فراموشی کی دشواریوں سے نجات دیتے تھے یا اپنے آپ کو فراموش کردیتے تھے، لیکن آج جب انسانوں کا آزادانہ انتخاب اپنی جگہ محفوظ ہے تو معمولاً دوسرے لوگ انسانی معاشرے کے لئے پروگرام بناتے ہیں، اور یہ وہی (اسلامی) تہذیب پر حملہ

ہے جو ہمارے دور کا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے، یہ تصور نہ ہو کہ جب ہم اپنے آپ سے غافل و بے خبر ہیں تو ہمارے خلاف سازشیں نہیں ہو رہی ہیں ہمیشہ اس عالمی ممالک کے اجتماعی گروہ، سیاسی پارٹیاں استعماری عوامل اور طاقت پسند قدرتیں اپنے مادی مقاصد کی وجہ سے اپنے مقاصد کے حصول اور اس میں مختلف معاشروں اور افراد سے غلط فائدہ اٹھانے کے لئے سازشیں رچتے ہیں۔ یہ سمجھنا بھولے پن کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ انسان کی آرزوؤں، حقوق انسانی اور انسان دوستانہ مقاصد کے لئے دوسرے انسانوں اور معاشروں سے جنگ یا صلح کرتے ہیں، ایسے ماحول میں ان سازشوں اور غیروں کے پروگرام اور پلان سے غفلت، خطرہ کا باعث ہے اور اگر ہم اس ہلاکت سے نجات پانا چاہتے ہیں تو ہمیں امیر المومنین علیؑ کے طریقہ عمل کو مشعل راہ بنانا چاہیئے آپ فرماتے ہیں:

فَما خُلقتُ لیشغلنِی أکل الطیّبات کَالبَهیمةِ المربُوطة همّها علفهَا... وَتلهو عمّا یراد بِها۔[1]

''میں اس لئے خلق نہیں ہوا ہوں کہ مادی نعمتوں کی بہرہ مندی مجھ کو مشغول رکھے اس گھریلو جانور کی طرح، جس کا اہم سرمایہ اس کی گھاس ہے... اور جو کچھ اس کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس سے غافل ہے''۔

اسی بنا پر کبھی انسان خود بے توجہ ہوتا ہے اور کبھی یہ غفلت دوسروں کے پروگرام اور ان کی حکمت عملی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کبھی خود کسی دوسرے کو اپنی جگہ قرار دیتا ہے اور خود سے بے توجہ اور غافل ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے افراد اس کی سرنوشت طے کرتے ہیں، اور اس سے غلط فائدہ اٹھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور اپنے مقاصد کی مناسبت سے خودی کا رول ادا کرتے ہیں۔ اجتماعی امور میں بھی جو معاشرہ خود سے غافل ہو جاتا ہے، استعمار اس کے آداب و رسوم کی اہمیت کو بیان کرتا ہے اور اس کے لئے نمونہ عمل مہیا کرتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جتنی مقدار میں فردی

---

[1] نہج البلاغہ، کلام ۴۵۔

خود فراموشی ضرر پہنچاتی ہے اتنی ہی مقدار میں انسان کا اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات سے بے توجہ ہونا بھی نقصان دہ ہے ان دو بڑے نقصان سے نجات پانے کے لئے اپنی فردی اور اجتماعی اہمیت و حقیقت کا پہچاننا اور اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ ءَ آمَنُوا عَلَیکُم أَنفُسَکُم لا یَضُرُّکُم مَن ضَلَّ إذا اهتَدَیتُم﴾

اے ایمان والو! تم اپنی خبر لو جب تم راہ راست پر ہو تو کوئی گمراہ ہوا کرے تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔[1]

[1] سورۂ مائدہ، ۱۰۵۔

خلاصۂ فصل

۱۔انسان کی خودفراموشی انسان شناسی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے جوانسانی علوم کے مختلف موضوعات میں قابل توجہ رہی ہے۔

۲۔انسانی اور اجتماعی علوم کے مباحث میں علمی اور فنی طریقہ سے خودفراموشی کی توضیح و تحلیل کو ۱۸ویں اور ۱۹ صدی عیسوی کے بعض مفکرین مخصوصاً ہگل، فیورنیچ اور مارکس کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

۳۔دین اور خود سے بے توجہی کے رابطہ میں ان تین مفکروں کا وجہ اشتراک یہ ہے کہ دین، بشر کی بے توجہی کی وجہ سے وجود میں آیا ہے، یہ گفتگو خودفراموشی کے مسئلہ میں ادیان آسمانی مخصوصاً اسلام اورقرآن کی فکر کا نقطۂ مقابل ہے۔

۴۔قرآن کی روشنی میں انسان کی حقیقت کواس کی دائمی روح ترتیب دیتی ہے جو خدا سے وجود میں آئی ہے اوراسی کی طرف پلٹ کر جائے گی۔انسان کی حقیقی زندگی عالم آخرت میں ہے جیسے اس دنیا میں اپنے ایمان اور سچی کوشش سے تعمیر کرتا ہے۔لہٰذا انسان کا خدا شناسی سے غفلت درحقیقت حقائق سے غفلت ہے اور وہ انسان جو خدا کو فراموش کردے گویا اس نے اپنے وجود کوفراموش کیاہے اوراپنے آپ سے بے توجہ ہے۔

۵۔قرآن کی نظر میں دوسرے کواپنا نفس تسلیم کرتے ہوئے اسے اصل قرار دینا نفسیاتی توازن کا درہم برہم ہونا، بے مقصدیت، بے معیاری، بیہودہ حالت کی تغییر قدرت پسندی اور آمادگی کا نہ ہونا، مادہ اور مادیات کواصل قرار دینااور عقل ودل سے استفادہ نہ کرناوغیرہ خودفراموشی کے اسباب ہیں۔

۶۔خودفراموش معاشرہ، وہ معاشرہ ہے جواپنی اجتماعی حقیقت کوفراموش کردے اور زندگی کے مختلف گوشوں میں اپنے سے پست معاشرہ کویا اپنے غیرکواپنے لئے نمونہ عمل بناتا ہے۔

۷۔خود فراموشی کے بحران سے بچنے کی راہ، اپنی حقیقت کو سمجھنا اور خود کو درک کرنا ہے،
اور خود فراموشی کا علاج، ماضی کی تحلیل و تحقیق اور خود کو درک کرنے سے وابستہ ہے۔

تمرین

۱۔وہ مختلف مفاہیم جو ہمارے دینی آداب ورسوم میں فردی اور اجتماعی خودفراموشی پر نظارت رکھتے ہیں،کون کون سے ہیں اوران کے درمیان کیا نسبت ہے؟

۲۔بکواس، خرافات،شکست خوردگی، دوسروں کے رنگ میں ڈھل جانا،سیاسی بے توجہی، بدنظمی غرب پرستی،علمی نشر،ٹکنالوجی، اندھی تقلید وغیرہ کا فردی اوراجتماعی خودفراموشی سے کیا نسبت ہے؟

۳۔فردی اوراجتماعی خودفراموشی سے بچنے کے لئے دین اوراس کی تعلیمات کا کیا کردار ہے؟۔

۴۔ چند ایسے دینی تعلیمات کا نام بتائیں جو خودفراموشی کے گرداب میں گرنے سے روکتی ہیں؟

۵۔اعتبارات کے سلسلہ میں تعصب،عقیدتی اصول سے نئے انداز میں دفاع، خدا پر بھروسہ اور غیر خدا سے نہ ڈرنے وغیرہ کا خودفراموشی کے مسئلہ میں کیا کردار ہے اورکس طرح یہ کردارانجام پانا چاہیئے؟

۶۔خودفراموشی کے مسئلہ میں خواص (برگزیدہ حضرات) جوانوں، یونیورسٹیوں اور مدارس کا کیا رول ہے؟

۷۔ہمارے معاشرے میں اجتماعی وفردی خودفراموشی کو دور کرنے اور دفاع کے لئے آپ کا موردنظر طریقۂ عمل کیا ہے؟

۸۔اگر یہ کہا جائے کہ: مومن انسان بھی خدا کو اپنے آپ پر حاکم قرار دیتا ہے لہٰذا خود فراموش ہے،اس نظریہ کے لئے آپ کی وضاحت کیا ہوگی؟

مزید مطالعہ کے لئے

آرن ریمن (۱۳۷۰) مراحل اساسی اندیشہ در جامعہ شناسی، ترجمہ باقر پرہام تہران: انتشارات آموزش انقلاب اسلامی۔

ابراہیمی، پریچہر (پاییز ۱۳۶۹) نگاہی بہ مفہوم از خود بیگانگی، رشد آموزش علوم اجتماعی، سال دوم۔

اقبال لاہوری، محمد (۱۳۷۵) نوای شاعر فردا یا اسرار خودی و رموز بی خودی تہران: موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی۔

پاپنہام، فریتز (۱۳۷۲) عصر جدید: بیگانگی انسان، ترجمہ مجید صدری، تہران: فرہنگ، کتاب پانزدہم، موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی۔

جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی قرآن، ج ۵، تہران: رجاء۔

دریابندی، نجف (۱۳۶۹) درد بی خویشتنی، تہران، نشر پرواز۔

روزنٹال و... (۱۳۷۸) الموسوعة الفلسفية، ترجمہ سمیر کرم، بیروت: دار الطبیعه.

زیادہ معن (۱۹۸۶) الموسوعة الفلسفية العربية، بیروت: معهد الانماء العربی.

سوادگر، محمد رضا (۱۳۵۷) انسان واز خود بیگانگی (بی نا) (بی جا)۔

ہ فرج عبدالقادر (۱۹۹۳) موسوعة علم النفس و التحليل النفسی کویت: دار سعادة الصباح.

قائم مقامی، عباس، خرداد و تیر ۱۳۷۰) از خود آگاہی تا خدا آگاہی، کیہان اندیشہ۔

کوزر، لوئیس (۱۳۶۸) زندگی و اندیشہ بزرگان جامعہ شناسی، ترجمہ محسن ثلاثی تہران: انتشارات علمی۔

مان،(۱۴۱۴)موسوعة العلوم الاجتماعیه، ترجمہ عادل مختار الهواری و... مكتبة الفلاج، الامارات العربية المتحدة.
محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) خودشناسی برای خودسازی، قم: اموزشی وپژہشی امام خمینیؒ۔
مطہری، مرتضی (۱۳۵۴) سیری در نہج البلاغہ، قم، دارالتبلیغ اسلامی۔
نقوی، علی محمد (۱۶۱ ۳) جامعہ شناسی غرب گرایی، تہران، امیرکبیر۔

ملحقات

خودفراموشی کے موجدین کے نظریات۔

خودفراموشی کے مسئلہ کو ایجاد کرنے والوں کے نظریات سے آشنائی کے لئے ہم ہیگل فیورباخ اور مارکس کے نظریات کو مختصراً بیان کریں گے۔

فرڈریچ ویلیم ہیگل [1] (۱۸۳۱۔۱۷۷۰)

ہیگل معتقد ہے کہ یونانی شہر میں شہری (فرد) اور حکومت (معاشرہ) کا جو رابطہ ہے وہ افراد کی حقیقی شخصیت ہے، یہ وہ برابری اور مساوات کا رابطہ ہے جو خودفراموشی کے مسئلہ سے عاری ہے۔ لیکن یونانی شہر و معاشرہ کے زوال کے ساتھ ہی اپنے اور دوسرے شہری رابطہ کا عقل سے رابطہ ختم ہو گیا ہے، اس مساوات اور برابری کو دوبارہ پورا کرنے کے لئے فردی و ذاتی آزادی سے چشم پوشی کرنے کے علاوہ کوئی راہ نہیں ہے اور یہ وہی خودفراموشی ہے۔ ہیگل خودفراموشی کی حقیقت کو اس نکتہ میں پوشیدہ مانتا ہے کہ انسان احساس کرتا ہے کہ اس کی شخصی زندگی اس کی ذات سے خارج بھی ہے یعنی معاشرہ اور حکومت میں ہے۔ وہ خودفراموشی کے خاتمہ کو زمانۂ روشن فکری میں دیکھتا ہے کہ جس میں خودفراموشی کو تقویت دینے والے حقائق کی کمی ہو جاتی ہے، خارجی محرک ایک حقیقی چیز ہے جو سو فیصدی مادی محسوس اور ملموس ہے۔ دینی مراکز اور حکومت خوف واضطراب پیدا کرنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ مادی دنیا کا بعض حصہ ہیں جن میں تحلیل اور علمی تحقیق ہوتی ہے۔ اس طرح وجود مطلق (خدا) صرف ایک بے فائدہ مفہوم ہوگا اس لئے کہ مادی امور میں علمی تحقیق کے باوجود کوئی وصف اس (خدا) کے لئے نہیں ہے اور وہ نہ ہی کشف کیا جا سکتا ہے اور خدائے آفرینش خدائے پدر، اور خدائے فعال کا مرحلہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے اور ایسی عظیم موجود

---

[1] Georg Wilhilm Friedrich.

میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کو کسی وصف سے متصف ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح انسان کی ذات ایک اہم حقیقت اور امور کا مرکز ہو جائے گی۔ ہیگل معتقد تھا کہ بادشاہی اور کلیسا (حکومت و دین) کو اپنے صحیح مقام پر لانے کے لئے اصلاحی افکار نے انسان کو حاکم بنایا کہ جس نے صحیح راستہ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن انسان کی حقیقت سے برتر نفس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی اور خطا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ لیکن اس بات کا یقین ہے کہ خود فراموشی اس وقت پوری طرح سے ختم ہو گی جب قدیم آداب واخلاق نابود ہو جائیں گے۔ ایسی انسانی شخصیت کو ہم نہ مانیں جو عیسائیت میں بیان ہوئی ہیں بلکہ ایسا سرمایہ داری والا معاشرہ ایجاد کریں جو انسانی حقوق کا علمبردار ہو۔[1]

فیور بیچ[2] (۱۸۳۲-۱۷۷۵)

فیور بیچ معتقد تھا کہ انسان، حق، محبت اور خیر چاہتا ہے چونکہ وہ اس کو حاصل نہیں کرسکتا لہٰذا اس کی نسبت ایک بلند و برتر ذات کی طرف دیتا ہے کہ جس کو انسان خدا کہتا ہے اور اس میں ان صفات کو مجسم کرتا ہے اور اس طرح خود فراموشی سے دوچار ہو جاتا ہے، اسی بنا پر دین انسان کی اجتماعی اور معنوی و مادی ترقی کی راہ میں حائل سمجھا جاتا ہے، وہ معتقد ہے کہ انسان اپنی ترقی کی راہ میں دین اور خود فراموشی کی تعبیر سے بچنے کے لئے تین مرحلوں کو طے کرتا ہے یا طے کرنا چاہیئے۔

---

[1] میدان اقتصاد میں بھی ہگل نے خود فراموشی کو مد نظر رکھا وہ معتقد تھا کہ عمل کی تقسیم اور اس کا اختلاف، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اس چیز کا وہ محتاج ہوتا ہے جس کو وہ ایجاد کرتا ہے اور اپنے غیر پر اعتماد کا سبب (غیروں کی صنعت وتکنیک) اور اس پر مسلط اور انسان سے بہتر ایسی قوت کے ایجاد کا سبب ہے جو اس کے حیز امکان سے خارج ہے اور اس طرح غیر اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ مارکس نے اس تحلیل کو ہگل سے لیا ہے اور اس میں کسی چیز کا اضافہ کئے بغیر اپنی طولانی گفتگو سے واضح کیا ہے اور اس تحلیل سے فقط بعض اقتصادی نتائج کو اخذ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: زیاد معن: ''الموسوعة الفلسفية العربية''

[2] Anselm Von Feuer Bach

پہلے مرحلہ میں: خدااور انسان دین کے حوالے سے باہم ملے ہوئے ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں: انسان خدا سے جدا ہونا چاہتا ہے تا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے

اور تیسرے مرحلہ میں: کہ جس کے حصول کے لئے فیور بیچ سبھی کو دعوت دیتا ہے وہ انسانی علم کا مرحلہ ہے جس میں انسان اپنی حقیقت کو پالیتا ہے اور اپنی ذات کا مالک ہو جاتا ہے ایک اعتبار سے انسان، انسان کا خدا ہوتا ہے اور خدا و انسان کے رابطہ کے بجائے ایک اعتبار سے انسان کا انسان سے رابطہ بیان ہوتا ہے۔[1]

کارل مارکس[2] (۱۸۱۸۔۱۸۸۳)

کارل مارکس جو کسی بھی سرگرمی کے لئے بلند و بالا مقام کا قائل ہے، کہتا ہے کہ انسان خدائی طریقہ سے یا عقل کے ذریعہ اپنی حقیقت کو نہیں پاتا ہے بلکہ نایاب فعل کے ذریعہ دنیا سے اتحاد برقرار رکھتے ہوئے، کردار ساز سرگرم نیز ہماہنگی و حقیقی اجتماعی روابط سے اپنی ذات کو درک کرتا ہے، لیکن سرمایہ داری کے نظام میں مزدوروں کا کام ہر طرح کے انسانی احترام سے خالی ہے۔ مزدور اپنے عمل کو بیچ کر فائدہ حاصل کرنے والے اسباب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہ تو وہ اپنے فعل میں خود کو پاتا ہے اور نہ ہی دوسرے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اس فعل کا موجد ہے۔ اس طرح اس ے کام سے اس کی زندگی کے کام اور اس کی انسانی حقیقت جدا ہے غرض یہ کہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔

---

[1]۔ فیور بیچ نے انسان کا ہدف معرفت، محبت اور ارادہ بیان کیا ہے اور بعض تحریف شدہ تعلیمات دین سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحلیل میں کہتا ہے کہ کس طرح دین، انسان کے ارادہ، محبت اور عقل کو صحیح راہ سے منحرف اور فاسد کر دیتا ہے اور اس کو انسان کے مادی مفادات کی فراہمی میں بے اثر بنا دیتا ہے، مارکس کے نظریہ میں دینی تعلیمات کے حوالے سے تحریف شدہ مطالب سے استفادہ کا ایک اہم کردار ہے۔

[2]۔ Karl Marx.

''فیور بیچ'' کی طرح مارکس کا یہ نظریہ ہے کہ انسان کی ساری ترقی و پیشرفت کی راہ میں دین بھی حائل ہے نیز انسان کی ناکامی کے علاوہ اس کی بے توجہی کا سبب بھی ہے دین وہ نشہ ہے جو لوگوں کو عالم آخرت کے وعدوں سے منقلب اور ظالم حکومتوں کی نافرمانی سے روکتا ہے اور انسان کی حقیقی ذات کے بجائے ایک خیالی انسان کو پیش کرتا ہے اور اس طرح خود فراموش بنا دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ انسان پر منحصر ہے کہ دین کو نابود کر کے خود فراموشی سے نجات اور حقیقی سعادت کے متحقق ہونے کے بنیادی شرط کو فراہم کرے۔[1]

مذکورہ نظریوں کی تحقیق و تحلیل کے لئے جداگانہ فرصت و محل کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نظریہ اپنے اصولوں کے لحاظ سے اور مذکورہ مسائل کی جو تحلیل پیش کی گئی ہے اس کے اعتبار سے اور ان نظریات میں پوشیدہ انسان شناسی کا تفکر بھی اپنے اسباب و نتائج کے اعتبار سے سخت قابل تنقید ہے لیکن اس تھوڑی سی فرصت میں ان گوشوں کی تحقیق ممکن نہیں ہے البتہ یہاں صرف ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ تینوں نظریے اور اس سے مشابہ نظریہ ایک طرف تو انسان کو صرف اس مادی دنیا کی زندگی میں محدود کرتے ہیں اور دوسری طرف خدا کو دانستہ یا نادانستہ بشر کے ذہن کی پیداوار سمجھتے ہیں جب کہ یہ دونوں مسئلے کسی بھی استدلال و برہان سے خالی ہیں اور ان دونوں بنیادی مسائل کے ختم ہونے کے بعد ان پر مبنی تحلیلیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

---

[1] ۔ ملاحظہ ہو:

۔ بدوی، عبد الرحمٰن، موسوعۃ الفلسفۃ۔

۔ آرن، ریمن، مراحل اساسی اندیشہ در جامعہ شناسی، ترجمہ باقر پرہام، ج ا ص ۱۵۱، ۲۳۲۔

۔ زیادہ معن، موسوعۃ الفلسفۃ العربیۃ۔

۔ ان، مائکل، موسوعۃ العلوم الاجتماعیۃ۔

۔ کوزر، لوئیس، زندگی و اندیشہ بزرگان جامعہ شناسی، ترجمہ محسن ثلاثی، ص ۷۵، ۱۳۱۔

انسان کی خلقت

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات:

۱۔قرآن مجید کی تین آیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے خلقت انسان کی وضاحت کریں؟

۲۔انسان کے دو پہلو ہونے پر دلیلیں ذکر کریں؟

۳۔روح وجسم کے درمیان اقسام رابطہ کے اسماء ذکر کرتے ہوئے ہر ایک کے لئے ایک مثال پیش کریں؟

۴۔وہ آیات جو روح کے وجود واستقلال پر دلالت کرتی ہیں بیان کریں؟

۵۔انسان کی واقعی حقیقت کو (جس سے انسانیت وابستہ ہے) واضح کریں؟

ہم میں سے کوئی بھی یہ شک نہیں کرتا ہے کہ وہ ایک زمانہ میں نہ تھااور اس کے بعد وجود میں آیا جس طرح انسانوں کی خلقت کا سلسلہ زادوولد کے ذریعہ ہم پر آشکار ہے اور دوسری طرف تھوڑے سے تامل و تفکر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جسم و جسمانیت کے ماسواء کچھ حالات اور کیفیات مثلاً غور وفکر کرنا، حفظ کرنا، یاد کرنا وغیرہ جو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہیں پوری طرح جسمانی اعضاء سے متفاوت ہیں، یہ عمومی و مشترک معلومات انسان کے لئے متعدد و متنوع سوالات فراہم کرتی ہیں جس میں سے بعض سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موجودہ انسانوں کی نسل کا نکتۂ آخر کہاں ہے اور سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا ہے؟

۲۔ ہم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے مراحل کس طرح تھے؟

۳۔ ہمارے مادی حصہ کے علاوہ جو کہ سبھی دیکھ رہے ہیں کیا کوئی دوسرا حصہ بنام روح بھی موجود ہے؟

۴۔ اگر انسانوں میں کئی جہتیں ہیں تو انسان کی واقعی حقیقت کو ان میں سے کون سی جہت ترتیب دیتی ہے؟

اس فصل کے مطالب اور تحلیلیں مذکورہ سوالات کے جوابات کی ذمہ دار ہیں:

انسان، دو پہلوؤں پر مشتمل مخلوق

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جاندار انسان بے جان موجود سے مختلف ہوتا ہے اس طرح کہ زندہ موجود میں کوئی نہ کوئی چیز بے جان موجود سے زیادہ ہے۔ آدمی جب مر جاتا ہے تو موت کے بعد کا وہ لحہ موت سے پہلے والے لحہ سے مختلف ہوتا ہے، اس مطلب کو روح کے انکار کرنے والے بھی قبول کرتے ہیں، لیکن اس کی بھی مادی لحاظ سے توجیہ کرتے ہیں۔ ہم آئندہ بحث میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کریں گے کہ روح اور روحی چیزیں مادی توجیہ قبول نہیں کرتیں ہیں۔ بہر حال روح کا انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ زمانہ سے ادیان الٰہی کی تعلیمات اور دانشوروں کے آثار میں انسان کا دو پہلو ہونا اور اس کا روح و بدن سے مرکب ہونا نیز روح نامی عنصر کا اعتقاد جو کہ بدن سے جدا اور ایک مستقل حیثیت کا حامل ہے بیان کئے گئے ہیں۔ اس عنصر کے اثبات میں بہت سی عقلی ونقلی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، قرآن مجید بھی وجود انسانی کے دو پہلو ہونے کی تائید کرتا ہے اور جسمانی جہت کے علاوہ جس کے بارے میں گذشتہ آیات میں گفتگو ہو چکی ہے بہت سی آیات میں انسان کے لئے نفس و روح کا پہلو مورد توجہ واقع ہوا ہے۔

اس فصل میں سب سے پہلے جسمانی پہلو اور اس کے بعد روحانی پہلو کی تحقیق کریں گے۔

اولین انسان کی خلقت

ان آیات کی تحلیل جو انسان کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ان نتائج کو ہمارے اختیار میں قرار دیتی ہیں کہ موجودہ انسانوں کی نسل، حضرت آدمؑ نامی ذات سے شروع ہوئی ہے۔ حضرت آدمؑ کی خلقت خصوصاً خاک سے ہوئی ہے۔ اور زمین پر انسانوں کی خلقت کو بیان کرنے والی آیات کے درمیان مندرجہ ذل آیات بہت ہی واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موجودہ نسل حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ سے شروع ہوئی ہے۔

﴿یـاأیُّهَـاالـنَّـاسُ اتَّـقُوا رَبَّکُمُ الَّذِی خَلَقَکُم مِن نَفسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنهَا زَوجَهَا وَبَثَّ مِنهُمَا رِجَالًا کَثِیراً وَ نِسَاءً﴾[1]

اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو (وہ پروردگار) جس نے تم سب کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اس سے اس کی ہمسر (بیوی) کو پیدا کیا اور انہیں دو سے بہت سے مرد و عورت (زمین میں) پھیل گئے۔

اس آیت میں ایک ہی انسان سے سبھی لوگوں کی خلقت کو بہت ہی صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔[2]

﴿وَ بَدَأَ خَلقَ الإِنسَانِ مِن طِینٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسلَهُ مِن سُلالَةٍ مِن مَّاءٍ مَهِینٍ﴾

اور انسان کی ابتدائی خلقت مٹی سے کی پھر اس کی نسل گندے پانی سے بنائی۔[3]

اس آیت میں بھی انسان کا نکتہ آغاز مٹی ہے اور اس کی نسل کو مٹی سے خلق ہوئے انسان کے نجس قطرہ سے بتایا ہے یہ آیت ان آیات کے ہمراہ جو حضرت آدمؑ کی خلقت کو (سب سے پہلے انسان کے عنوان سے) خاک و مٹی سے بیان کرتی ہے موجودہ نسل کے ایک فرد (حضرت آدمؑ) تک منتہی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

﴿یَا بَنِی آدَمَ لا یَفتِنَنَّکُمُ الشَّیطَانُ کَمَا أَخرَجَ أَبَوَیکُم مِنَ الجَنَّةِ﴾[4]

---

[1] سورۂ نساء، آیت:۱

[2] یہی مفاد آیت دوسری آیات میں بھی مذکور ہے جیسے سورۂ اعراف، آیت:۱۸۹-سورۂ انعام، آیت:۹۸- سورۂ زمر، آیت:۶

[3] سورۂ سجدہ، آیت:۷و۸۔

[4] سورۂ اعراف، آیت:۲۷۔

اے اولاد آدم! کہیں تمہیں شیطان بہکا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں، باپ کو بہشت سے نکلوادیا۔[1]

یہ آیت بھی صراحت کے ساتھ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو نسل انسانی کا ماں باپ بتاتی ہے۔ خاک سے حضرت آدم کی استثنائی خلقت بھی قرآن کی بعض آیات میں ذکر ہے جن میں سے تین موارد کی طرف نمونہ کے طور پر اشارہ کیا جارہا ہے۔

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾

خدا کے نزدیک جیسے حضرت عیسیٰ کا واقعہ ہے (حیرت انگیز خلقت) ویسے ہی آدم کا واقعہ بھی ہے ان کو مٹی سے پیدا کیا پھر کہا ہو جا پس وہ ہو گئے۔[2]

حدیث، تفسیر اور تاریخی منابع میں آیا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں نصاریٰ نجران نے اپنے نمائندوں کو مدینہ بھیجا تا کہ پیغمبر اسلام سے گفتگو اور مناظرہ کریں، وہ لوگ مدینہ کی مسجد میں آئے پہلے تو اپنی عبادت بجالائے اور اس کے بعد پیغمبر سے بحث کرنے لگے:

جناب موسی کے والد کون تھے؟

عمران۔

آپ کے والد کون ہیں؟

عبداللہ

جناب یوسف کے والد کون تھے؟

---

[1] بعض لوگوں نے آیت ''ذر'' نیز ان تمام آیات سے جس میں انسانوں کو ''یابنی آدم'' کی عبارت سے خطاب کیا گیا ہے اس سے انسانی نسل کا نکتہ آغاز حضرت آدمؑ کا ہونا استفادہ کیا گیا ہے۔

[2] سورۂ آل عمران، آیت:۵۹۔

یعقوب۔

جناب عیسیٰؑ کے والد کون تھے۔

پیغمبر تھوڑا ٹھہرے، اس وقت یہ آیت ﴿إِنَّ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ..﴾ نازل ہوئی۔[1]

عیسائی کہتے ہیں چونکہ عیسیٰ کا کوئی انسانی باپ نہیں ہے لہٰذا ان کا باپ خدا ہے آیت اس شبہ کے جواب میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ کیا تم معتقد نہیں ہو کہ آدم بغیر باپ کے تھے؟ عیسیٰ بھی انہیں کی طرح ہیں، جس طرح آدم کا کوئی باپ نہیں تھا اور تم قبول بھی کرتے ہو کہ وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں اسی طرح عیسیٰ بھی بغیر باپ کے ہیں اور حکم خدا سے پیدا ہوئے ہیں۔

مذکورہ نکات پر توجہ کرتے ہوئے اگر ہم فرض کریں کہ حضرت آدمؑ انسان وخاک کے مابین ایک درمیانی نسل سے وجود میں آئے مثال کے طور پر ایسے انسانوں سے جو بے عقل تھے یہ استدلال تام نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ نصاری نجران کہہ سکتے تھے کہ حضرت آدمؑ ایک اعتبار سے نطفہ سے وجود آئے جب کہ عیسیٰ اس طرح وجود میں نہیں آئے، اگر اس استدلال کو تام سمجھیں جیسا کہ ہے، تب ہم یہ قبول کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ حضرت آدمؑ کسی دوسرے موجود کی نسل سے وجود میں نہیں آئے ہیں۔

﴿وَبَدَأَ خَلْقَ الإِنسَانِ مِن طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِن مَاءٍ مَهِينٍ﴾

ان دو آیتوں میں سے پہلی آیت حضرت آدمؑ کی خاک سے خلقت کو بیان کرتی ہے اور دوسری آیت ان کی نسل کی خلقت کو حقیر پانی کے ذریعہ بیان کرتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی خلقت کا جدا ہونا اور ان کی نسل کا آب حقیر کے

---

[1] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۲۱ ص ۳۴۴۔

ذریعہ خلق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جناب آدمؑ کی خلقت استثنائی تھی ورنہ تفکیک وجدائی بے فائدہ ہوگی۔[1]

۳۔ بہت سی آیات جو خاک سے حضرت آدمؑ کی خلقت کا واقعہ اوران پر گذشتہ مراحل یعنی روح پھونکنا، خدا کے حکم سے فرشتوں کا سجدہ کرنا اور شیطان کا سجدہ سے انکار کو بیان کرتی ہیں جیسے:

﴿وَإِذ قَالَ رَبُّکَ لِلمَلائِکَةِ إِنّی خَالِقٌ بَشَراً مِن صَلصَالٍ مِن حَمَأٍ مَسنُونٍ فَإِذَا سَوَّیتُهُ وَنَفَختُ فِیهِ مِن رُوحِی فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِینَ﴾

اور (یاد کرو کہ) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی کو خمیر دی ہوئی مٹی سے جو سوکھ کر کھن کھن بولنے لگے پیدا کرنے والا ہوں تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر چلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ تمام انسان ان مراحل کو طے کرتے ہوئے جو آیات میں مذکور ہیں (خاک، بدبودار مٹی، چپکنے والی مٹی، ٹھیکرے کی طرح خش مٹی) صرف خشک مٹی سے خلق نہیں ہوئے ہیں اور فرشتوں نے ان پر سجدہ نہیں کیا بلکہ مذکورہ امور صرف پہلے انسان سے مخصوص ہے یعنی

---

[1] منطق کی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ تقسیم میں ہمیشہ فائدہ کا ہونا ضروری ہے یعنی اقسام کا خصوصیات اور احکام میں ایک دوسرے سے الگ ہونا چاہیئے ورنہ تقسیم بے فائدہ ہوگی، آیہ شریفہ میں بھی تمام انسانوں کو سب سے پہلے انسان اور اس کی نسل میں تقسیم کیا گیا ہے، لہٰذا اگر ان دوقسموں کا حکم خلقت کے اعتبار سے ایک ہی ہے تو تقسیم بے فائدہ اور غلط ہوگی۔

[2] سورۂ حجر، ۲۸و۲۹۔

حضرت آدمؑ جو استثنائی طور پر خاک (مذکورہ مراحل) سے خلق ہوئے ہیں۔[1]

قرآن کے بیانات اور ڈارون کا نظریہ

نظریۂ ارتقا اور اس کے ترکیبی عناصر کے ضمن میں بہت پہلے یہ نظریہ بعض دوسرے مفکرین کی طرف سے بیان ہو چکا تھا لیکن ۱۸۵۹ میں ڈاروین نے ایک عام نظریہ کے عنوان سے اسے پیش کیا۔

چارلز ڈاروین[2] نے انسان کی خلقت کے سلسلہ میں اپنے نظریہ کو یوں پیش کیا ہے کہ انسان اپنے سے پست حیوانوں سے ترقی کر کے موجودہ صورت میں خلق ہوا ہے اور انسان کی خلقت کے سلسلہ میں اس کے نظریہ نے عیسائیت اور جدید علم کے نظریات کے درمیان بہت ہی پیچیدہ مباحث کو جنم دیا اور بعض نے اس غلط نظریہ کی بنا پر علم اور دین کے درمیان اختلاف سمجھا ہے۔[3] ڈاروین کا دعویٰ تھا کہ مختلف نباتات وحیوانات کی قسمیں اتفاقی اور دھیرے دھیرے

---

[1] اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے اس لئے کہ حضرت آدمؑ کی خلقت کو بیان کرنے والی آیات بہت زیادہ ہیں اور چونکہ ان کی خلقت کے بہت سے مراحل تھے، لہٰذا بعض آیات میں جیسے آل عمران کی ۵۹ ویں آیت اس کی خلقت کے ابتدائی مرحلہ کو خاک، اور دوسری آیات جیسے سورۂ انعام کی دوسری آیت، ۱۱/ صافات، ۲۶ حجر اور ۱۴/ الرحمٰن کی آیتوں میں ایک ایک یا چند مرحلوں کے نام بتائے گئے ہیں، جیسے کہ سورۂ سجدہ کی ۷ و ۸ ویں آیت کی طرح آیات میں خاک سے حضرت آدمؑ کی خلقت بیان کرتے ہوئے آدمؑ کی خلقت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

[2] Charles Robert Darwin

[3] ڈاروین نے خود صراحتاً اعلان کیا ہے کہ ''میں اپنی فکری تبدیلیوں میں وجود کا انکار نہ کر سکا'' زندگی نامۂ چارلز ڈارون، ج ۱ ص ۳۵۴ (پیرس ۱۸۸۸) بدوی عبد الرحمٰن سے نقل کرتے ہوئے، موسوعۃ الفلسفۃ۔ ڈارون نے فطری قوانین کے سلسلے میں ایسے اسباب وعلل اور ثانوی ضرورت کے عنوان سے گفتگو کی ہے کہ جس کے ذریعہ خداوند عالم تخلیق کرتا ہے۔ گرچہ انسان کے ذہن نے اس باعظمت استنباط کو مشکوک کر دیا ہے۔ (ایان باربور، علم ودین، ص ۱۱۲)۔

تبدیلی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں جو کہ ایک نوع کے بعض افراد میں فطری عوامل کی بنیاد پر پایا جاتا ہے، جو تبدیلیاں ان افراد میں پیدا ہوئی ہیں وہ وراثت کے ذریعہ بعد والی نسل میں منتقل ہوگئی ہیں اور بہتر وجود، فطری انتخاب اور بقا کے تنازع میں ماحول کے مطابق حالات ایک جدید نوعیت کی خلقت کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ وہ اسی نظریہ کی بنیاد پر معتقد تھا کہ انسان کی خلقت بھی تمام اقسام کے حیوانات کی طرح سب سے پست حیوان سے وجود میں آئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان گذشتہ حیوانوں کی قسموں میں سب سے بہتر ہے۔

ڈارون کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی یہ نظریہ سخت متنازع اور تنقید کا شکار رہا اور ''اڈوارمک کریڈی''[۱] اور ''ریون''[۲] جیسے افراد نے اس نظریہ کو بالکل غلط مانا ہے۔[۳] اور الفریڈ رسل ویلیس''[۴] جیسے بعض افراد نے اس نظریہ کو خصوصاً انسان کی خلقت میں نادرست سمجھا ہے[۵] یہ نظریہ ایک خاص جرح و تعدیل کے باوجود علمی اعتبار سے نیز صفات شناسی اور ژنٹیک لحاظ سے ایک ایسے نظریہ میں تبدیل نہیں ہوسکا کہ جس کی بے چوں وچرا تثبیت ہو جائے اور مفکرین نے تصریح کی ہے کہ آثار اور موجودات شناسی کے ذریعہ انسان کے حسب ونسب کی دریافت کسی بھی طریقہ سے صحیح وواضح نہیں ہے اور انسانوں جیسے ڈھانچوں کے نمونے اور ایک دوسرے سے ان کی وابستگی، نظریۂ ارتقا کے طرفداروں کے مورد استناد ہونے کے باوجود ان کے نظریات میں قابل توجہ اختلاف ہے۔

۱۔ E. Mc. Crady۔ ۲۔ Raven۔

۳۔ ایان باربور، علم ودین، ص ۴۱۸ و ۴۲۲۔

۴۔ Alfred Russel Wallac

۵۔ ایان باربور، علم ودین،: ص ۱۱۱۔۱۱۴، اگر چہ نظریۂ ڈاروِیس پر وارد تنقیدوں کے مقابلہ میں اس کے

باقی حاشیہ ۵ کا اگلے ص پر......

''ایان باربور'' کی تعبیر یہ ہے کہ ایک نسل پہلے یہ رسم تھی کہ وہ تنہا نکتہ جو جدید انسانوں کے نسب کو گذشتہ بندروں سے ملاتا تھا، احتمال قوی یہ ہے کہ انسان اور بندر کی شباہت ایک دوسرے سے ان کے اشتقاق پر دلالت کرتی ہو جو اپنے ابتدائی دور میں بغیر نسل کے رہ گئی ہو نیز منقطع ہوگئی ہو۔[۲] اوصاف شناسی کے اعتبار سے معمولی تبدیلیوں میں بھی اختلاف لائے موجود ہے بعض دانشوروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگرچہ معمولی تحرک قابل تکرار ہے لیکن وہ وسیع پیمانہ پر تحرک و سرگرمی جو نظریۂ ارتقاء کے لئے ضروری ہیں بہت کم ہے۔ اور مردم شماری کے قوانین کے اعتبار سے قابل پیش بینی نہیں ہے، اس کے علاوہ ہوسکتا ہے کہ تجربہ گاہوں کے مطالعات ایک طرح کی اندرونی تبدیلیوں کی تائید کریں، لیکن تدریجی تبدیلیوں کے زیر اثر جدید اقسام کے وسیع حلقوں کی تشکیل کے اثبات سے ناتواں ہیں، اور ایک متحرک فرد کا کسی اجتماعی حلقہ اور بڑے گروہ میں تبدیل ہو جانا، ایک سوالیہ نشان ہے اور اس وسیع امور پر کسی بھی جہت سے واضح دلائل موجود نہیں

باقی حاشیہ ۵ کا پچھلے ص کا حاشیہ.........

مدافعین کی طرف سے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں لیکن آج بھی بعض تنقیدیں قانع جوابات کی محتاج ہیں مثال کے طور پر ''والٹر'' جو ''ڈارون'' سے بالکل جدا، فطری طور پر سب سے پہلے انتخاب کو نظام سمجھتا ہے اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اور بندر کی عقل کے درمیان موجودہ فاصلہ کو جیسا کہ ڈارون نے اس سے پہلے دعویٰ کیا تھا، بدوی قبائل پر حمل نہیں کر سکتے ہیں اس لئے کہ ان کی دماغی قوت ترقی یافتہ متمدن قوموں کی دماغی قوت کے مطابق تھی لہٰذا فطری انتخاب انسان کی بہترین دماغی توانائی کی توجیہ نہیں کرسکتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ بدوی قوموں کی عقلی توانائیاں ان کی سادہ زندگی کی ضرورتوں سے زیادہ تھیں، لہٰذا ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس سے چھوٹا مغز بھی کافی تھا۔ فطری انتخاب کے اعتبار سے بندروں سے زیادہ انسان کو دماغ دینا چاہیئے جب کہ ایسے انسانوں کا دماغ ایک فلسفی کے دماغ سے چھوٹا ہے۔ (ایان باربور، علم و دین، ص۱۴۴ و۱۱۵)۔

۲۔ ایان باربور، علم و دین، ص۴۰۲ و۴۰۳۔

ہیں۔[1] دوسری مشکل صفات کا میراثی ہونا ہے جب کہ ان کا اثبات معلومات و اطلاعات کے فراہم ہونے سے وابستہ ہے جس کو آئندہ محققین بھی حاصل نہیں کر سکیں گے یا موجودہ معلومات و اطلاعات کی وضاحتوں اور تفاسیر سے مربوط ہے جس کو اکثر ماہرین موجودات شناسی نے قبول نہیں کیا ہے۔[2] بہرحال ان نظریات کی تفصیلی تحقیق و تنقید اہم نہ ہونے کی وجہ سے ہم معترض نہیں ہوں گے، مختصر یہ کہ انسان کے بارے میں ڈارون کا نظریہ تنقیدوں، مناقشوں اور اس میں تناقض کے علاوہ صرف ایک ظنی اور تھیوری نظریہ سے زیادہ، کچھ نہیں ہے[3] مزید یہ کہ اگر اس نظریہ کو قبول بھی کر لیا جائے تو کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس میں خدا کے ارادہ کے باوجود کسی ایک شیٔ میں بھی فطری حرکت غیر عادی طریقہ سے نقض نہ ہوئی ہو، اور حضرت آدمؑ صرف خاک سے خلق نہ ہوئے ہوں، اس کے باوجود نظریہ ڈاروین کی تھیوری کے مطابق صرف انسانوں کی خلقت کے امکان کو ثابت کرتا ہے، اس راہ سے موجودہ نسل کی خلقت کی ضرورت و التزام کو ثابت نہیں کرتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے انسان اس راہ سے وجود میں آئے ہوں اور نسل منقطع ہوگئی ہو، لیکن موجودہ نسل جس طرح قرآن بیان کرتا ہے اسی طرح زمین پر خلق ہوئی ہے، قابل ذکر ہے کہ قرآن ایسے انسانوں کے خلق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں جن کی موجودہ نسل ان تک نہیں پہنچی ہے نیز ان کی خلقت کی کیفیت کے بارے میں خاموش ہے۔

---

[1] ایان باربور، علم و دین، ص ۴۰۳۔

[2] ایان باربور، علم و دین، ص ۴۰۴۔

[3] کارل پاپر (Karl Raimond Popper) ''جستجوی ناتمام'' کتاب میں لکھتا ہے:

نئے نظریۂ ارتقاء کے ماننے والوں نے زندگی کے دوام کو انطباق یا ماحول کی ساخت کا نتیجہ بتایا ہے، ایسے ضعیف نظریہ کے تجربہ کا امکان تقریباً صفر ہے۔ (ص ۲۱۱)۔

جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر چہ سب سے پہلے انسان کی خلقت سے مربوط آیات کے مفاہیم، انسان کے سلسلہ میں ڈاروین کی تھیوری کے مطابق نہیں ہیں لہٰذا جن افراد نے قرآن کریم کے بیانات سے دفاع کے لئے مذکورہ آیات کی توجیہ کی ہے انہیں توجہ رکھنی چاہیئے کہ ایسی توجیہیں صحیح نہیں ہیں بلکہ ''تفسیر بالرای'' ہے اس لئے کہ ایسے نظریات جو ضروری اور صحیح دلیلوں نیز تائیدوں سے خالی ہوں وہ مذکورہ آیات کی توجیہ پر دلیل نہیں بن سکتے ہیں، چہ جائے کہ توجیہ اور ظاہر آیات کے مفہوم سے استفادہ نہ کرنا صرف ایک قطعی اور مذکورہ آیات کے مخالف فلسفی یا غیر قابل تردید علمی نظریہ کی صورت میں ممکن ہے جب کہ ڈاروین کا نظریہ ان امتیازات سے خالی ہے۔

تمام انسانوں کی تخلیق

نسل انسان کی تخلیق پیدائش کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں گذشتہ ادوار سے آج تک پانچ نظریات بیان ہوئے ہیں۔

ارسطو نے بچہ کی خلقت کو خون حیض کے ذریعہ تسلیم کیا ہے اور اس سے ماسبق فلاسفہ نے مرد کی منی سے پیدا جنین کے رشد کے لئے شکم مادر کو صرف مزرعہ سمجھا ہے۔

تیسرا نظریہ جو ۱۸ویں صدی عیسوی کے نصف تک رائج تھا، خود بخود خلقت کا نظریہ تھا[۱] جس کے ویلیم ہاروے جیسے ماہرین مدافع تھے۔[۲] چوتھا نظریہ جو ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں بیان ہوا وہ نظریہ تکامل تھا۔[۳] جس کے لائب نیٹز ہالر اور بونہ جیسے افراد سرسخت طرفدار تھے، یہ لوگ

۱۔ Spontaneous Generation.

۲۔ William Harvey

۳۔ Evolution.

معتقد تھے کہ انسان کی اولاد بہت ہی چھوٹی موجود کی صورت میں انڈے یا نطفہ میں موجود رہتی ہے ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان چھوٹے اور متداخل موجودات کی کروڑوں تعداد اولین مرد یا عورت کے تناسلی اعضاء میں موجود تھی اور جب ان میں سے سب سے باریک اور آخری حصہ خارج ہو جائے گا تب نسل بشر ختم ہو جائے گی، اس نظریہ کے مطابق تناسل وتولد میں نئے اور جدید موجود کی خلقت و پیدائش بیان نہیں ہوئی ہے بلکہ ایسے موجود کے لئے رشد ونمو، آغاز وجود ہی سے موجود ہے۔

پانچواں نظریہ ۱۷ویں صدی میں ذرہ بین کے اختراع اور انسانی حیات شناسی کی آزمائشوں اور تحقیقوں کے انجام کے بعد خصوصاً ۱۸ویں صدی میں نطفہ شناسی کے عنوان سے بیان ہوا جس کی وجہ سے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نطفہ کی خلقت میں مرد وعورت دونوں کا کردار ہے اور نطفہ کامل طور پر مرد کی منی اور عورت کے مادہ میں نہیں ہوتا ہے مرد وعورت کے نطفہ کے ملنے کی کیفیت ۱۸۷۵ صدی میں مشاہدہ سے واضح ہو چکی ہے کہ بچہ کے ابتدائی نطفہ کی تخلیق میں مرد و عورت دونوں موثر ہیں۔ اور ۱۸۸۳ صدی میں نطفہ کی تخلیق میں دونوں کا مساوی کردار ثابت ہو چکا ہے، مختلف تبدیلیوں کے مراحل سے مرتبط اور مختلف شکلوں میں رحم کی دیواروں سے نطفہ کا معلق ہونا اور اس کا رشد نیز نطفہ کا مخلوط ہونا اور دوسری مختلف شکلیں جو نطفہ اختیار کرتا ہے یہ وہ چیزیں ہیں جس کی تحقیق ہو چکی ہے۔[۱]

قرآن مجید نے بہت سی آیات میں تمام انسانوں (نسل آدم) کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کی خلقت کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں اس حصہ میں ہم ان مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے ابتدائی دو مراحل کی تحقیق کریں گے۔

بعض آیات میں خدا فرماتا ہے:

---

[۱] ملاحظہ ہو: شاکرین، حمید رضا، قرآن وروان شناسی، ص ۲۲۔ ۲۵۔ طبارہ، عبد الفتاح، خلق الانسان دراستہ علمیۃ قرانیۃ، ج ۲ ص ۶۶۔ ۴۷۔

خداوند عالم نے انسان کو خلق کیا جب کہ اس سے پہلے وہ کچھ نہ تھا ﴿أوَلا یَذکُر الإنسَانُ أنّا خَلَقناهُ مِن قَبلَ وَلَم یَکُ شَیئاً﴾[1] کیا انسان بھول گیا کہ ہم نے اس وقت اسے خلق کیا جب وہ کچھ نہ تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ آیت میں قبل سے مراد ابتدائی (فلسفی اصطلاح میں خلقت جدید) مادہ کے بغیر انسان کی خلقت نہیں ہے اس لئے کہ بہت سی آیات میں ابتدائی مادہ کی بنا پر انسان کی خلقت کی تاکید ہوئی ہے، اس آیت میں یہ نکتہ مورد توجہ ہے کہ انسان کا مادہ وخاکہ، انسانی وجود میں تبدیل ہونے کے لئے ایک دوسرے (روح یا انسانی نفس و جان) کے اضافہ کا محتاج ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ابتدائی مادہ انسان کے مقابلہ میں روح کے بغیر قابل ذکر و قابل اہمیت نہیں ہے، اسی بنا پر ہم سورہ ''انسان'' کی پہلی آیت میں پڑھتے ہیں کہ ﴿هَل أتَیٰ عَلیٰ الإنسَانِ حِینٌ مِنَ الدَّهرِ لَم یَکُن شَیئاً مَذکُوراً﴾ کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گذرا جس میں وہ قابل ذکر شئی بھی نہ تھا۔

دوسرے گروہ کی آیات میں انسان کی خلقت کے ابتدائی مادہ کو زمین [2] خاک [3] مٹی [4] چپکنے والی مٹی [5] بدبودار مٹی (کیچڑ) خمیر [6] اور ٹھیکرے کی طرح خشک مٹی بتایا گیا ہے۔[7]

---

[1] سورۂ مریم، آیت:٦٧۔

[2] ﴿هُو أنشَأکُم مِنَ الأرضِ﴾ (سورۂ ہود، آیت:٦١)

[3] ﴿فإنّا خَلَقنَاکُم مِنَ تُرابٍ﴾ (سورۂ حج، آیت:٥)

[4] ﴿وَ بَدأَ خلقَ الإنسَانِ مِن طِینٍ﴾ (سورۂ سجدہ، آیت:٧)

[5] ﴿إنّا خَلَقنَاهُم مِن طِینٍ لازِبٍ﴾ (سورۂ صافات، آیت:١١)

[6] ﴿وَلَقَد خَلَقنَا الإنسَانَ ..مِن حَمأٍ مَسنُونٍ﴾ (سورۂ حجر، آیت:٢٦)

[7] ﴿خَلَقَ الإنسَانَ مِن صَلصَالٍ کَالفَخَّارِ﴾ (سورۂ رحمٰن، آیت:١٤)

وہ آیات جو انسان کی جسمانی خلقت کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اگر چہ اکثر مقامات پر انسان کو عام ذکر کیا ہے لیکن ان آیتوں کی روشنی میں جو اس کی ابتدائی خلقت میں گذر چکی ہیں اور موجودہ انسانوں کی خلقت کے عینی واقعات جو ان آیات میں بیان کئے گئے مذکورہ مراحل طے نہیں کرتے ہیں، مختصر یہ کہ ابتدائی انسان کی جسمانی خلقت کے یہی مراحل اس کی خلقت کے اختتام میں بھی پائے جاتے ہیں۔

آیات کا تیسرا گروہ انسان کے تخلیقی مادہ کو پانی بتاتا ہے جیسے ﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَ صِهراً﴾[1]

وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان اور سسرال والا بنایا۔

گر چہ ہوسکتا ہے کہ یہ آیت مصداق اور ان آیات کے موارد کو بیان کرنے والی ہو جو ہر متحرک یا ذی حیات کی خلقت کو پانی سے تسلیم کرتی ہیں۔[2] اور پانی سے مراد وہی پانی ہے جو عرف عام کی اصطلاح میں ہے لیکن ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو انسان یا نسل آدم کی خلقت کو حقیر[3] یا آب جہندہ[4] سے بیان کرتی ہیں ان سے اس احتمال کو قوت ملتی ہے کہ اس آیت میں پانی سے مراد انسانی نطفہ ہے، اور آیت شریفہ نسل آدم کی ابتدائی خلقت کے نطفہ کو بیان کر رہی ہے۔ لیکن ہر مقام پر اس کی خصوصیات میں سے ایک ہی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے منجملہ خصوصیات میں سے جو قرآن میں اس نطفہ کو انسانی نسل کی خلقت کے نقطہ آغاز کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ

---

[1] سورۂ فرقان، آیت: ۵۴۔ [2] سورۂ نور، آیت: ۴۵۔ سورۂ انبیاء، آیت: ۳۰۔

[3] ﴿أَلَمْ نَخْلُقكُمْ مِنْ مَاءٍ مَّهِينٍ﴾ (سورۂ مرسلات، آیت: ۲۰) ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ﴾ (سورۂ سجدہ، آیت: ۸)

[4] ﴿خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ﴾ (سورۂ طارق، آیت: ۶)

مخلوط ہونا ہے جسے علم بشر کم از کم ۱۸ ویں صدی سے پہلے نہیں جانتا تھا۔

سورۂ دہر کی دوسری آیت میں خدا فرماتا ہے:

﴿إنَّا خَلَقنَا الإنسَانَ مِن نُطفَةٍ أَمشَاجٍ نَبتَلِيهِ فَجَعَلنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً﴾

ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں (اسی لئے) تو ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا۔

اس آیت میں کلمہ ''امشاج'' کے ذریعہ بچہ آمادہ کرنے والے مخلوط نطفہ سے گفتگو ہوئی ہے یا اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ امشاج، مشیج کی جمع ہے جو مخلوط کے معنی میں ہے آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچہ کو تشکیل دینے والا نطفہ مخلوط ہونے کے اعتبار سے مختلف اقسام کا حامل ہے، اور یہ مفہوم، موجودہ رشد شناسی میں ثابت ہو چکے مطالب سے مطابقت رکھتا ہے اور یہ قرآن مجید کے غیبی خبروں میں سے شمار ہوتا ہے [1] اور انجام پا چکی تحقیقوں کے مطابق انسانی نطفہ ایک طرف تو مرد و عورت کے نطفہ سے مخلوط ہوتا ہے اور دوسری طرف خود نطفہ مختلف غدود کے ترشحات سے مخلوط و مرکب ہوتا ہے۔

علقہ ہونا بچہ کی خلقت کا دوسرا مرحلہ ہے جو قرآن کی آیتوں میں مذکور ہے، سورۂ حج آیت ۵، سورۂ مومنون، آیت: ۶۷، سورۂ غافر، آیت: ۳۸ کی آیات میں کلمہ ''علقہ'' اور سورۂ علق

---

[1] موریس بوکا لکھتا ہے: مادۂ منویہ مندرجہ ذیل غدود کے ترشحات سے وجود میں آتا ہے۔

۱۔ مرد کے تناسلی غدود کے ترشحات اسپرموٹزوید کے حامل ہوتے ہیں۔

۲۔ انڈوں کی تھیلیوں کے ترشحات، حاملہ کرنے کے عناصر سے خالی ہیں۔

۳۔ پروسٹٹ ترشحات، ظاہراً خمیر کی طرح ہوتے ہیں اور اس میں منی کی مخصوص بو ہوتی ہے۔

۴۔ دوسرے غدود کے مخلوط و سیال ترشحات، پیشاب کی رگوں میں موجود ہوتے ہیں۔ (بوکائی موریس، انجیل، قرآن و علم، ص ۲۷۱ و ۲۷۲)

کی دوسری آیت میں کلمہ "علق" بچہ کے رشد ونمو کے مراحل میں استعمال ہوا ہے، علق، علقہ کی جمع ہے اور علقہ علق سے لیا گیا ہے جس کا معنی چپکنا اور پیوستہ ہونا ہے چاہے وہ پیوستگی مادی ہو یا معنوی یا کسی اور چیز سے پیوستگی ہو مثلاً خون جامد (جاری خون کے مد مقابل) کے اجزاء میں بھی چپکنے کی صلاحیت ہوتی ہے مختصر یہ کہ ہر وہ چیز جو اس سے ملحق ہو اور چپک جائے اسے علقہ کہتے ہیں۔[1] جونک چونکہ خون یا خونی اجزاء کو چوسنے کے لئے بدن یا کسی دوسری چیز سے چپکتا ہے اس لئے اس کو بھی علقہ کہتے ہیں، بہر حال یہ دیوار رحم سے نطفہ کی چسپیدگی کے مراحل اور مخلوط نطفہ کے مختلف اجزاء کے ایک دوسرے سے چسپیدگی کی حکایت کرتی ہے، اور یہ حقیقت بھی قرآن کے غیبی اخبار اور نئی چیزوں میں سے ہے جسے آخری صدیوں تک علم بشر نے حل نہیں کیا تھا۔[2]

مضغہ[3] ہڈیوں کی خلقت[4] ہڈیوں پر گوشت کا آنا[5] اور دوسری چیزوں کی خلقت[6] (روح کا پھونکنا)[7] یہ وہ مراحل ہیں جو قرآن کی آیتوں میں نطفہ کے رشد کے لئے بیان ہوئے ہیں۔

---

[1] طبرسی، مجمع البیان، (سورہ علق کی دوسری آیت کے ذیل میں) لغت کی کتابیں۔

[2] دوسرے اور تیسرے ہفتوں میں جنین کے پیوند، ملاپ اور چپکنے کے مراحل کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: البار، محمد علی، خلق الانسان بین الطب والقرآن، ص ۳۶۸ و ۳۶۹۔ سلطانی، رضا، وفرہاد گرمی، جنین شناسی انسان، فصل ہفتم۔

[3] ﴿فَخَلَقنا العَلَقَةَ مُضغَةً﴾ سورۂ مومنون، آیت: ۱۴۔

[4] ﴿فخلقنَا المُضغَةَ عِظاماً﴾ سورۂ مومنون، آیت: ۱۴

[5] ﴿فکَسَونَاالعِظَامَ لَحماً﴾ سورۂ مومنون، آیت: ۱۴

[6] ﴿ثُمَّ أنشأنَاهُ خَلقاً آخرَ﴾ سورۂ مومنون، آیت: ۱۴۔

[7] رحم میں نطفہ کے استقرار کی خصوصیت اور اس کے شرائط نیز ولادت کے بعد رشد انسان کے مراحل کو بعض آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے سورۂ حج، آیت: ۵۔ سورۂ نوح، آیت: ۱۴۔ سورۂ زمر، آیت: ۶۔ سورۂ مومن، آیت ۶۷ کی آیتیں۔

روح کا وجود اور استقلال

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کی روح کے سلسلہ میں متعدد و مختلف نظریات بیان ہو چکے تھے بعض لوگ ایک سرے سے روح کے منکر تھے اور انسان کو مادی جسم میں منحصر سمجھتے تھے۔ بعض دوسرے لوگوں نے روح کو ایک مادی اور جسم سے وابستہ شئی اور انسان کی جسمانی خصوصیات اور آثار والی ذات شمار کیا ہے اور بعض لوگ روح کو غیر مادی لیکن جسم سے غیر مستقل وجود سمجھتے ہیں [1] ان نظریات کو بیان کرنے اور ان کی دلیلوں پر تنقید و تحقیق کے لئے مزید فرصت

---

[1] روح کے بارے میں بیان کئے گئے نظریات کو چار عمومی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) وہ نظریات جو جسم کے مقابلہ میں ایک عنصر کے اعتبار سے روح اور روحانی حوادث کے بالکل منکر ہیں اور تمام روحانی حوادث میں مادی توجیہ پیش کرتے ہیں، اس نظریہ کو "ڈمکراتیس، رنو، تھامس ہابز، علاف اشعری، باقلانی، ابوبکر اصم اور عقیدہ رفتار و کردار رکھنے والوں کی طرف نسبت دیا گیا ہے۔

(ب) وہ نظریات ہیں جس میں روحی حوادث کو قبول کیا گیا ہے، لیکن روح مجرد کا انکار کیا گیا ہے۔ عقیدہ تجلیات (Epiphenomenalism) روحی حوادث کو مادی حوادث سے بالکل جدا سمجھنے کے باوجود مادی اور جسمانی اعضاء کا نتیجہ سمجھتے ہیں نیز نظریہ فردی (Person Theory) روح کو ایسا نفسیاتی واقعہ سمجھتا ہے جو ہمیشہ انسان کی راہ میں ایجاد اور ختم ہوتا رہتا ہے۔ (T.H.Huxly) پی۔ اف۔ سراسن نے (P.F.Srawson) مذکورہ بالا دونوں نظریات کو ترتیب سے بیان کیا ہے۔

(ج) وہ نظریات جو روح و جسم کو دو مستقل اور جدا عنصر بتانے کے باوجود ان دونوں کو ایک جنسی اور مادی خمیر سے تعبیر کیا ہے۔ اس نظریہ کو ویلیم جیمز اور راسل کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

(د) بعض نظریات روح و جسم کے تاثرات کو قبول کرتے ہیں لیکن جسم کے علاوہ ایک دوسری شئی بنام روح یعنی مجرد شی کا اعتقاد رکھتے ہیں جس سے تمام روحی حوادث مربوط ہیں اور اسی سے حادث ہوتے ہیں، مفکرین و فلاسفہ کی قریب بہ اتفاق تعداد اس نظریہ کی طرفدار ہے۔ رجوع کریں: ابوزید منی احمد، الانسان فی الفلسفۃ الاسلامیۃ موسسہ الجامعیۃ للدراسات، بیروت، ۱۴۱۴، ص ۸۸۔۱۰۰۔

درکار ہے لہٰذا ہم اس سلسلہ میں صرف قرآن کے نظریہ کو ذکر کریں گے نیز بعض عقلی اور تجربی دلیلوں اور قرآن کے نظریہ سے ان کی ہماہنگی کو بیان کریں گے۔

وہ آیات جو قرآن مجید میں روح مجرد کے استقلال اور وجود کے بارے میں آئی ہیں دو گروہ میں تقسیم ہوتی ہیں:

پہلے گروہ میں وہ آیات ہیں جو روح کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں اور دوسرے گروہ میں وہ آیات ہیں جو حقیقت روح کے علاوہ استقلال اور موت کے بعد روح کی بقا کو بیان کرتی ہے۔

من جملہ آیات میں سے جو روح کے وجود پر دلالت کرتی ہیں وہ سورہ مومنون کی بارہویں تا چودہویں آیت ہے جو انسان کی جسمانی خلقت کے مراحل کو ذکر کرنے کے بعد بیان کرتی ہیں کہ ﴿ثُمَّ أنشأنَاهُ خَلقاً آخَرَ﴾[1] یہ واضح رہے کہ انسان کی جسمانی ترقی وارتقاء کے بعد دوسری خلقت سے مراد کوئی جسمانی مرحلہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ انسانی روح پھونکے جانے کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے اسی بنا پر اس جگہ آیت کی عبارت ان عبارتوں سے جدا ہے جو جسمانی مراحل کو ذکر کرتی ہیں۔[2]

سورۂ سجدہ کی نویں آیت میں بھی انسان کے اندر روح کے حقیقی وجود کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور خاک سے حضرت آدمؑ اور پانی سے ان کی نسل کی خلقت کے مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ:

---

[1] مجرد و مادی شیٔ کی خصوصیات اور تعریف کے بارے میں مزید اطلاعات کے لئے، ملاحظہ ہو: عبودیت، عبدالرسول، ہستی شناسی، ج:۱، ص:۲۵۶ تا ۲۸۷۔

[2] ملاحظہ ہو: محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن ج ۱۵ ص ۱۹ روایات میں بھی آیۂ کریمہ کی اسی طرح تفسیر ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو: الحر العاملی محمد بن الحسن، وسائل الشیعہ ج ۱۹ ص ۳۲۴۔

﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ......﴾[1] پھر خدا نے اس کو آمادہ کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

اس آیہ شریفہ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جسمانی ترقی کے مراحل سے آمادگی وتسویہ کے مرحلہ کو طے کرنے کے بعد خدا کی طرف سے روح پھونکی جائے گی۔[2]

وہ آیات جو روح کے علاوہ موت کے بعد اس کی بقا کو ثابت کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔[3] اور ان آیات کو تین گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت: ۹، یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیات وروایات سے روح انسان کے استقلال اور وجود کا استفادہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن نے کلمہ روح استعمال کر کے روح انسان کے استقلال ووجود کے مسئلہ کو بیان کیا ہے، قرآن کریم میں تقریباً ۲۰ مقامات میں کلمہ روح استعمال ہوا ہے، اور اس کے معنی ومراد کے اعتبار سے بعض آیات میں اختلاف پایا جاتا ہے جیسے آیہ شریفہ ﴿قُلِ الرُّوحُ مِن أَمرِ رَبِّی﴾ لیکن کلمہ روح کے دو قطعی اور مورد اتفاق استعمالات ہیں:

پہلا یہ کہ خدا کے ایک برگزیدہ فرشتہ کے سلسلہ میں ''روح، روح القدس، روح الامین'' کی تعبیریں مذکور ہیں جیسے ﴿تنزّلُ المَلائکۃُ وَالرُّوحُ فِیھَا بِاذنِ رَبّھِم مِن کُلّ أمر﴾ سورۂ قدر، آیت: ۴

دوسرا مقام یہ ہے کہ اس انسانی روح کے بارے میں استعمال ہوا ہے جو اس کے جسم میں پھونکی جاتی ہے، جیسے وہ موارد جس میں حضرت آدمؑ اور عیسیٰؑ کی خلقت کے سلسلہ میں روح پھونکے جانے کی گفتگو ہوئی ہے، مثال کے طور پر ﴿فَاِذَا سَوَّیتُہُ وَنَفَختُ فِیہِ مِن رُّوحی فَقَعُوا لَہُ سَاجِدِینَ﴾ سورۂ حجر، آیت: ۲۹۔ حضرت آدمؑ کی خلقت کو بیان کیا ہے اور جیسے ﴿وَمَریَمَ ابنَتَ عِمرَانَ الَّتِی أحصَنَت فَرجَھَا فَنَفَخنَا فِیہِ مِن رُّوحِنَا﴾ سورۂ تحریم، آیت: ۱۲۔

[2] بعض مفسرین نے مذکورہ آیت میں روح پھونکے جانے کے عمل کو حضرت آدمؑ کی خلقت بیان کیا ہے، لیکن جو چیزیں متن کتاب میں مذکور ہیں وہ ظاہر آیت سے سازگار نہیں ہیں۔

[3] بدن سے روح کے استقلال کے مختلف تاثرات کی نفی اور بالکل بے نیازی کے معنی میں سمجھنا چاہیئے بلکہ

باقی حاشیہ ۳ کا اگلے صفحہ پر......

ا۔ وہ آیات جو موت کو "توفی" کے عنوان سے یاد کرتی ہیں خصوصاً سورۂ سجدہ کی دسویں اور گیارہویں آیتیں:

﴿وَقَالُوا أَءِ ذَا ضَلَلنَا فِی الارضِ أ انَّالَفِی خَلقٍ جَدِیدٍ بَل هُم بِلِقَاءِ رَبِّهِم کَافِرُونَ قُل یَتَوَفَّاکُم مَّلَکُ المَوتِ الَّذِی وَکُلَّ بِکُم ثُمَّ إِلَیٰ رَبِّکُم تُرجَعُونَ﴾

اوران لوگوں (کافرین) نے کہا کہ جب ہم (مر گئے بوسیدہ اور جسم کے ذرات) زمین میں ناپید ہو گئے تو کیا ہم پھر نیا جنم لیں گے بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے حضور ہی سے انکار رکھتے ہیں، تم کہہ دو کہ ملک الموت جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

کلمہ "توفی" پر توجہ کرتے ہوئے کہ جس کا معنی کسی چیز کو پوری طرح اور کامل طریقہ سے دریافت کرنا ہے، مذکورہ آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موت کے وقت وہ چیز جو مشاہدہ ہوتی ہے اس کے علاوہ (بے حرکت اور احساس وفہم سے عاری جسم) وہ چیز جو انسان کی اصل حقیقت ہے اور پوری طرح فرشتوں کے ذریعہ دریافت ہوتی ہے وہی روح ہے اس لئے کہ مرنے کے بعد اور مرنے سے پہلے جسم ہمارے درمیان اور اختیار میں ہے جسے فرشتہ وحی دریافت نہیں کرتا ہے اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ منکرین معاد جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان درحقیقت وہی

باقی حاشیہ ۳ حاشیہ......

روح اپنی تمام فعالیت میں تقریباً جسم کی محتاج ہے اور ان افعال کو جسم کی مدد سے انجام دیتی ہے، مثال کے طور پر مادی دنیا کے حوادث کی معرفت بھی روح کی فعالیت میں سے ہے جو حسی اعضا سے انجام پاتے ہیں، اسی طرح انسان کی روح اور اس کا جسم ایک دوسرے میں اثر انداز ہوتے ہیں، مثال کے طور پر روح کی شدید تاثرات آنکھ کے غدود سے اشک جاری ہونے کے ہمراہ ہے اور معدہ کا خالی ہونا بھوک کے احساس کو انسان کے اندر ایجاد کرتا ہے۔

جسم ہے جو موت کی وجہ سے منتشر ہو جاتا ہے اور اس کے ذرات زمین میں نابود ہو جاتے ہیں خداوند قدوس اس فکر کو نادرست مانتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہاری حقیقی اور واقعی حقیقت ایک دوسری شئی ہے جو کامل طور پر ملک الموت کے ذریعہ دریافت ہوتی ہے موت اور جسم کے پراکندہ ہو جانے سے نابود ہونے والی نہیں ہے بلکہ وہ جسم سے الگ اپنی حیات کو جاری رکھتی ہے۔

۲۔ آیہ کریمہ:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴾[۱]

اور کاش تم دیکھتے کہ یہ ظالم موت کی سختیوں میں پڑے ہیں اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ لپکا رہے ہیں (اور ان کے سروں کے اوپر کھڑے ہوئے ان سے کہیں گے) خود اپنی جانیں نکالو آج ہی تو تم کو رسوائی کے عذاب کی سزا دی جائے گی کیونکہ تم خدا پر ناحق جھوٹ جوڑا کرتے تھے اور اس کی آیتوں سے اکڑا کرتے تھے۔

''اپنے آپ کو خارج کریں'' کی تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان جسم کے علاوہ ایک عنصر اور رکھتا ہے جو انسان کی حقیقت کو تشکیل دیتا ہے اور موت کے وقت جسم سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ ملک الموت کے ذریعہ روح انسان کے قبض ہونے کی دوسری تعبیر ہے۔[۲]

۳۔ عالم برزخ کی حیات کو بیان کرنے والی آیت:

---

۱ سورۂ انعام، ۹۳۔

۲ یہ مسئلہ اپنی جگہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس طرح روح کا بدن کے ساتھ اتحاد، مادی نہیں ہے اسی طرح بدن سے روح کا خارج ہونا بھی مادی خروج نہیں ہے، وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: علامہ طباطبائی کی المیزان ج ۷، ص ۲۸۵۔

﴿حَتّٰی إِذَاجَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونَ لَعَلِّی أَعْمَلُ صَالِحاً فِیمَاتَرَکْتُ کَلاَّ إِنَّهَا کَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَاوَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَیٰ یَومِ یُبْعَثُونَ﴾[1]

یہاں تک کہ جب ان (کافروں) میں سے کسی کی موت آئی تو کہنے لگے پروردگار! تو مجھے (دنیا میں) پھر واپس کردے تاکہ میں اچھے اچھے کام کروں ہرگز نہیں (وہ اسی خواہش میں رہے ہیں) یہ ایک لغو بات ہے جسے وہ بک رہا ہے اوران کے بعد (حیات) برزخ ہے وہ دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔

عالم برزخ پر روشنی ڈالنے والی بہت سی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مرنے کے بعد اور قیامت برپا ہونے سے پہلے روح ایک دنیا میں باحیات ہوتی ہے اور پروردگار کی نعمت و عذاب میں مبتلا رہتی ہے، اس کی آرزو و خواہش ہوتی ہے، سرزنش عذاب، نیکی اور بشارت سے مرنے والا دوچار ہوتا ہے اور مرتے ہی وہ ان خصوصیات کے ساتھ اس عالم میں وارد ہوتا ہے یہ تمام چیزیں اس جسم کے علاوہ ہیں جسے ہم نے مشاہدہ کیا ہے یا نابود جاتا ہے، اسی بنا پر موت کے بعد روح کا وجود اور اس کی بقا واضح و روشن ہے۔[2]

روح کے اثبات میں بشری معرفت اور دینی نظریہ کی ہماہنگی

گذشتہ بحث میں قرآن مجید کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے جسم اور جسمانی حوادث کے علاوہ انسان کے لئے روح نامی ایک دوسرے مستقل پہلو کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے اب ہم روح کی خصوصیات اور روحی حوادث سے مختصر آشنائی اور عقلی مباحث اور تجربی شواہد کے تقاضوں سے دینی نظریہ کی ہماہنگی کی میزان معلوم کرنے کے لئے انسان کی مجرد روح کے وجود پر مبنی

---

[1] سورۂ مومنون، آیت: ۹۹، ۱۰۰

[2] استقلال روح اور وجود کو بیان کرنے والی تمام آثار کی معلومات کے لئے۔ ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) ص ۴۵۰۔۴۵۶)

بعض تجربی شواہداور عقلی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

الف: عقلی دلائل

شخصیت کی حقیقت

ہم میں سے کوئی بھی کسی چیز میں مشکوک ہوسکتا ہے لیکن اپنے وجود میں کوئی شک نہیں کر تا ہے۔ ہرانسان اپنے وجود کو محسوس کرتا ہے اوراس پر یقین رکھتا ہے یہ اپنے وجود کا علم اس کی واضح ترین معلومات ہے، جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری طرف اس مطلب کو بھی جانتے ہیں کہ جس چیز کو''خود''یا''میں'' سے تعبیر کرتے ہیں وہ آغاز خلقت سے عمر کے اواخر تک ایک چیز تھی اور ہے، جب کہ آپ اپنی پوری زندگی میں بعض خصوصیات اور صفات کے مالک رہتے ہیں یا اسے کھو بیٹھتے ہیں لیکن وہ چیز جس کو''خود''یا''میں'' کہتے ہیں اسی طرح ثابت و پائیدار ہے ہم مذکورہ امور کو علم حضوری سے حاصل کرتے ہیں۔

اب ہم دیکھیں گے کہ وہ تنہا ثابت و پائیدار شئی کیا ہے؟ وہ تنہا، بغیر کسی شک کے اعضایا اجسام یا بدن کا دوسرا مادی جزء یا رابطوں کے تاثرات اوران کے مادی آثارنہیں ہوسکتے اس لئے کہ ان کو ہم علم حضوری کے ذریعہ حاصل نہیں کرتے ہیں، بلکہ ظاہری حواس سے درک کرتے ہیں اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہمیشہ متحول و متغیر ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا''میں''یا''خود'' ہمارے جسم اوراس کے آثار وعوارض کے علاوہ ایک دوسری حقیقت ہے اوراس کی پائیداری واستحکام، مجرد اورغیر مادی ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ طریقۂ معرفت اور فلسفہ علم سے بعض نا آشنا حضرات کہتے ہیں کہ علم: روح مجرد کے وجود سے انکار کرتا ہےاوراس پر اعتقاد کو غلط تسلیم کرتا ہے[1] جب کہ علم کا کوئی ایسا دعوی نہیں ہے بلکہ علم اس سے کہیں زیادہ متواضع ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار

[1] مارکس کے ماننے والے اپنے فلسفہ کو فلسفہ علمی کہتے ہیں اور روح کے منکر و معتقد بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو: مجموعہ آثار ج ٦ ؟ ص ١١٥۔

سے باہر مجرد امور میں قضاوت کرے، یہ بات گذر چکی ہے کہ زیادہ سے زیادہ پہلوؤں میں علم کے دعویٰ انکار اور نہ ہونا نہیں ہے بلکہ عدم حصول ہے۔

روح کا نا قابل تقسیم ہونا اور اس کے حوادث

مادی وجسمانی موجودات، کمیت ومقدار سے سروکار رکھنے کی وجہ سے قابل تجزیہ وتقسیم ہیں مثال کے طور پر ۲۰ سینٹی میٹر پتھر کا ایک ٹکڑا یا ایک میٹر لکڑی چونکہ کمیت ومقدار رکھتے ہیں لہٰذا قابل تقسیم ہیں اسی طرح ۱۰ سینٹی میٹر پتھر کے دو ٹکڑے یا آدھے میٹر لکڑی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک ورق کاغذ کی سفیدی جو کہ کاغذ کی وجہ سے باقی اور اس میں داخل ہے، کاغذ کو دو حصہ میں کر کے اس کی سفیدی کو بھی (کاغذ کے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کے ساتھ ساتھ) تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن ہم سے ہر ایک جس وقت اپنے بارے میں غور وفکر کرتا ہے تو اس حقیقت کو پاتا ہے کہ نفس، مادی حقیقتوں میں سے نہیں ہے اور وہ چیز جس کو ''میں'' کہتا ہے وہ ایک بسیط اور نا قابل تقسیم شئ ہے یہ تقسیم نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ''میں'' کی حقیقت مادہ اور جسم نہیں ہے، مزید یہ کہ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ نفس، مادی چیزوں میں سے نہیں ہے ''میں'' اور روحی حوادث ، ہمارے جسم کے ہمراہ، تقسیم پذیر نہیں ہیں یعنی اس طرح نہیں ہے کہ اگر ہمارے جسم کو دو نیم کریں تو ''میں'' یا ہماری فکر یا وہ مطالب جن کو محفوظ کیا ہے دو نیم ہو جائے گی، اس حقیقت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ''میں'' اور ''روحی حوادث'' مادہ پر حمل ہونے والی اشیاء وآثار میں سے نہیں ہیں۔

مکان سے بے نیاز ہونا

مادی چیزیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر مختلف جہت رکھنے کے باوجود مکان کی محتاج ہیں اور فضا کو پُر کیے ہوئے ہیں لیکن روح اور روحی حوادث جس میں بالکل جہت ہی نہیں ہے اس کے لئے کوئی مکان بھی نہیں ہے مثال کے طور پر ہم اپنی روح کے لئے جس کو لفظ ''میں'' کے ذریعہ

یاد کرتے ہیں اس کے لئے اپنے جسم یا جسم کے علاوہ کسی چیز میں کوئی مکان معین نہیں کر سکتے ہیں اس لئے کہ وہ نہ تو جسم کا حصہ ہے کہ جہت رکھتا ہو اور نہ ہی جسم میں حلول کرتا ہے اور نہ جسم کی خصوصیات کا مالک ہے جس کی وجہ سے جہت ہو اور نتیجتاً مکان رکھتا ہو، روحی حوادث مثلاً غم، خوشی فکر ونتیجہ، ارادہ اور فیصلوں کا اخذ بھی اسی طرح ہیں۔

کبیر کا صغیر پر انطباق

ہم میں سے ہر ایک یہ تجربہ رکھتا ہے کہ بارہا وہ جنگل وصحرا کے فطری مناظر اور وسیع آسمان سے لطف اندوز ہوا ہے، ہم ان وسیع مناظر کو ان کی وسعت و پھیلاؤ کے ساتھ درک کرتے ہیں، کیا کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ وسیع وعریض مناظر اور دوسرے سیکڑوں نمونے جن کو پہلے دیکھا ہے اور اس وقت بھی حافظہ میں ہیں، کہاں موجود رہتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ وسیع مناظر جو کئی کیلومیٹر وسیع جگہ کے محتاج ہیں، مغز کے بہت ہی چھوٹے جسم میں سما جائیں؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ مناظر ہمارے اندر محفوظ ہیں اور ہم ان کو اسی وسعت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں لیکن ہمارے مادی اعضاء میں سے کوئی بھی مخصوصا ہمارا دماغ جس کو مادہ پرست حضرات مرکز فہم کہتے ہیں، ایسے مناظر کی گنجائش نہیں رکھتا ہے اور ایسے مناظر کا اس قلیل جگہ میں قرار پانا ممکن بھی نہیں ہے، اور علماء کی اصطلاح میں ''صغیر پر کبیر کا انطباق'' لازم آئے گا جس کا بطلان واضح ہے۔[1]

---

[1] ٹیلی ویژن مانیٹر کے صفحہ پر جس طرح ایک بہت ہی چھوٹی تصویر دیکھتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ چھوٹی تصویر اس وسیع وعریض منظر کی تصویر ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ ہم ان مناظر اور وسیع وعریض مقامات کو ان کی بزرگی کے ساتھ درک کرتے ہیں۔

ب: بشری شواہد

بشر کے تجربات میں ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جو روح کے مجرد و مستقل وجود کی تائید کرتے ہیں "روحوں سے رابطہ" جس میں انسان ان لوگوں سے جو سیکڑوں سال پہلے مر چکے ہیں اور شاید ان اسماء کو بھی نہ سنا ہو، ارتباط قائم کرتا ہے اور معلومات دریافت کرتا ہے۔[1]

---

[1] ایسے مفکرین کے سامنے جن کی باریک بینی، صداقت اور تقویٰ میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا ہے ایسے موارد بھی پیش آئے ہیں کہ جنھوں نے کئی سال پہلے مر چکے افراد سے ارتباط برقرار کر کے گذشتہ و آیندہ کے بارے میں معلومات دریافت کی ہیں۔ اگر روح مجرد کا وجود نہ ہوتا تو ایسے جسم سے رابطہ بھی ممکن نہ ہوتا جو سالوں پہلے پراکندہ ہو چکا تھا اور ان مفکرین سے کوئی معرفت و رابطہ بھی نہ تھا، مثال کے طور پر مرحوم علامہ طباطبائی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: طالب علمی کے زمانہ میں جب میں نجف اشرف میں دینی علوم کی تعلیم میں مشغول تھا، ایک بار میری اقتصادی حالت بہت نازک ہو گئی تھی، گھر میں بیٹھا ہوا تھا اور زندگی کی اقتصادیات نے میرے ذہن کو پریشان کر رکھا تھا، میں نے اپنے آپ سے کہا تم کب تک اس اقتصادی حالت میں زندگی گذار سکتے ہو؟ ناگاہ میں نے احساس کیا کہ کوئی دق الباب کر رہا ہے، میں اٹھا اور جا کر دروازہ کھولا، ایسے شخص کو دیکھا جس کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا ایک مخصوص لباس زیب تن کئے ہوئے تھا، مجھے سلام کیا اور میں نے جواب سلام دیا، اس نے کہا، میں سلطان حسین ہوں۔ خداوند عالم فرماتا ہے: میں نے ان اٹھارہ سالوں میں کب تم کو بھوکا رکھا ہے جو تم درس و مطالعہ چھوڑ کر روزی کی فراہمی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟ علامہ فرماتے ہیں کہ: اس شخص نے خدا حافظی کیا اور چلا گیا، میں نے دروازہ بند کیا اور واپس آ گیا اچانک میں نے دیکھا میں تو پہلے والے ہی انداز میں کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور میں نے کوئی حرکت بھی نہیں کی ہے، میں اپنے دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ اٹھارہ سال کس وقت سے شروع ہوتا ہے؟ میری طالب علمی کے آغاز کا دور تو اٹھارہ سالوں سے زیادہ ہے اور شادی کا وقت بھی اٹھارہ سال سے مطابق نہیں رکھتا ہے میں نے غور کیا تو یاد آیا کہ جب سے میں نے روحانی لباس زیب تن کیا ہے، ٹھیک اٹھارہ سال گذر چکے ہیں۔ چند سال بعد میں ایران آیا

بقیہ حاشیہ اگلے ص: پر.......

''آٹواسکوپی'' (تخلیہ روح) میں جسم سے روح کی عارضی جدائی کے وقت ان لوگوں سے معلومات کا مشاہدہ کیا گیا ہے جو برین اسٹوک یا شدید حادثہ کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے ہیں اور اچھے ہونے کے بعد بے ہوشی کے وقت کے تمام حالات کو یاد رکھتے ہیں [1] سچے خواب میں افراد نیند ہی کی

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا..........

اور تبریز میں رہنے لگا۔ ایک دن میں قبرستان گیا اچانک میری نظر ایک قبر پر پڑی دیکھا اسی شخص کا نام قبر کی تختی پر کندہ ہے، میں نے اس کی تاریخ وفات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ سے تین سو سال پہلے وہ اس دنیا سے جا چکا تھا اور میرا رابطہ اس کی روح سے تھا۔ (ملاحظہ ہو: قاسم لو، یعقوب، طبیب عاشقان، ص ۴۵ و ۴۶) اسی مطلب کی طرح، بیداری کی حالت میں اپنے اور دوسروں کے مستقبل کا مشاہدہ کرنا ہے جیسے وہ چیزیں جو حضرت آیۃ اللہ خوئی طاب ثراہ کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ: آپ نے اپنی جوانی اور طالب علمی کے ابتدائی دور میں اپنی زندگی کے تمام مراحل کو حتی ہنگام موت اور اپنی تشییع جنازہ کے مراسم کو بھی عالم بیداری میں مکاشفہ کی شکل میں دیکھا تھا اور اپنی پوری زندگی کو اسی انداز میں تجربہ بھی کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو: حسن زادہ، صادق آسودہ عارفان: ص ۶۱)

[1] آٹواسکوپی (Autoscopy) مغرب میں عالم تجربہ کا یہ نسبتاً جدید انکشاف ہے اور ایسے افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جن کی ایکسیڈینٹ یا شدید برین اسٹوک کی وجہ سے روح دور ہو جاتی ہے ان کے حالات کے صحیح اور معمول پر واپس آنے کے بعد اپنے بے ہوشی کے دوران کے سبھی حالات کو جانتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ: ہم اپنے جسم نیز ان افراد کو جو ہمارے اردگرد تھے اور جو کام وہ ہمارے جسم پر انجام دیتے تھے اور اسی طرح مکان اور آواز کو ان مدت میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے، ریمنڈ مودی نام کے ایک مفکر نے اپنی کتاب Life after life (زندگی، زندگی کے بعد) میں ان مشاہدات کے نمونوں کا ذکر کیا ہے مائکل سابون نام کے ایک دوسرے مفکر نے پانچ سال کے اندر ۱۱۶ افراد سے اس طرح کا بیان لیا ہے۔ جس میں سے تین چوتھائی افراد، عارضۂ قلبی کے شکار ہوئے ہیں، ان میں سے ایک تہائی افراد آٹواسکوپی میں مبتلا تھے۔ ملاحظہ ہو: ہوپر، جودیث ودیک ٹرسی، جہاں شگفت انگیز مغز، ص ۵۵۷، ۵۶۹۔ انسان در اسلام، کے ص ۸۸ پر واعظی نے نقل کیا ہے۔ توجہ ہونا چاہیئے کہ ایسے افراد کا جسم درک نہیں کرتا ہے اور حواس بھی تقریباً کام نہیں کرتا ہے لہٰذا ان حالات کی بہترین توجیہ، مستقل اور مجرد روح کا وجود ہے۔

حالت میں گذشتہ یا آئندہ زمانے میں نہ دیکھی نہ سنی جگہوں میں سفر کرتے ہیں، اور بیداری کے بعد خواب کے مطابق معلومات کو صحیح پاتے ہیں۔[1] اور ٹیلی پیتھی میں دو یا چند آدمی بہت ہی زیادہ فاصلہ سے مثال کے طور پر دو شہروں میں ایک دوسرے سے مرتبط ہوتے ہیں اور بغیر کسی مادی ارتباط کے ایک دوسرے سے معلومات منتقل کرتے ہیں۔[2] یہ وہ جملہ تجربی شواہد کے موارد ہیں جو روح مجرد کے وجود کی تائید کرتے ہیں۔ گذشتہ چیزوں پر توجہ کرتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روحی حوادث کو شیمیای، مادی مقناطیسی لہروں یا شیمیائی الکٹرک کے فعل وانفعال سے توجیہ نہیں کیا جا سکتا ہے اور انسانی خواہشات جیسے حوادث، درد واحساسات خصوصاً ادراک، تجربہ وتحلیل، نتیجہ اخذ کرنے اور استنباط وغیرہ جیسی کوئی چیز بھی قابل توجیہ نہیں ہے۔

---

[1] سچے خواب بھی بہت زیادہ ہیں جو روح کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ ان خوابوں میں انسان ماضی یا مستقبل میں یا ایسی جگہوں میں سفر کرتا ہے جسے کبھی دیکھا نہ تھا حتی ان کے اوصاف کے بارے میں نہ پڑھا اور نہ ہی سنا تھا اور جو وہ معلومات حاصل کرتا ہے حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے اور وقت گذرنے کے بعد ان چیزوں کا اسی طرح مشاہدہ کرتا ہے جیسا کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا، چونکہ خواب کے وقت انسان کا بدن ساکت اور مخصوص جگہ میں ہوتا ہے، لہٰذا یہ حرکت اور اطلاعات کا حصول، روح مجرد کو قبول کئے بغیر قابل توجیہ اور منطقی نہیں ہے۔

[2] روح مجرد کے وجود کی دوسری دلیل ٹیلی پیتھی (Telepathy) اور دور سے رابطہ ہے، بعض اوقات انسان ایسے افراد سے رابطہ کا احساس کرتا ہے جو دوسرے شہر میں رہتا ہے اور اس رابطہ میں ایک دوسرے سے معلومات منتقل کرتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے، یہ رابطہ ارواح سے رابطہ کی طرح ہے لیکن یہ زندہ لوگوں کی روحیں ہیں۔

روح مجرد اور انسان کی واقعی حقیقت

انسانی روح کے سلسلہ میں مجرد ہونے کے علاوہ دوسرے ضروری مسائل بھی ہیں جن کے سلسلہ میں قرآن کے نظریہ کو اختصار اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ پہلی بات یہ کہ انسان کی روح ایک مجرد وجود ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کی واقعی حقیقت (وہ چیزیں جو انسان کی انسانیت سے مربوط ہیں) کو اس کی روح تشکیل دیتی ہے، یہ دو مطالب گذشتہ آیات کے مفہوم و توضیحات سے حاصل ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ انسان کی خلقت سے مربوط آیات میں اس کی جسمانی خلقت کے مراحل کے بیان کے بعد ایک دوسری تخلیق یا روح پھونکنے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور یہ نکتہ روح کے غیر مادی ہونے کی علامت ہے، جسم کے پراکندہ ہونے کے بعد انسان کی بقا اور عالم برزخ میں زندگی کا دوام نیز اس کا کامل اور پوری طرح دریافت ہونا بھی روح کے مادی و جسمانی نہ ہونے کی علامت ہے۔ دوسری طرف اگر انسان کی واقعی حقیقت اس کے مادی جسم میں ہے تو مرنے اور جسم کے پراکندہ ہونے کے بعد نابود ہو جانا چاہیئے تھا جبکہ آیات قرآنی جسم کے پراکندہ ہونے کے بعد بھی انسان کی بقا کی تائید کرتی ہیں خداوند عالم نے انسان کی فرد اول کے عنوان سے حضرت آدمؑ کی خلقت کے بارے میں فرمایا: ''روح پھونکے جانے کے بعد، سجدہ کرو'' یہ حکم بتاتا ہے کہ اس مرحلہ میں پہلے وہ خلیفۃ اللہ انسان جس کی خلقت کا خداوند عالم نے وعدہ کیا تھا ابھی وجود میں نہیں آیا ہے انسان کی خلقت میں یہ کہنے کے بعد کہ ثُمَّ أَنشَأنَاہُ خَلقاً آخرَ ''پھر ہم نے اس کو ایک دوسری شکل میں پیدا کیا'' اس جملہ کو بیان کیا فَتَبَارَکَ اللّٰہُ أَحسَنُ الخَالِقِینَ[1] ''پس مبارک ہے وہ اللہ جو بنانے والوں میں سب سے بہتر ہے'' یہ نکتہ بھی دلالت کرتا ہے کہ انسان کا وجود روح پھونکنے کے بعد متحقق ہوتا ہے، وہ آیات جو بیان کرتی ہیں کہ ہم تم کو تام اور کامل

---

[1] سورۂ مومنون، آیت:۱۴۔

دریافت کرتے ہیں وہ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کی روح اس کی واقعی حقیقت کو تشکیل دیتی ہے ورنہ اگر جسم بھی انسان کے حقیقی وجود کا حصہ ہوتا تو موت کے وقت انسان، تام اور کامل دریافت نہیں ہوتا اور جسم کے پراکندہ ہوتے ہی انسان کی واقعی حقیقت کا وہ حصہ بھی نابود ہو جاتا۔

خلاصۂ فصل

۱۔انسان دو پہلو رکھنے والا اور جسم وروح سے مرکب وجود ہے۔

۲۔اگر چہ نسل آدم علیہ السلام کے جسم کی بناوٹ کی کیفیت کے بارے میں کوئی خاص بحث نہیں ہے لیکن مفکرین، ابوالبشر حضرت آدمؑ کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں۔

۳۔جب ڈارون نے اپنے فرضیہ کو بیان کیا اور مختلف مخلوقات کی بناوٹ کو (بہترین انتخاب اصل ہے) کی بنیاد پر پیش کیا تو بعض مغربی مفکرین نے نسل آدم کے ماضی کو بھی اسی فرضیہ کی روشنی میں تمام حقیر حیوانات کے درمیان جستجو کرتے ہوئے بندروں کے گمشدہ سلسلہ کے ساتھ پیش کیا۔

۴۔بعض مسلمان مفکرین نے کوشش کی ہے کہ خلقت آدم کو بیان کرنے والی آیات کی بھی اسی فرضیہ کے مطابق تفسیر کریں لیکن اس طرح کی آیات ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ﴾ گذشتہ پیش کردہ عبارتوں میں دی گئی توضیحات کی بنا پر ایسے نظریہ سے سازگار نہیں ہے۔

۵۔آیات قرآن نہ صرف روح کے وجود پر دلالت کرتی ہیں بلکہ انسان کی موت کے بعد بقاء واستقلال کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔

۶۔روح کا وجود واستقلال بھی آیات قرآن کے علاوہ عقلی دلیلوں اور تجربی شواہد سے ثابت ہے۔

تمرین

اس فصل سے مربوط اپنی معلومات کو مندرجہ ذیل سوالات و جوابات کے ذریعہ آزمائیں، اگران کے جوابات میں مشکلات سے دوچار ہوں تو دوبارہ مطالب کو دہرائیں:

۱۔ ''انسان کی خلقت'' کوقرآن کی تین آیتوں سے واضح کیجئے؟

۲۔ انسان کے دو پہلو ہونے سے مراد کیا ہے؟

۳۔ مندرجہ ذیل موارد میں سے کون سا مورد، ڈارون کے نظریہ ''اقسام کی علت'' انسان کے ضروری تکامل کے مطابق ہے؟

الف: حضرت آدمؑ کی مخصوص خلقت کو بیان کرنے والی آیات کی توجیہ کریں۔

ب : انسان کے اندر، ذاتی کرامت وشرافت نہیں ہے۔

ج : جس جنت میں حضرت آدمؑ خلق ہوئے وہ زمین ہی کا کوئی باغ ہے۔

د :جناب آدمؑ کا نازل ہونا اوران کے سامنے فرشتوں کا سجدہ کرنا ایک عقیدتی مسئلہ ہے۔

۴۔ جو حضرات بالکل روح انسان کے منکر ہیں من جملہ حوادث میں فکر کی قدرت حافظہ اورتصورات وغیرہ کی کس طرح توجیہ کرتے ہیں اورانہیں کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟

۵۔ روح وجسم کے درمیان پانچ قسم کے رابطہ کا ذکر کریں اور ہر ایک کے لئے مثال پیش کریں؟

۶۔ آپ کے اعتبار سے کون سی آیت بہت ہی واضح روح کے وجود واستقلال کو بیان کرتی ہے؟اور کس طرح؟

۷۔ روح انسانی سے انکار کے غلط اثرات کیا ہیں؟

۸۔ انسان وحیوان کے درمیان مقام ومرتبہ کا فرق ہے یا نوع وماہیت کا فرق ہے؟

۹۔ لیزری ڈیسکیں اور مانیٹر پر ان کی اطلاعات کی نمائش، آیات صغیر پر کبیر کے انطباقی مصادیق وموارد میں سے ہے؟

۱۰۔ ہم میں سے ہر ایک مخصوص زمانے اور جگہ پر خلق ہوا ہے اور مطالب کو بھی مخصوص موقع ومحل میں درک کرتا ہے، تو کیا یہ بات روح اور روحی حوادث کے زمان ومکان سے محدود ہونے کی علامت نہیں ہے؟

۱۱۔ جسم وجسمانی حوادث اور روح وروحانی حوادث کی خصوصیات کیا ہیں؟

مزید مطالعہ کے لئے

ا۔انسان کی خلقت میں علم و دین کے نظریات کے لئے ، ملاحظہ ہو:

۔البار،محمد علی، خلق الانسان بین الطب و القرآن، بیروت......

۔بوکائی، موریس (۱۳۶۸) مقایسہ ای تطبیقی میان تورات، انجیل، قرآن و علم ترجمہ، ذبیح اللہ دبیر، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی۔

۔سبحانی، جعفر (۱۳۵۲) بررسی علمی ڈارویزم، تہران، کتابخانہ بزرگ اسلامی۔

۔سلطانی نسب، رضا، وفرہاد گرجی (۱۳۶۸) جنین شناسی انسان (بررسی تکامل طبیعی و غیر طبیعی انسان) تہران: جہاد دانشگاہی۔

۔شاکرین، حمید رضا قرآن و روان شناسی، حوزہ و دانشگاہ کے مجلّہ سے منقول سال دوم شمارہ ۸۔

شکر کن، حسین، و دیگران (۱۳۷۲) مکتبھای روان شنای و نقد آن ۔ ج ۲، تہران: سمت، دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ۔

۔محمد حسین طباطبائی (۱۳۶۹) انسان از آغاز تا انجام، ترجمہ و تعلیقات: صادق لاریجانی آملی، تہران: الزہرا۔

۔(۱۳۵۹) فرازہایی از اسلام، تہران، جہان آرا۔

۔(۱۳۶۱) آغاز پیدایش انسان، تہران: بنیاد فرہنگی امام رضاؑ۔

۔قراملکی، فرامرز (۱۳۷۳) موضع علم و دین در خلقت انسان، تہران: موسسہ فرہنگی آرایہ۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم، موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۶۸) مجموعۂ آثار، ج ۱، تہران: صدرا۔

۔مکارم شیرازی، ناصر، ڈارونیزم کے بارے میں بحث و تحقیق و تحلیل اور تکامل کے بارے میں جدید نظریات۔قم: نسل جوان۔

۔مہاجری، مسیح (۱۳۶۳) تکامل از دیدگاہ قرآن، تہران، دفتر نشر فرہنگی اسلامی۔

واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان در اسلام۔تہران: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (سمت)

اس فصل میں مذکورہ تفصیلی کتابیں۔

۲۔کلمہ نفس و روح کے سلسلہ میں، اس کے اصطلاحی معانی و استعمالات اور خداوند عالم سے منسوب روح سے مراد کے لئے۔ملاحظہ ہو:

۔حسن زادہ آملی، حسن، معرفت نفس، دفتر سوم، ص ۴۳۷۔۴۳۸۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم، موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ ص ۳۵۶۔۳۵۷ و اخلاق در قرآن ج ۲ ص ۲۰۰ سے ۲۰۸ تک۔

۳۔روح انسان اور نفس و بدن یا روح و جسم کے رابطہ میں مختلف نظریات کے لئے ملاحظہ ہو:

۔بہشتی، محمد (۱۳۷۵) "کیفیت ارتباط ساحتہای وجود انسان" مجلّہ حوزہ و دانشگاہ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، شمارہ نہم، ص ۲۹۔۳۷۔

۔دیونای، امیر (۱۳۷۶) حیات جاودانہ۔پژوہشی در قلمرو معاد شناسی، قم معاونت امور اساتید و دروس معارف اسلامی۔

۔رؤف، عبید (۱۳۶۳) انسان روح است نہ جسد، ترجمہ زین العابدین کاظمی خلخالی، تہران: دنیای کتاب۔

۔شکرکن، حسین و دیگران (۱۳۷۲) مکتبہای روان شناسی و نقد آن ۔ تہران ۔ دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ (سمت) ص ۲۰۶، ۲۰۷و ۳۶۹، ۳۸۶)۔

۔غروی، سید محمد (۱۳۷۵) ''رابطہ نفس وبدن'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، شمارہ نہم ص ۸۴ تا ۸۸۔

۔واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان در اسلام، تہران: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (سمت)۔

۵

انسان کی فطرت

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔انسان کی مشترکہ فطرت سے مراد کیا ہے وضاحت کریں؟

۲۔دینی اعتبار سے انسان کے مشترکہ عناصر کا بنیادی پہلو بیان کریں؟

۳۔انسانی مشترکہ فطرت کے وجود پر دلیلیں پیش کریں؟

۴۔انسان کی تین مشترکہ فطرت کی خصوصیات کے نام بتائیں اور ہر ایک کے بارے میں مختصر وضاحت پیش کریں؟

۵۔ان آیات وروایات کے مضامین جو انسان کی مشترکہ فطرت کے وجود کی بہت ہی واضح طور پر تائید کرتی ہیں بیان کیجئے؟

۶۔توحید کے فطری ہونے کے باب میں مذکورہ تین احتمال بیان کریں؟

۷۔سورۂ روم کی آیت نمبر ۳۰ کا ذکر کریں اور اس آیت کی روشنی میں فطرت کے زوال ناپذیر ہونے کی وضاحت کریں؟

اپنے اور دوسروں کے بارے میں تھوڑی سی توجہ کرنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے اور ہم جیسے دوسرے افراد کے عادات واطوار نیز ظاہری شکل وشمائل کے درمیان اختلاف کے باوجود ایک دوسرے میں جسم وروح کے لحاظ سے بہت زیادہ اشتراک ہے، اپنے اور دوسروں کے درمیان موجودہ مشترک چیزوں میں غور وفکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشترک علت کبھی تو ہمارے اور بعض لوگوں کے درمیان یا انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان ہے۔ مثال کے طور پر زبان، رنگ، قومیت، آداب ورسوم، افعال، قد کا زیادہ اور کم ہونے وغیرہ میں اشتراک ہے۔ اور کبھی یہ امور سبھی افراد میں نظر آتے ہیں جیسے حواس پنجگانہ رکھنا، قد کا سیدھا ہونا، خدا کا محتاج ہونا، جستجو کی حس، حقیقت کی خواہش اور آزاد خیال ہونا وغیرہ۔

مشترک کی پہلی قسم، بعض افراد میں نہ ہونے کی وجہ سے انسان کی فطری اور ذاتی چیزوں میں شمار نہیں ہو سکتی ہے لیکن مشترک کی دوسری قسم میں غور وفکر سے مندرجہ ذیل اہم اور بنیادی سوالات ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ گذشتہ فصل کے مباحث کی روشنی میں ان مشترکہ امور کا انسان کی واقعی حقیقت اور ذات سے کیا رابطہ ہے؟ کیا یہ سبھی مشترکہ چیزیں انسان کی ذات سے وجود میں آتی ہیں؟

۲۔ ذاتی مشترک چیزوں کی خصوصیات کیا ہیں اور غیر ذاتی چیزوں سے ذاتی مشترک چیزوں (انسان کی مشترکہ فطرت) کی شناخت کا ذریعہ کیا ہے؟

۳۔ انسان کے مشترکہ اسباب اس کی زندگی میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

۴۔ ان ذاتی مشترک چیزوں کی قسمیں یا مصادیق و موارد کیا ہیں؟

۵۔ انسان کی شخصیت اور بناوٹ اول الٰہی فطرت سے ذاتی مشترکہ چیزیں کیا رابطہ رکھتی ہیں۔

۶۔ کیا انسان ان ذاتی مشترکہ چیزوں کی بنا پر خیر خواہ اور نیک مخلوق ہے یا پست و ذلیل مخلوق ہے یا ان دونوں کا مجموعہ ہے؟

ان سوالات کے جوابات کا معلوم کرنا وہ ہدف ہے جس کے مطابق یہ فصل (انسان کی فطرت کے عنوان سے) مرتب ہوئی ہے۔[۱]

انسان کی مشترکہ فطرت

انسان کی فطرت کے بارے میں گفتگو کو انسان شناسی کے اہم ترین مباحث میں سے ایک سمجھا جاسکتا ہے، جو جاری چند صدیوں میں بہت سے مفکرین کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہے۔

یہ مسئلہ متعدد و مختلف تعریفوں کو پیش کرنے کے باوجود ایک معتبر و متقن طریقۂ معرفت کے نہ ہونے اور ذات انسان کے پر اسرار و مخفی ہونے کی وجہ سے بہت سے دانشوروں کی حیرت و پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض جیسے ''پاسکل'' کو مجبور ہونا پڑا کہ انسان کی فطرت اور ذات کی معرفت کو غیر ممکن سمجھے [۲] اور بعض لوگوں کی اس گمان کی طرف رہنمائی کی ہے کہ

---

[۱] اس بحث کو حجت الاسلام احمد واعظی زید عزہ نے آمادہ کیا ہے جو تھوڑی اصلاح اور اضافہ کے ساتھ معزز قارئین کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے۔

[۲] پاسکل ان جملہ لوگوں میں سے ہے جو معتقد تھا کہ انسان کی معرفت کی عام راہیں کسی وقت بھی انسان کے سلسلہ میں صحیح معلومات فراہم نہیں کرسکتی ہیں۔ اور دین جو انسان کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے وہ بھی انسان کو مزید پر اسرار بنا دیتا ہے اور اس کو خداوند عالم کی طرح پوشیدہ اور مرموز کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو: کیسیر ر: آرنسٹ، فلسفہ و فرہنگ، ص ۳۴ و ۳۶۔

انسانوں کے درمیان مشترکہ فطرت وذات کے وجود کے منکر ہوں[1] مثال کے طور پر ''جوزارٹگا''[2] اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ ''فطری علوم، حیات انسانی کی حیرت انگیز حقیقت کے مقابلہ میں متحیر ہیں۔ انسان سے پردۂ اسرار کے نہ ہٹنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان کوئی چیز نہیں ہے اور انسان کی فطرت کے بارے میں گفتگوں کرنا کذب محض ہے۔ فطرت وطینت نامی کوئی بھی چیز انسان میں نہیں ہے''۔[3]

بہتر یہ ہوگا کہ انسان کی مشترکہ فطرت کی نفی یا اثبات کی دلیلوں کو پیش کرنے سے پہلے مشترکہ فطرت وطینت کے مقصود کو واضح کیا جائے۔

---

[1] ڈورکیم کی طرح معاشرہ کو اصل سمجھنے میں انتہا پسندی کرنے والے اور ژان پل سارٹر کی طرح عقیدہ وجود رکھنے والے اور فرڈریچ ہیگل (Georg Wilhelm Frendrich Hegel) کی طرح عقیدۂ تاریخ رکھنے والے نیز ریچارڈ پالمر (Richard Palmer) وغیرہ ان جملہ لوگوں میں سے ہیں جو مورد نظر معانی میں انسان کی مشترکہ فطرت کے منکر ہیں۔ ملاحظہ ہو: اسٹیونسن، لسلی ہفت نظریہ درباب انسان، ص ۱۳۶۔۱۳۸۔ محمد تقی مصباح، جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن، سازمان تبلیغات اسلامی تہران ۱۳۶۸، ص ۴۷ و ۴۸۔

[2] Cjose Ortega Y Gasset.

[3] کیسیرر، ارنسٹ، گذشتہ حوالہ، ص ۲۴۲۔

مشترکہ فطرت سے مراد[1]

حیوان کی مختلف اقسام میں مشترکہ جہتیں اور خصوصیات ہوتی ہیں۔فطری چیزوں کا وجود جیسے نفس کو بچانا اور حفاظت کرنا اور تولید نسل کرنا وغیرہ ان کی مشترکہ فطرت پر دلالت کرتی ہے۔اس لئے کہ یہ فطری چیزیں سبھی حیوانوں کے درمیان مشترک ہیں لیکن حیوان کا ہر فرد ان مشترکہ فطرت کے علاوہ اپنے مطابق صفات وکردار کا بھی مالک ہوتا ہے، چونکہ حیوانوں کے اندر نفوذ کرکے ان کی ذاتیات کو کشف کرنا انسان کے لئے خیال وگمان کی حد سے زیادہ میسر نہیں ہے، لہٰذا بیرونی اعمال جیسے گھر بنانے کا طریقہ، غذا حاصل کرنا، نومولود کی حفاظت، اجتماعی یا فردی زندگی گذارنے کی کیفیت اور اجتماعی زندگی میں تقسیم کار کی کیفیت کے ردعمل کی بنیاد پر حیوان کی ایک فرد کو دوسری فرد سے جدا کیا جا سکتا ہے، مذکورہ خصوصیات کو حیوانوں کی فطرت وطینت کے فرق و تبدیلی کی وجہ سمجھنا چاہیئے۔

انسان کا اپنی مخصوص فطرت وطینت والا ہونے سے مراد یہ بات ثابت کرنا نہیں ہے کہ انسان سبھی حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے اور حیوانوں کی ہی قسموں میں سے ہر ایک کی طرح یہ نوع بھی اپنا مخصوص امتیاز رکھتا ہے، بلکہ مقصود اس نکتہ کا ثابت کرنا ہے کہ انسان حیوانی فطرت کے

---

[1] کلمہ ''فطرت انسان'' کے مختلف و متنوع استعمالات ہیں: مالینوفسکی کی طرح مفکرین اس کو مادی ضرورتوں میں منحصر کردیتے ہیں۔کولی کی طرح بعض دوسرے مفکرین ''اجتماعی فطرت'' خصوصاً اجتماعی زندگی میں جو احساسات اور جذبات ابتدائی معاشرے میں ہوتے ہیں بیان کرتے ہوئے متعدد فطرت وسماج پر یقین رکھتے ہیں، بعض نے اجتماعی فطرت کو ابتدائی گروہ (جیسے خاندان) اور سماجی طبیعت واجتماعی کمیٹیوں سے وجود میں آنے کے بارے میں گفتگو کی ہے، وہ چیز جو ان نظریات میں معمولاً غفلت کا سبب واقع ہوتی ہے وہ انسان کی مخصوص اور بلند وبالا فطرت ہے جو انسان وحیوان کے مشترکہ اور اس کی مادی ودنیاوی ضرورتوں سے بلند وبالا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اس بحث میں شدید مورد توجہ واقع ہوئی ہے۔

علاوہ بعض مشترکہ خصوصیات کا مالک ہے۔ حیوانی وکسبی چیزوں کے بجائے مشترکہ خصوصیات کا مقام جستجو، فہم خواہشات اور انسان کی توانائی ہے، اگر ہم یہ ثابت کر سکے کہ انسان، مخصوص فہم و معرفت یا خواہشات و توانائی کا مالک ہے جس سے سبھی حیوانات محروم ہیں تو ایسی صورت میں انسان کی خصوصیت اور حیوانیت سے بالاتر مشترکہ فطرت ثابت ہو جائے گی۔[1]

مشترکہ فطرت کی خصوصیات

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کی مشترکہ فطرت کی پہلی خصوصیت اس کا حیوانیت سے بالاتر ہونا ہے اس لئے کہ میلان ورجحانات اور فکر و غور وخوض حیوانوں میں پایا ہی نہیں جاتا ہے مثال کے طور پر نتیجہ اور استدلال کی قدرت اور مرتبہ پسندی یا کم از کم انسان کے اندر وسعت کے مطابق ہی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں جو باقی حیوانوں میں نہیں ہوتی ہیں مثال کے طور پر گرچہ حیوانات بھی معلومات رکھتے ہیں لیکن حیوانوں کی معلومات انسانوں کی معلومات کے مقابلہ میں نہ ہی اس میں وسعت ہے اور نہ ہی ظرافت و تعمق جیسے صفات کی حامل ہے، اسی وجہ سے انسان اور حیوان میں معلومات کے نتائج و آثار بھی قابل موازنہ نہیں ہیں، علم وٹکنالوجی انسان سے مخصوص ہے۔ مشترکہ فطرت کی دوسری خصوصیت، حضوری فطرت ہے۔ تعلیم و تعلم اور دوسرے اجتماعی عوامل اور مشترکہ

---

[1] فصل اول میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انسان اور اس کی خصوصیات کی معرفت کے لئے چار طریقوں عقل تجربہ، شہود اور وحی سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے درمیان طریقہ وحی کو مذکورہ خصوصیات کی روشنی میں دوسری راہوں پر ترجیح حاصل ہے اگرچہ ہر راہ وروش اپنے مخصوص مواقع پر نتیجہ بخش ہے، فطرت انسان کی شناخت میں بھی یہ مسئلہ منکرین کے لئے مورد توجہ رہا ہے اور انہوں نے اس مسئلہ میں بحث و تحقیق بھی کی ہے۔ جو کچھ پہلی فصل میں بیان ہو چکا ہے وہ ہمیں مزید اس مسئلہ میں گفتگو کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے: ملاحظہ ہو، از رائل شفلر، در باب استعداد ہای آدمی، گفتاری در فلسفہ تعلیم و تربیت، دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، سمت، ۱۳۷۷ تہران: ص ۱۶۳۔

فطرت کے عناصر کی پیدائش میں ماحول کا کوئی کردار نہیں ہے اسی بنا پر یہ عناصر انسان کے تمام افراد میں ہر ماحول واجتماع اور تعلیم تعلم میں (چاہے شدت وضعف اور درجات متفاوت ہوں) وجود رکھتے ہیں۔

انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر کی تیسری خصوصیت، لازوال ہونا ہے انسان کی مشترکہ فطرت چونکہ اس کی انسانیت کی ابتدائی حقیقت وشخصیت کو تشکیل دیتی ہے لہٰذا انسان سے جدا اور الگ نہیں ہوسکتی اور فرض کے طور پر اگر ایسے افراد ہوں جو ان عناصر سے بے بہرہ ہوں یا بالکل کھو چکے ہوں ان کی حیثیت حیوان سے زیادہ نہیں ہے اور ان کا شمار انسان کی صفوں میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی تو بعض عناصر کے نابود ہو جانے سے اس کی دائمی زندگی مورد سوال واقع ہو جاتی ہے مثال کے طور پر جو قدرت عقل ودانائی سے دور ہو یا عقل ہی نہ رکھتا ہو وہ گرچہ ظاہری شکل وصورت رفتار وکردار میں دوسرے انسانوں کی طرح ہے لیکن در حقیقت وہ حیوانی جہت سے اپنی زندگی گذار رہا ہے اور اس سے انسانی سعادت سلب ہو چکی ہے، مذکورہ خصوصیات میں سے ہر ایک انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر کی معرفت کے لئے معیار ہیں اور ان خصوصیات کا انسان کے ارادے اور رجحانات، فکری توانائی اور بینش کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ ارادے فکری توانائی اور بینش، انسانی فطرت کا حصہ ہیں۔

ماحول اور اجتماعی اسباب کا کردار

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر روز خلقت ہی سے تمام انسانوں کے اندر عطا کر دیئے گئے ہیں جن کو ماحول اور اجتماعی عوامل نہ ہی مہیا کر سکتے ہیں اور نہ ہی نابود کر سکتے ہیں۔ مذکورہ عوامل انسان کی فطرت میں قدرت وضعف یا رہنمائی کا کردار ادا کرتے ہیں مثال کے طور پر حقیقت کی طلب اور مقام ومنزلت کی خواہش فطری طور پر تمام انسانوں میں

موجود ہے البتہ بعض افراد میں تعلیم و تعلم اور ماحول و اجتماعی اسباب کے زیر اثر پستی پائی جاسکتی ہے یا بعض افراد میں قوت و شدت پائی جاسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں فطری خواہش کے خاص اہداف کے تحت مورد استفادہ واقع ہوں جو تعلیم و تربیت اور فردی و اجتماعی ماحول کی وجہ سے وجود میں آئے ہوں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مشترکہ فطرت کے ذاتی اور حقیقی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے سبھی عناصر فعلیت اور تکامل سے برخوردار ہیں بلکہ انسانوں کی مشترکہ فطرت کو ایسی قابلیت اور توانائی پر مشتمل سمجھنا چاہیئے جو وقت کے ساتھ ساتھ اور بیرونی شرائط کے فراہم ہوتے ہی استعمال اور انجام پاتے ہیں، یہ نکتہ ایک دوسرے زاویہ سے بعض مشترکہ فطری عناصر پر ماحول اور اجتماعی توانائی کے اسباب کے تاثرات کو بیان و واضح کرتا ہے۔

انسانی مشترکہ فطرت پر دلائل

یہ ہم بتا چکے ہیں کہ انسان کی مخصوص خلقت اور حیوانیت سے بالاتر گوشوں کو اس کی فہم خواہش اور توانائی، تین پہلوؤں میں تلاش کرنا چاہیئے اور یہ جستجو دینی متون اور عقل و تجربہ ہی کی مدد سے ممکن ہے پہلے تو ہم غیر دینی طریقوں اور بغیر آیات و روایات سے استفادہ کرتے ہوئے انسانوں کی مشترکہ فطرت کو مورد تحلیل و تحقیق قرار دیں گے اور آخر میں دینی نظریہ سے یعنی دین کی نگاہ میں انسانوں کی مشترکہ فطرت (الٰہی فطرت) کے مرکزی عنصر کو آیات و روایات کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل کریں گے۔

انسانوں کی مشترکہ فطرت کے وجود پر پہلی دلیل یہ ہے کہ انسان ایک مخصوص فہم و معرفت کا مالک ہے، انسان اس فہم و ادراک کی مدد سے قیاس اور نتیجہ اخذ کرتا ہے اور اپنی گذشتہ معلومات کے ذریعہ نئی معلومات تک پہنچتا ہے۔ انسان کا نتیجہ حاصل کرنا، عقلی ادراک اور قواعد و

اصول پر استوار ہے، مثال کے طور پر "نقیضین کا جمع ہونا محال ہے نقیضین کا رفع بھی محال ہے سلب الشئ عن نفسہ ممکن نہیں ہے، کسی شئ کا اپنے آپ پر مقدم ہونا محال ہے" یہ ایسے قضایا ہیں جن کو اصول وقواعد کا نمونہ سمجھا جانا چاہیے، یہ قضایا فوراً فہم وحواس کے ادراک میں نہیں آتے ہیں بلکہ بشر کی اس طرح خلقت ہوئی ہے کہ اس کے ذہن کے آمادہ ہونے کے بعد یعنی جب اس کے حواس فعال ہوں اور اس کے لئے تصورات کے اسباب فراہم ہوں تو دھیرے دھیرے اس کی ذہنی قابلیت رونما ہوگی اور اس طرح سے بدیہی قضایا حاصل ہوں گے۔ ان بدیہی قضایا کی مدد سے انسان کا ذہن اپنی تصدیقات اور مقدمات کو مختلف شکل وصورت میں مرتب کرتا ہے اور اقسام قیاس کو ترتیب دیتے ہوئے اپنی معلومات حاصل کر لیتا ہے، ایسی بدیہی معلومات کو "ادراکات فطری" کہتے ہیں، اس معنی میں کہ انسان فطری اور ذاتی طور پر اس طرح خلق ہوا ہے کہ حواس کے بے کار ہونے کے بعد بھی خود بخود ان ادراک کو حاصل کر لیتا ہے، اس طرح نہیں جیسا کہ مغرب میں عقل کو اصل ماننے والے "ڈیکارٹ" اور اس کے ماننے والوں کا نظریہ ہے کہ ادراکات بغیر کسی حواس ظاہری وباطنی سرگرمی کے انسان کی طبیعی فطرت میں ہمیشہ موجود ہیں۔

انسان کے اخلاق وکردار کی معرفت بھی مشترکہ فطرت کے اثبات کے لئے موافق ماحول فراہم کرتی ہے، فردی تجربہ وشواہد اور بعض مشترکہ اخلاقی عقائد کا گذشتہ افراد کے اعمال میں تاریخی جستجو، مثال کے طور پر عدالت اور وفاداری کا اچھا ہونا، ظلم اور امانت میں خیانت کا برا ہونا وغیرہ کو بعض مفکرین مثال کے طور پر "ایمانویل کانٹ" صرف عملی عقل کے احکام کی حیثیت سے مانتے ہیں اور کبھی اس کو "حسِ اخلاقی" یا "اخلاقی ضمیر" سے تعبیر کرتے ہیں اس نظریہ کے مطابق تمام انسان ایک مخصوص اخلاقی صلاحیت رکھتے ہیں جو نکھرنے کے بعد بدیہی اور قطعی احکام بن جاتے ہیں۔

البتہ ان اخلاقی احکام کا صرف ''عملی عقل'' نامی جدید قوت، نیز ''ضمیر یا اخلاقی حس'' سے منسوب ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسی عقل کا کام ہوسکتا ہے جو نظری امور کو حاصل کرتی ہے بہر حال جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذاتی اور نظری طور سے ان اہم قضایا اور احکام کا مالک ہے۔

مشترکہ فطرت کے وجود کی دوسری دلیل، انسانوں کے درمیان حیوانیت سے بالا تمنا اور آرزوؤں کا وجود ہے۔ علم پسندی اور حقیقت کی تلاش، فضیلت کی خواہشات، بلندی کی تمنا خوبصورتی کی آرزو، ہمیشہ باقی رہنے کی خواہش اور عبادت کا جذبہ یہ ساری چیزیں حقیقی ہیں کہ جن کو فطری خواہشات کے نمونے ہیں اور ان کے حقیقی اور فطری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کی روح ان خواہشات کے ہمراہ ہے اور یہ ہمراہی بیرونی اسباب اور تربیت، معاشرہ اور ماحول کے تصادم سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ یہ انسانی روح کی خاصیت ہے اور ہر انسان فطری طور پر (خواہ بہت زیادہ ضعیف اور پوشیدہ طور پر ہو) ان خواہشات سے بہرہ مند ہے۔

اور جیسا کہ بیان ہوا ہے کہ ان کے استعمال اور ان کی نشو ونما میں بیرونی عوامل اسباب و علل بھی ان خواہشات کی کمی اور زیادتی میں دخیل ہیں لیکن ان کی تخلیق اور حقیقی خلقت میں موثر نہیں ہیں مثال کے طور پر انسان کی فطری خواہش کا جاننا، آگاہ ہونا اور دنیا کے حقائق کو معلوم کرنا صغرسنی ہی کے زمانے سے عیاں ہوتی ہے اور یہ چیز انسان سے آخری لحات تک سلب نہیں ہوتی ہے، ذہن انسانی کی مختلف قوتیں اور طاقتیں اس فطری خواہش کی تسکین کے لئے ایک مفید وسیلہ ہیں۔

فطری خواہشات کا ایک اور نمونہ خوبصورتی کی خواہش ہے جو انسان کی فطرت وذات سے تعلق رکھتی ہے پوری تاریخ بشر میں انسان کی تمام نقاشی کی تخلیقات اسی خوبصورت شناسی کے حس کی وجہ سے ہے البتہ خوبصورت چیزوں کی تشخیص یا خوبصورتی کی تعریف میں نظریاتی اختلاف ہونا اس کی طرف راغب ہونے کی حقیقت سے مانع نہیں ہوتی ہے۔

مشترکہ فطرت کی تیسری جستجو خود انسان کی ذاتی توانائی ہے، معتبر علامتوں کے ذریعہ سمجھنا اور سمجھانا، زبان سیکھنے کی توانائی، عروج و بلندی کے اعلیٰ تک رسائی اور تہذیب نفس وغیرہ جیسی چیزیں انسان کی وہ جملہ قوتیں ہیں جو مشترکہ فطری عناصر میں شمار ہوتی ہیں اور روز ولادت سے ہی انسان کے ہمراہ ہیں، اور دوسرے عوامل صرف قوت وضعف میں ان کی ترقی و رشد کا کردار ادا کرتے ہیں، یہ قوتیں بھی انسان کی مشترکہ فطرت کے وجود کی دلیل ہیں۔[1] معارف اور خواہشات کے پائے جانے کے سلسلہ میں انسان کی آئندہ مشترکہ توانائی کے وجود کی آیات و روایات میں بھی تائید و تاکید ہوئی ہے مثال کے طور پر آیہ فطرت جس کے بارے میں آئندہ بحث کریں گے اور وہ آیات جو انسانوں کی مشترکہ فطری شناخت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور آیہ شریفہ ﴿وَنَفسٍ وَمَا سَوّٰیھا فَاَلھَمَھَا فُجُورَھَا وَتَقوٰیھا﴾[2] قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی کہ جس نے اسے درست کیا پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری کو الہام کے ذریعہ اس تک پہنچایا) مشترکہ اخلاقی اور اعتباری فطرت کی تائید کرتی ہے اور بہت سی آیات انسان کو انسانیت کے بلند ترین مرتبہ تک پہنچنے میں کوشش اور ختم نہ ہونے والے کمال کے حصول کی دعوت دیتی ہیں اور ضمنی طور پر اس راہ میں گامزن ہونے کے لئے انسان کی ذاتی قدرت کو مورد توجہ قرار دیتی ہیں۔

---

[1] گذشتہ فصل میں ہم انسان شناسی کی ضرورت واہمیت کے عنوان سے انسانی علوم میں انسانوں کے مشترکہ عقیدہ کو بیان کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں انسان کی مشترکہ فطرت کے آثار وعقائد پر بحث کرنے سے صرف نظر کرتے ہوئے اس نکتہ کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں کہ انسانی اور بین الاقوامی اقتصادی حقوقی تربیتی واخلاقی اور ہر قسم کا نظام، انسان کی مشترکہ فطرت کی قبولیت سے وابستہ ہے اور انسانی مشترکہ فطرت کے انکار کی صورت میں یہ نظام بے اہمیت ہو جائیں گے۔

[2] سورۂ شمس، آیت: ۷و۸۔

فطرت [1]

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ آیات و روایات میں وہ مطالب بھی مذکور ہیں جو وضاحت کے ساتھ یا ضمنی طور پر انسان کی مخصوص حقیقت، مشترکہ فطرت اور معرفت کی راہ میں اس کے خصوصی عناصر نیز خواہشات اور قدرت کے وجود پر دلالت کرتے ہیں لیکن وہ چیز جس کی آیات و روایات میں بہت زیادہ تاکید و تائید ہوئی ہے وہ فطرت الٰہی ہے اور اس حقیقت پر بہت ہی واضح دلالت کرنے والی، سورۂ روم کی تیسویں آیت ہے۔

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾

تو تم باطل سے کترا کے اپنا رخ دین کی طرف کئے رہو، یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔

یہ آیت انسان میں فطرت الٰہی کے وجود پر دلالت کرتی ہے یعنی انسان ایک ایسی فطرت، سرشت اور طبیعت کے ہمراہ خلق ہوا ہے کہ جس میں دین قبول کرنے کی صلاحیت ہے لہٰذا انبیاء علیہم السلام خداوند عالم کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف انسانوں کو دعوت دینے کے سلسلہ میں کسی بے توجہ مخلوق سے مخاطب نہیں تھے بلکہ انسان کی فطرت اور ذات میں توحید کی طرف میلان اور کشش پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان ذاتی طور پر خدا سے آشنا ہے، اس آیت کے علاوہ بعض روایات میں بھی انسان کے اندر الٰہی فطرت کے وجود کی وضاحت ہوئی ہے۔

امام محمد باقرؑ نے پیغمبرؐ سے منقول روایت کی وضاحت میں فرمایا ہے کہ آنحضرت نے

---

[1] کلمہ فطرت، لغت میں کسی شئی کی خلقت کی کیفیت کے معنی میں آیا ہے اور اصطلاح کے اعتبار سے مفکرین کے درمیان متعدد استعمالات ہیں جن کو ضمیمہ میں اشارہ کیا جائے گا۔

فرمایا: "کُل مَولودٍ یُولدُ علیٰ الفِطرَة "[1] ہر بچہ توحیدی فطرت پر متولد ہوتا ہے" پھر آپ نے فرمایا: "یعنِی المَعرفَة بِانَّ اللہ عَزّ وجلّ خَالقُه" مراد پیغمبرؐ یہ ہے کہ ہر بچہ اس معرفت و آ گاہی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ اس کا خالق ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ "کَلمۃُ الاِخلاص ھِی الفِطرَة"[2] خداوند عالم کو سمجھنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

بعض مشترکہ فطری عناصر کا پوشیدہ ہونا

معرفت شناسی سے مرتبط مباحث میں اسلامی حکماء نے ثابت کیا ہے کہ انسان کی فکری معرفت اس کی ذات کے اندر ہی پوشیدہ اور قابلیت کے طور پر موجود ہے اور مرور ایام سے وہ ظاہر ہوتی ہے۔ دینی متون کے اعتبار سے سبھی انسان اپنی پیدائش کے وقت ہر قسم کے ادراک اور علم سے عاری ہوتا ہے۔

﴿وَاللّٰہُ أخرَجکُم مِّن بُطُونِ أُمَّھَاتِکُم لاتَعلَمُونَ شَیئاً وَجَعَلَ لَکُم السَّمعَ وَالأبصَارَ وَالأفئِدَۃَ لَعَلَّکُم تَشکُرُونَ﴾[3]

اور خدا ہی نے تم کو ماؤں کے پیٹ سے نکالا جب کہ تم بالکل ناسمجھ تھے اور تم کو سماعت، بصارت اور دل عطا کیئے تا کہ تم شکر کرو۔

ممکن ہے کہ یہ وہم پیدا ہو کہ اس آیت کا مفہوم انسان کے پیدا ہونے کے وقت ہر طرح کی معرفت سے عاری ہونا ہے، لہٰذا یہ خداوند عالم کی حضوری و فطری معرفت کے وجود سے سازگار نہیں ہے، لیکن جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ مذکورہ آیت انسان کی خلقت کے وقت

---

[1] کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ج ۲ ص ۱۳۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۰۔ [3] سورہ نحل ۷۸۔

تمام اکتسابی علوم کی نفی کرتی ہے لیکن یہ امکان ہے کہ انسان سے علم حضوری کے وجود کی نفی نہ کرتی ہو، اس مطلب کی دلیل یہ ہے کہ کان اور قلب کو انسان کی جہالت برطرف کرنے والے اسباب کے عنوان سے نام لیا ہے اس لئے کہ اکتسابی علم میں ان اسباب کی ضرورت ہے، گویا آیت خلقت کے وقت آنکھ کان اور دوسرے حواس سے حاصل علوم کی نفی کرتی ہے لیکن انسان سے حضوری علوم کی نفی نہیں کرتی ہے۔

تقریباً یہ بات اتفاقی ہے کہ انسان کے اندر موجودہ فطری اور طبیعی امور چاہے وہ انسان کے حیوانی پہلو سے مرتبط ہوں جیسے خواہشات اور وہ چیزیں جو اس کی حیوانیت سے بالاتر اور انسانی پہلو سے مخصوص ہوں خلقت کے وقت ظاہر اور عیاں نہیں ہوتے ہیں، بلکہ کچھ پوشیدہ اور مخفی صلاحیتیں ہیں جو مرور ایام سے دھیرے دھیرے نمایاں ہوتی رہتی ہیں جیسے کہ جنسی خواہش اور ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا، لہٰذا وہ چیز جس کی واضح طور پر تائید کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ فطری امور انسان کی خلقت کے وقت موجود رہتے ہیں، لیکن خلقت کے وقت ہی سے کسی بھی مرحلہ میں ان کے سرگرم ہونے کے دعوے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔[1]

---

[1] وہ چیزیں جو فطری امور کے عنوان سے مورد تحقیق واقع ہوچکی ہیں وہ انسان کی فطری و ذاتی خصوصیات تھیں۔ لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ فطری اوصاف کبھی انسانی خصوصیات کے علاوہ بعض دوسرے امور پر صادق آتے ہیں، مثال کے طور پر کبھی خود دین اور شریعت اسلام کے فطری ہونے کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی ہے اور اس سے مراد انسان کے وجودی کردار اور حقیقی کمال کی روشنی میں ان مفاہیم کی مناسبت و مطابقت ہے انسان کی فطری قابلیت و صلاحیت سے اسلامی تعلیمات اور مفاہیم شریعت کا اس کے حقیقی کمال سے مربوط ہونا نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی مختلف فطری اور طبیعی قوتوں کی آمادگی، ترقی اور رشد کے لئے ایک نسخہ ہے ''شریعت، فطری ہے'' اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اور اس کے واقعی اور فطری ضرورتوں میں ایک طرح کی مناسبت و ہماہنگی ہے، ایسا نہیں ہے کہ فطرت انسان میں دینی معارف واحکام بالفعل یا بالقوۃ پوشیدہ ہیں۔

انسان کی فطرت کا اچھا یا برا ہونا

گذشتہ مباحث سے یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے کہ ''سارٹر'' جیسے وجود پرست ''واٹسن''[1] جیسے کردار وسرگرمی کے حامی ''ڈورکھیم'' جیسے ''معاشرہ پرست'' اور ''جان لاک''[2] کی طرح بعض تجربی فلاسفہ کے اعتبار سے انسان کو بالکل معمولی نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو صرف غیر ذاتی عناصر و اسباب سے تشکیل ہوا ہے بلکہ انسان فکری اعتبار سے اور فطری عناصر میں طاقت وتوانائی کے لحاظ سے حیوان سے بالاتر مخلوق ہے۔ چاہے بعض عناصر یا بالفعل یا بالقوت ہوں یا ان کے بالفعل ہونے میں بیرونی اسباب اور عوامل کے کارفرما ہونے کی ضرورت ہو۔ جو لوگ انسان کو معمولی سمجھتے ہیں انہوں نے اصل مسئلہ کو ختم کر دیا اور خود کو اس کے حل سے محفوظ کر لیا، بہر حال تجربی اور عقلی دلائل، تعلیمات وحی اور ضمیر کی معلومات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ انسان بعض مشترکہ فطری عناصر سے استوار ہے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کی مشترکہ فطرت وطبیعت صرف نیک اور خیر خواہ ہے یا صرف پست وذلیل ہے یا خیر ونیکی اور پستی وذلت دونوں عناصر پائے جاتے ہیں؟

''فرویڈ'' کے ماننے والوں کی طرح بعض مفکرین ''تھامس ہابز''[3] کی طرح بعض تجربی فلاسفہ اور فطرت پرست، لذت پسند سود خور افراد انسان کی فطرت کو پست اور ذلیل سمجھتے ہیں'' اریک فروم'' جیسے فرویڈ کے جدید ماننے والے ''کارل روجرز''[4] اور ''ابراہیم مزلو''[5] کی طرح انسان پرست اور ''ژان ژاک روسو''[6] کی طرح رومینٹک افراد، انسان کی فطرت کو نیک اور خیر خواہ اور اس کی برائیوں کو نادرست ارادوں کا حصہ یا انسان پر اجتماعی ماحول کا ردعمل تصور کرتے ہیں۔[7]

۱۔ Watson   ۲۔ John Like   ۳۔ Thomas Hobbes

۴۔ Kart Rogers۔   ۵۔ Abraham Maslow

۶۔ Jean Jacques Rousseau.۔

۷۔ اسی فصل کے ضمیمہ میں ان نظریات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مذکورہ دونوں نظریوں میں افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے۔ انسان کی فطرت کوسراسر پست وذلیل سمجھنا اور ''ہابز'' کے بقول انسان کوانسان کے لئے بھیڑیا سمجھنا نیز اکثر انسانوں کی بلند پروازی کی تمنا اور عدالت پسندی کی طرح اعلی معارف کی آرزو، کمال پسندی اور الٰہی فطرت سے سازگار نہیں ہے، اور انسان کی تمام برائیوں کو افراد کے غلط ارادوں اور اجتماعی ماحول کی طرف نسبت دینا اور گذشتہ اسباب یا ہر علت کے کردار کا انکار کرنا بھی ایک اعتبار سے تفریط وکوتاہی ہے، یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ وجود شناسی کے گوشوں اور مسئلہ شناخت کی اہمیت کے درمیان تداخل نہیں ہونا چاہیۓ، وجود شناسی کی نگاہ سے انسان کی مشترکہ فطرت کے عناصر کا مجموعہ چونکہ امکانات سے مالامال اور بھرپور ہے لہٰذا کمال شمار ہوتا ہے اور منفی تصور نہیں کیا جاتا لیکن اہمیت شناسی کے اعتبار سے یہ مسئلہ ضروری ہے کہ ان امکانات سے کس چیز میں استفادہ ہوتا ہے؟ بدظن فلاسفہ اور مفکرین منفی پہلو کے مشاہدہ کی وجہ سے تفکر وتوانائی اور خواہشات کو ناپسندیدہ موارد میں استعمال کر کے انسان کو ایک پست اور بری مخلوق سمجھتے ہیں اور خوش فہم فلاسفہ اور مفکرین اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے انسان کی فلاح و بہبود کی راہ میں مشترکہ فطری عناصر کے پہلوؤں سے بہرہ مند ہو کر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جب کہ یہ شواہد انسان کی فطرت کے اچھے یا برے ہونے پر حتمی طور پر دلیل نہیں ہیں بلکہ ہر دلیل دوسرے کی نفی کرتی ہے۔

قرآن مجید انسان کی فطرت کو ایک طرف غور وفکر، خواہش اور توانائی کا مجموعہ بتاتا ہے جس میں سے اکثر کے لئے کوئی خاص مقصد نہیں ہے اگر چہ ان میں سے بعض مثال کے طور پر خداوند عالم کی تلاش، معرفت اور عبادت کے فطری ہونے کی طرف متوجہ ہیں اور دوسری طرف خلقت سے پہلے اور بعد کے حالات نیز اجتماعی وفطری ماحول سے چشم پوشی نہیں کرتے بلکہ منجملہ ان کی تاثیر کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں اور آگاہ انسان کے ہر ارادہ وانتخاب میں اثر انداز عنصر کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس لئے انسان کی مشترکہ فطرت کو ایسے عناصر کا مجموعہ تشکیل دیتے ہیں جن میں سے بعض فلاح و خیر کی طرف متوجہ ہیں، لیکن غلط تاثیر یا مشترکہ طبیعت سے انسان کی غفلت اور انسان کے کاموں میں تمام موثر عوامل کی وجہ سے یہ حصہ بھی اپنے ضروری ثمرات کھو دیتا ہے اور پیغمبران الٰہی کا بھیجا جانا، آسمانی کتابوں کا نزول، خداوند عالم کے قوانین کا لازم الاجراء ہونا اور دینی حکومت کی برقراری، یہ تمام چیزیں، انسان کو سرگرم رکھنے اور مشترکہ فطری عناصر کے مجموعہ سے آراستہ پروگرام سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں ہے، چاہے مقصد رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں، یا دوسرے اسباب کی وجہ سے ہوں اور انسان کی برائی غلط اثر اور غفلت کا نتیجہ ہے اور انسان کی اچھائی اور نیکی دینی اور اخلاقی تعلیمات کی روشنی میں دیدہ و دانستہ کردار کا نتیجہ ہے، آئندہ مباحث میں ہم اس آخری نکتہ کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے۔

سورۂ روم کی تیسویں آیت کے مفہوم کے سلسلہ میں زرارہ کے سوال کے جواب میں امام جعفر صادق نے فرمایا:

''فَطرھُم جَمِیعاً عَلیٰ التَّوحِیدِ''[1]

خداوند عالم نے سب کو فطرت توحید پر پیدا کیا ہے۔

توحید اور الٰہی فطرت کی وجہ سے انسان یہ گمان نہ کرے کہ فطری امور اس کے توحیدی اور الٰہی پہلو میں منحصر ہیں جیسا کہ انسان کی فطرت کے بارے میں گذشتہ مباحث میں اشارہ ہو چکا ہے کہ بہت سے فطری اور حقیقی معارف کو خواہشات کے سپرد کر دیا گیا ہے جو تمام مخلوقات سے انسان کے وجود کی کیفیت کو جدا اور مشخص کرتی ہے۔ انسان کے تمام فطری امور کے درمیان اور اس کی الٰہی فطرت کے بارے میں مزید بحث، اس عنصر کی خاص اہمیت اور الٰہی فطرت کے بارے میں مختلف سوالات کی وجہ سے ہے۔ ان دونوں چیزوں کی وجہ سے یہ فطری شیٔ مزید مورد توجہ واقع ہوئی ہے۔

---

[1] کلینی، گذشتہ حوالہ، ج:۲، ص:۱۲

انسانوں کے اندر الٰہی فطرت کے پائے جانے کا دعویٰ مختلف بحثوں کو جنم دیتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کے اندر الٰہی فطرت کے ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا فطرتِ معرفت مراد ہے یا فطرتِ انتخاب؟ اگر فطرتِ معرفت مراد ہے تو خداوند عالم کے بارے میں اکتسابی معرفت فطری ہے یا اس کی حضوری معرفت؟ دوسرا سوال، فطرت الٰہی کے فعال (بالفعل) اور غیر فعال (بالقوۃ) ہونے کے بارے میں ہے کہ کیا یہ انتخاب یا فطری معرفت تمام انسانوں کے اندر خلقت کے وقت سے بالفعل موجود ہے یا بالقوۃ؟ اور آخری سوال یہ ہے کہ کیا یہ فطری طور پر زوال پذیر ہے اور اگر زوال پذیر ہے تو کیا انسان اس کے زائل ہونے کے بعد بھی باقی رہے گا؟ آخری دو سوال، انسان کی الٰہی فطرت سے مربوط نہیں ہیں بلکہ انہیں ہر فطری شئی کے بارے میں بیان کیا جا سکتا ہے؟

انسان کی الٰہی فطرت سے مراد

توحید کے فطری ہونے کے سلسلہ میں تین احتمال موجود ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ اکتسابی اور مفہومی معرفت کی صورت میں خداوند عالم کے وجود کی تصدیق کرنا انسان کی فطرت ہے۔ فطری ہونے سے مراد، فطرت عقل اور انسان کی قوت مدرکہ کا ایک دوسرے سے مربوط ہونا ہے۔

دوسرا احتمال، خداوند عالم کے سلسلہ میں انسان کی شہودی اور حضوری علم کے بارے میں ہے اس احتمال کے مطابق تمام انسانوں کے اندر خداوند عالم کی طرف سے براہ راست اور حضوری معرفت کے مختلف درجات موجود ہیں۔

تیسرا احتمال، انسان کی الٰہی فطرت کو اس کی ذاتی خواہش اور اندرونی ارادہ فرض کرنا ہے اس احتمال کی روشنی میں انسان اپنی مخصوص روحی بناوٹ کی بنیاد پر خدا سے متمنی اور طلب گار ہے۔

پہلے احتمال کی وضاحت میں مرحوم شہید مطہری فرماتے ہیں:

بعض خدا شناسی کے فطری ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مراد فطرت عقل ہے، کہتے ہیں کہ انسان، فطری عقل کی روشنی میں مقدماتی استدلال کے حاصل کرنے کی ضرورت کے بغیر خداوند عالم کا وجود سمجھ لیتا ہے، نظام عالم اور موجودات کی تربیت اور تادیب پر توجہ کرتے ہوئے خود بخود بغیر کسی استدلال کی ضرورت کے انسان کے اندر ایک مدبر اور غالب کے وجود کا یقین پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ تمام فطری امور کہ جن کو منطق کی اصلاح میں ''فطریات'' کہا جاتا ہے ایسا ہی ہے۔[1]

حق یہ ہے کہ ''خدا موجود ہے'' کے قضیہ کو منطقی فطریات میں سے نہیں سمجھنا چاہیئے یعنی ''چار کا عدد، زوج ہے'' اس طرح کہ قضایا بدیہی ہیں اور ان چیزوں کا استدلال ذہن میں ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ جس میں ذہنی تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ فکر و نظر کی پوری تاریخ میں واضح طور پر خدا کے وجود پر حکماء، فلاسفہ نیز دوسرے مفکرین کے دلائل و استدلال کے ہم شاہد ہیں اور عقلی و نظری طریقہ سے یہ عظیم علمی جستجو، خداوند عالم کے عقیدہ کے بدیہی نہ ہونے کی علامت ہے، اسی بنا پر بعض دانشوروں نے کہا ہے کہ خداوند عالم پر اعتقاد بدیہی نہیں ہے بلکہ بداہت سے قریب ہے۔[2]

دوسرا احتمال خداوند عالم کے بارے میں انسان کے علم حضوری کو بشر کی فطرت کا تقاضا سمجھنا چاہیئے۔ انسان کا دل اپنے خالق سے گہرا رابطہ رکھتا ہے اور جب انسان اپنے حقیقی وجود کی طرف متوجہ ہوگا تو اس رابطہ کو محسوس کرے گا، اس علم حضوری اور شہود کی صلاحیت تمام انسانوں میں موجود ہے۔ لہٰذا اکثر لوگ خاص طور سے سادہ زندگی کے ان لمحات میں جب وہ دنیاوی کاموں میں مصروف ہیں اس قلبی اور اندرونی رابطہ کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔

---

[1] مطہری: مرتضی، مجموعہ آثار، ج:۶،ص:۹۳۴۔

[2] ملاحظہ ہو: مصباح یزدی، محمد تقی، آموزش فلسفہ ج ۲ص ۳۳۰ و ۳۳۱۔

سورہ نحل کی ۵۳ ویں آیت اور سورۂ عنکبوت کی ۶۵ ویں آیت کی طرح بعض دوسری آیتوں میں اضطراری مواقع اور اس وقت جب لوگ تمام اسباب سے قطع امید ہو جاتے ہیں اس فطرت کی بیداری کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّيهُم إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُم يُشرِكُونَ﴾[1]

پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں اور جب ہم انہیں نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتے ہیں تو وہ مشرک ہو جاتے ہیں۔

﴿وَمَابِكُم مِن نِعمَةٍ فَمِنَ اللّهِ ثُمَّ إِذَامَسَّكُمُ الضُّرُ فَإِلَيهِ تَجئَرُونَ﴾[2]

اور جتنی نعمتیں تمہارے ساتھ ہیں سب اس کی طرف سے ہیں پھر جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے تو تم اسی کے آگے فریاد کرتے ہو۔

اس احتمال کے مطابق خدا کی معرفت، فطرت، خدا پرستی اور خدا سے رابطہ، شہودی اور حضوری معرفت کی فرع ہے، مشکل وقت میں معمولی لوگ بھی جب ان میں یہ شہودی رابطہ ایجاد ہوتا ہے تو خدا کی عبادت، مناجات اور استغاثہ کرنے لگتے ہیں، اس لئے انسان کی الٰہی فطرت فطرت کی معرفت ہے، احساس وخواہش کا نام فطرت نہیں ہے۔

تیسرا احتمال سورۂ روم کی ۳۰ ویں آیت کہ جس میں فطرت کو احساس وخواہش (فطرت دل) کہا گیا ہے۔ اور معتقد ہے کہ خدا کی جستجو وتلاش اور خدا پرستی انسان کی فطرت ہے اور خدا کی طرف توجہ تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے چاہے اس کے وجود کی معرفت اور تصدیق خود فطری نہ ہو۔

---

[1] سورۂ عنکبوت ۶۵۔

[2] سورۂ نحل، آیت: ۵۳۔

انسان کے اندر سوال کرنے کی خواہش کے عنوان سے ایک بہترین خواہش موجود ہے جس کی بنیاد پر انسان اپنے آپ کو ایک حقیقت سے وابستہ اور ملا ہوا جانتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس حقیقت کے ذریعہ خدا سے نزدیک ہو کر اس کی تسبیح و تحلیل کرے۔

اگر چہ دوسرے اور تیسرے دونوں احتمالات ظاہر آیت سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل لگتا ہے لیکن ان روایات کی مدد سے جو اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض نقل بھی ہوئی ہیں دوسرا احتمال قطعاً مورد نظر ہے، البتہ دونوں احتمالات کے درمیان اس طرح جمع اور دونوں کو ملا کر ایک دوسرے کا مُکمِل بنایا جاسکتا ہے کہ اگر فطری طور پر انسان کے اندر کسی موجود کی عبادت خواہش اور عشق کا جذبہ پایا جائے تو یہ معقول نہیں ہے کہ عبادت مبہم و نا معلوم ہو لہٰذا اجباری طور پر خدا کی معرفت و شناخت کا پایا جانا انسان کی فطرت میں ہونا چاہیئے تا کہ یہ رجحان اور خواہش مبہم اور نا معلوم نہ ہو، پس جب بھی فطری طور پر اپنے اندر عبادت اور خضوع و خشوع کا ہم احساس کرتے ہیں تو یہ اسی کے لئے ہوگا جس کے بارے میں ہم اجمالی طور پر معرفت رکھتے ہوں، اور یہ معرفت حضوری اور شہودی ہے، دوسری طرف اگر انسان کے اندر خداوند متعال کے سلسلہ میں حضوری معرفت موجود ہو تو منعم کا شکریہ اور طلب کمال کی طرف ذاتی رجحان کی وجہ سے خداوند عالم کی جانب انسان کے اندر غیر قابل توصیف رغبت پیدا ہو جائے گی۔

فطرت کا زوال ناپذیر ہونا

سورۂ روم کی ۳۰ ویں آیت کے آخر میں آیا ہے ﴿لاتَبدِیلَ لِخَلقِ اللّٰہِ﴾ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے یعنی ہم نے اس فطرت الٰہی کو انسان کے حوالہ کیا جو غیر قابل تغیر ہے یہ ممکن ہے کہ انسان فطرت الٰہی سے غافل ہو جائے لیکن فطرت الٰہی ختم نہیں ہوگی، انسان جس

قدر اس فطرت الٰہی کو آمادہ کرنے کی کوشش کرے اور اپنے غیر حیوانی پہلوؤں کو قوت بخشے اتنا ہی بہتر انسان ہوگا۔ انسان اپنی ابتدائی خلقت میں بالفعل حیوان ہے اور بالقوت انسان ہے، اس لئے کہ حیوانیت اور خواہشات کی توانائی اس کے اندر سب سے پہلے رونما ہوتی ہے اور زندگی کے نشیب وفراز میں جس قدر غیر حیوانی پہلوؤں کو تقویت دے گا اور اپنے وجود میں جس قدر فطرت الٰہی کو حاکم کرنے میں کامیاب ہوگا اتنا ہی زیادہ انسانیت سے بہرہ مند ہوگا، بہر حال یہ بات قابل توجہ ہے کہ انسان میں فطری قابلیت اور اللہ کی طرف توجہ کا مادہ ہے چاہے پوشیدہ اور مخفی ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ فطری قابلیت ختم نہیں ہوتی ہے اور انسان کی سعادت اور بدبختی اسی فطری حقیقت کو جلا بخشنے یا مخفی کرنے میں ہے:

﴿قَد أَفلَحَ مَن زَكَّيهَا وَقَد خَابَ مَن دَسَّيهَا﴾[1]

[1] سورۂ شمس، آیت: ۹ تا ۱۰۔

یقیناً جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا وہ تو کامیاب ہوا اور جس نے اس کو آلودہ کیا وہ نقصان اٹھانے والوں میں رہا۔

فطرت اور حقیقت

اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ لوگ ایک جیسی خصوصیات لے کر اس دنیا میں نہیں آئے ہیں یہ تبدیلیاں چاہے بدن کے سلسلہ میں ہوں چاہے عقل وخرد کی توانائی میں ہوں ظاہر ہوجاتی ہیں، اسی طرح حیات انسان کا فطری ماحول اور اجتماعی حالات اور بیرونی تاثرات کی وجہ سے جوابات اور ردعمل بھی برابر نہیں ہوتا مثال کے طور پر بعض لوگ ایمان کی طرف راغب اور حق کی دعوت کے مقابلہ میں اپنی طرف سے بہت زیادہ آمادگی اور خواہش ظاہر کرتے ہیں، اور بعض حضرات پروردگار عالم کے حق اس کی بندگی سے یوں فرار کرتے ہیں کہ وحی الٰہی کو سننے، آیات اور

معجزات الٰہی کے مشاہدہ کرنے کے باوجود نہ صرف ایمان نہیں لاتے ہیں بلکہ ان کی اسلام دشمنی اور کفر دوستی میں شدت آجاتی ہے۔

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرآنِ مَاهُوشَفَاءٌ وَرَحمَةٌ لِلمُؤمِنِين وَ لا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إلا خَسَاراً﴾[1]

اور ہم تو قرآن میں سے وہی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے اور ظالمین کے لئے سوائے گھاٹے کی کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا''

اب یہ سوال درپیش ہے کہ یہ فرق واختلاف کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ آیا اس کا حقیقی سبب انسان کی فطرت وطبیعت ہے اور ماحول واجتماعی اسباب کا کوئی اہم رول نہیں ہے یا یہ کہ خود ماحول اس سلسلہ میں انسان کی سرنوشت معین کرتا ہے ورنہ انسان کی مشترکہ فطرت کا کوئی خاص کردار نہیں ہے یا یہ اختلافات، فطری عناصر اور ماحول کی دین ہیں۔ اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ: ہر فرد کی شخصیت میں اس کی فردی خصوصیت بھی شامل ہوتی ہے، اور متعدد فطری واجتماعی اسباب کا بھی وہ معلول ہے، وراثت، فطری اختلافات اسباب تربیت، اجتماعی ماحول اور دوسرے حالات، کامیابیاں اور ناکامیاں، ملکی اور جغرافیائی حدود خصوصاً فردی تجربہ، انتخاب اور قدرت اختیار میں سے ہر ایک کا انسان کی شخصیت سازی میں ایک خاص کردار ہے۔ انسان کا اخلاق اور الٰہی فطرت کی حقیقت اور تمام انسانوں کے فطری اور ذاتی حالات بھی تمام مذکورہ عوامل کے ہمراہ مشترکہ عامل کے عنوان سے انسان کی کردار سازی میں موثر ہیں، فردی اختلافات کا ہونا مشترکہ فطرت کے انکار اور بے اثر ہونے کے معنی میں نہیں ہے ﴿قُل كُلٌّ يَعمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾[2]

تم کہہ دو کہ ہر ایک اپنی شخصیت سازی کے اصول پر عمل پیرا ہے، آیہ شریفہ میں ''شاکلہ''

---

[1] سورۂ اسراء، آیت: ۸۲۔

[2] سورۂ اسراء، آیت: ۸۴۔

سے مراد ہر انسان کی شخصی حقیقت اور معنویت، فطرت الٰہی کے ہمراہ مذکورہ عوامل کے مجموعہ سے حاصل ہوتا ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ فطری امور تمام افراد میں ایک ہی انداز میں رشد وکمال نہیں پاتے ہیں اسی بنا پر تمام عوامل کے مقابلہ میں فطری سبب کے لئے ایک ثابت، موزوں اور معین مقدار قرار نہیں دی جاسکتی ہے انسانوں کا وہ گروہ جن میں اخلاق اور الٰہی فطرت پوری طرح سے نکھر چکی ہے اور بہترین اخلاقی زندگی اور کامل بندگی سے سرفراز ہے اس کی حقیقت اور شخصیت کو ترتیب دینے میں اسباب فطرت کا نمایاں کردار ہے اور جن لوگوں نے مختلف اسباب کی وجہ سے اپنے حیوانی پہلوؤں کو قدرت بخشی ہے ان افراد کا شعلۂ فطرت خاموش ہو چکا ہے اور اثر انداز ہونے میں بہت ہی کمزور ہے۔[1]

---

[1] قرآن کی نظر میں مذکورہ اسباب کے کردار کی تاکید کے علاوہ نفسانی خواہشوں میں اسیر ہونا اور مادی دنیا کی زندگی اور شیطان کے پھندے میں مشغول رہنے کو انسان کے انحراف میں موثر اسباب کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے اور پیغمبروں، فرشتوں اور خداوند عالم کی خصوصی امداد کو انسان کی راہ سعادت میں مدد کرنے والے تین اسباب وعوامل کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ ضمیمہ میں ان سب کے بارے میں مختصر وضاحت انشاء اللہ آئے گی۔

خلاصۂ فصل

۱۔ ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ظاہری شکل وصورت اور اخلاق و کردار میں متعدد اور گوناگوں فرق کے باوجود جسم و روح کے اعتبار سے آپس میں بہت زیادہ مشترک پہلو پائے جاتے ہیں۔

۲۔ انسان کی فطرت کے بارے میں گفتگو، انسان شناسی کے اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے، جس نے موجودہ چند صدیوں میں بہت سے مفکرین کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔

۳۔ انسانی فطرت، مشترکہ فطرت کے عناصر کی طرف اشارہ کرتی ہے جو آغاز خلقت سے ہی تمام انسانوں کو عطا کی گئی ہے جب کہ ماحول اور اجتماعی عوامل نہ ہی فراہم اور نہ ہی اس کو نابود کر سکتے ہیں اور ان کی خلقت میں تعلیم وتربیت کا کوئی کردار نہیں ہے۔

۴۔ انسان کی مشترکہ فطرت کے وجود پر جملہ دلیلوں میں فہم ومعرفت ہے نیز انسانوں میں غیر حیوانی ارادے اور خواہشات کا پایا جانا اور ذاتی توانائی کا انسان سے مخصوص ہونا ہے۔

۵۔ انسان کے وجود میں خداوند عالم کی معرفت کے لئے بہترین خواہش سوالات کی خواہش کے عنوان سے موجود ہے، جس کی بنیاد پر انسان اپنے آپ کو ایک حقیقت سے وابستہ اور جڑا ہوا سمجھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس حقیقت سے نزدیک ہو کر تسبیح و تحلیل بجالائے اور یہ حقیقت وہی فطرت الٰہی ہے۔

۶۔ آیات وروایات بہت ہی واضح یا ضمنی طور پر معرفت، انسانی خواہش اور توانائی سے مخصوص حقیقت، مشترکہ فطرت نیز عناصر اور ان کی خصوصیات پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ مورد تائید اور تاکید قرار پائی ہے وہ فطرت الٰہی ہے۔

۷۔ ہر انسان کی شخصیت سازی میں اس کا ماحول نیز رفتار و کردار، موروثی اور جغرافیائی عوامل کے علاوہ فطرت کا بھی بنیادی کردار ہے۔

تمرین

۱۔فطری اور طبیعی امور سے غیر فطری امور کی شناخت کے معیار کیا ہیں؟

۲۔انسان کی شخصیت سنوارنے والے عناصر کا نام ذکر کریں؟

۳۔انسان کا ارادہ، علم، خواہش اور قدرت کس مقولہ سے مربوط ہے؟

۴۔سورۂ روم کی ۳۰ویں آیت کا مضمون کیا ہے؟ اس آیت میں ﴿لا تَبدِیل لِخَلقِ اللّٰہِ﴾ سے مراد کیا ہے؟ وضاحت کریں؟

۵۔انسان کی مشترکہ فطرت کی معرفت میں علوم تجربی، عقلی اور شہودی میں سے ہر ایک علم کا کردار اور اس کی خامیاں بیان کریں؟

۶۔فطرت الٰہی کے تغییر نہ ہونے کی بنیاد پر جو افراد خدا سے غافل ہیں یا خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں یا شک رکھتے ہیں ان افراد میں فطرت الٰہی کس انداز میں پائی جاتی ہے؟

۷۔فطرت الٰہی کو قوی اور ضعیف کرنے والے عوامل بیان کریں؟

۸۔حقیقی اور غیر حقیقی اور جھوٹی ضرورتوں سے مراد کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک کے لئے دو مثالیں ذکر کرتے ہوئے واضح کریں؟

۹۔مندرجہ ذیل موارد میں سے انسان کی فطری اور حقیقی ضرورتیں کون سی ہیں؟

انصاف پسندی، حقیقت کی جستجو، آرام پسندی، عبادت کا جذبہ اور راز و نیاز، خود پسندی دوسروں سے محبت محتاجوں پر رحم کرنا، بلندی کی تمنا، حیات ابدی کی خواہش، آزادی کی لالچ۔

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔علوم تجربی کے نظریہ کے مطابق شخصیت ساز عناصر کے لئے ملاحظہ ہو:

۔ماہر نفسیات، شخصیت کے بارے میں نظریات، نفسیاتی ترقی، اجتماعی نفسیات شناسی، جامعہ شناسی کے اصول، فلسفہ تعلیم و تربیت۔

۲۔اسلام کی روشنی میں انسان کی شخصیت کے لئے ملاحظہ ہو:

۔مصباح یزدی، محمد تقی (۱۳۶۸) جامعہ و تاریخ از دیدگاہ قرآن، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی۔

۔نجاتی، محمد عثمان (۱۳۷۲) قرآن و روان شناسی، ترجمہ عباس عرب، مشہد، بنیاد پژوہشہای آستان قدر رضوی۔

۳۔اسلامی نظریہ سے انسان کی فطرت کے لئے ملاحظہ ہو:

۔دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (۱۳۷۲) در آمدی بہ تعلیم و تربیت اسلامی، فلسفہ تعلیم و تربیت، تہران: سمت۔ ص ۳۶۹-۵۱۴۔

۴۔انسان کی فطرت میں دانشوروں کے نظریات کے لئے ملاحظہ ہو:

۔اسٹیونسن، لسلی (۱۳۶۸) ہفت نظریہ دربارہ طبیعت انسان، تہران، رشد۔

۔پاکارڈ، ڈونیس (۱۳۷۰) آدم سازان، ترجمہ حسن افشار، تہران: بیہبانی۔

۔دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ (۱۳۶۳) در آمدی جامعہ شناسی اسلامی، مبانی جامعہ شناسی، قم، سمت۔

۔شکر کن، حسین، و دیگران (۱۳۷۲) مکاتب روان شناسی و نقد آن، ج ۲ تہران: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، سمت۔

۵۔انسانی فطرت کے لئے ملاحظہ ہو:

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۳) دہ مقالہ پیرامون مبدا ومعاد۔ تہران: الزہراء۔

......(۱۳۶۳) فطرت وعقل ووحی، یادنامۂ شہید قدوسی، قم: شفق۔

......(۱۳۶۳) تفسیر موضوعی قرآن، ج۵، تہران، رجاء۔

۔شیروانی، علی (۱۳۷۶) سرشت انسان: پژوہشی در خداشناسی فطری، قم: نہاد نمایندگی مقام معظم رہبری در دانشگاہ ہا (معاونت وامور اساتید ودروس معارف اسلامی)۔

۔محمد تقی مصباح، معارف قرآن: خداشناسی، قم جامعہ مدرسین۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۰) مجموعہ آثار۔ ج۵، ''کتاب فطرت''، تہران: صدرا۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) مجموعہ آثار۔ ج۵، ''مقالہ فطرت''، تہران: صدرا۔

۔موسوی خمینی، روح اللہ (۱۳۶۸) چہل حدیث، تہران، مرکز نشر فرہنگی رجاء۔

۶۔کلمہ فطرت کے استعمالات اور معانی کے لئے ملاحظہ ہو:

۔یثربی، یحیی ''فطری بودن دین از دیدگاہ معرفت شناسی'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ سال سوم، ش نہم، ص ۱۱۰ــ۱۱۸۔

۷۔انسان کی فطری توانائی نیز معلومات ونظریات کے لئے ملاحظہ ہو:

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی، ج۵، نشر فرہنگی رجاء، تہران۔

۔شیروانی، علی (۱۳۷۶) سرشت انسان: پژوہشی در خداشناسی فطری، قم: نہاد نمایندگی مقام معظم رہبری در دانشگاہ ہا (معاونت امور اساتید ودروس معارف اسلامی)۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) اخلاق در قرآن: قم: موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) خودشناسی برای خودسازی: قم: موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینیؒ۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی):
قم: موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینیؒ۔
مطہری، مرتضی (۱۳۶۹) مجموعۂ آثار، ج ۲، انسان در قرآن، تہران: صدرا۔

ملحقات

لفظ ''فطرت'' کے اہم استعمالات

لفظ فطرت، کے بہت سے اصطلاحی معنی یا متعدد استعمالات ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل سب سے اہم ہیں:

ا۔ خواہش اور طبیعت کے مقابلہ میں فطرت کا ہونا: بعض لوگوں نے لفظ فطرت کو اس خواہش اور طبیعت کے مقابلہ میں جو حیوانات، جمادات اور نباتات کی طینت کو بیان کرتے ہیں، انسان کی سرشت کے لئے استعمال کیا ہے۔

۲۔ فطرت، غریزہ کا مترادف ہے: اس استعمال میں فطری امور سے مراد طبیعی امور ہیں البتہ اس استعمال میں کن مواقع پر غریزی امور کہا جاتا ہے، اختلاف رائے ہے جس میں سے ایک یہ ہے کہ جو کام انسان انجام دیتا ہو لیکن اس کے نتائج سے آگاہ نہ ہو اور نتیجہ بھی ضروری ہو مثال کے طور پر بعض وہ کام جو بچہ اپنے ابتدائی سال میں آگاہانہ انجام دیتا ہے اسے غریزی امور کہا جاتا ہے۔

۳۔ فطرت یعنی بدیہی: اس اصطلاح میں ہر وہ قضیہ جو استدلال کا محتاج نہ ہو جیسے معلول کے لئے علت کی ضرورت اور اجتماع نقیضین کا محال ہونا فطرت کہا جاتا ہے۔

۴۔ فطرت، منطقی یقینیات کی ایک قسم ہے: استدلال کے محتاج وہ قضایا جن کا استدلال پوشیدہ طور پر ان کے ہمراہ ہو ﴿قضایا قیاساتها معها﴾ ''فطری'' کہا جاتا ہے جیسے چار زوج ہے، جس کا استدلال (چونکہ دو متساوی حصوں میں تقسیم ہوسکتا ہے) اس کے ہمراہ ہے۔

۵۔ کبھی لفظ فطرت، بدیہی سے نزدیک قضایا پر اطلاق ہوتا ہے: جیسے ''خدا موجود ہے'' یہ قضیہ استدلال کا محتاج ہے اور اس کا استدلال اس کے ہمراہ بھی نہیں ہے لیکن اس کا استدلال ایسے مقدمات کا محتاج ہے جو بدیہی ہے (طریقہ علیت) چونکہ یہ قضیہ بدیہیات کی طرف منتہی ہونے کا

ایک واسطہ ہے لہٰذا بدیہی سے نزدیک ہے، ملاصدرا کے نظریہ کے مطابق خدا کی معرفت کے فطری ہونے کو بھی (بالقوۃ خدا کی معرفت) اسی مقولہ یا اس سے نزدیک سمجھا جا سکتا ہے۔

۶۔فطرت، عقل کے معنی کے مترادف ہے: اس اصطلاح کا ابن سینا نے استفادہ کیا ہے اور کہا ہے کہ فطرت وہم خطا پذیر ہے لیکن فطرت عقل خطا پذیر نہیں ہے۔

۷۔فطرت کا حساسیت اور وہم کے مرحلہ میں ذہنی صورتوں کے معانی میں ہونا: ''ایمانول کانٹ''[1] معتقد تھا کہ یہ صورتیں خارج میں کسی علت کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ ذہن کے فطری امور میں سے ہیں اور اس کو فطری قالب میں تصور کیا جاتا ہے جیسے مکان، زمان کمیت کیفیت، نسبت اور جہت کو معلوم کرنے والے ذہنی قضایا میں کسی معلوم مادہ کو خارج سے دریافت کرتے ہوئے ان صورتوں میں ڈھالتا ہے تا کہ قابل فہم ہو سکیں۔

۸۔فطرت عقل کی خصوصیات میں سے ہے: جس کی تخلیق میں حس اور تجربہ کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے بلکہ عقل بالفعل اس پر نگرانی رکھتی ہے ''ڈیکارٹ'' کے نظریہ کے اعتبار سے خدا، نفس اور مادہ (ایسا موجود جس میں طول، عرض، عمق ہو) فطری شمار ہوتا ہے اور لفظ فطری بھی اسی معنی میں ہے۔

۹۔فطرت یعنی خدا کے بارے میں انسان کا علم حضوری رکھنا، خداشناسی کے فطری ہونے میں یہ معنی فطرت والی آیات و روایات کے مفہوم سے بہت سازگار ہیں۔

۱۰۔فطرت یعنی ایک حقیقت کو پورے اذہان سے درک کرنا، اصل ادراک اور کیفیت کی جہت سے تمام افراد اس سلسلہ میں مساوی ہیں جیسے مادی دنیا کے وجود کا علم۔

---

[1] Imanuel Kant

۲۔ ہدایت کے اسباب اور موانع

قرآن مجید نے انسان کے تنزل کے عام اسباب اور برائی کی طرف رغبت کو تین چیزوں میں خلاصہ کیا ہے:

۱۔ خواہشات نفس: خواہشات نفس سے مراد باطنی ارادوں کی پیروی اور محاسبہ کرنے والی عقلی قوت سے استفادہ کئے بغیر ان کو پورا کرنا اور توجہ کرنا اور انسان کی سعادت یا بدبختی میں خواہشات کو پورا کرنے کا کردار اور اس کے نتائج کی تحقیق کرنا ہے۔ اس طرح خواہشات کو پورا کرنا، حیوانیت کو راضی کرنا اور خواہشات کے وقت حیوانیت کو انتخاب کرنے کے معنی میں ہے۔

۲۔ دنیا: دنیاوی زندگی میں انسان کی اکڑ اور غلط فکر اس کے انحراف میں سے ایک ہے دنیاوی زندگی کے بارے میں سوچنے میں غلطی کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس کو آخری مقصد سمجھ بیٹھیں اور دائمی سعادت اور آخرت کی زندگی سے غفلت کریں، یہ غلطی بہت سی غلطیوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے، انبیاء کے مقاصد میں سے ایک مقصد دنیا کے بارے میں انسانوں کی فکروں کو صحیح کرنا تھا اور دنیاوی زندگی کی جو ملامت ہوئی ہے وہ انسانوں کی اسی فکر کی بنا پر ہے۔

۳۔ شیطان: قرآن کے اعتبار سے شیاطین (ابلیس اور اس کے مددگار) ایک حقیقی مخلوق ہیں جو انسان کو گمراہ کرنے اور برائی کی طرف کھینچنے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ شیطان برے اور پست کاموں کو مزین اور جھوٹے وعدوں اور دھوکہ بازی کے ذریعہ اچھے کاموں کے انجام دینے کی صورت میں یا ناپسندیدہ کاموں کے انجام نہ دینے کی وجہ سے انسان کو اس کے مستقبل سے ڈراتے ہوئے غلط راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ شیطان مذکورہ منصوبے کو ہوائے نفس کے ذریعہ انجام دیتا ہے اور خواہش نفس کی تائید و مدد کرتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں پیغمبروں، فرشتوں کے کردار اور خدائی امداد سے انسان نیک کاموں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس راہ میں وہ سرعت کی باتیں کرتا ہے۔

انبیاء انسان کو حیوانی غفلت سے نجات دے کر مرحلہ انسانیت میں داخل کرتے ہیں اور دنیا کے سلسلہ میں اپنی نصیحتوں کے ذریعہ صحیح نظریہ کو پیش کر کے انسان کی حقیقی سعادت اور اس تک پہنچنے کی راہ کو انسان کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

اور خوف و امید کے ذریعہ صحیح راستہ اور نیکیوں کی طرف حرکت کے محرک کو انسان کے اندر ایجاد کرتے ہیں بلکہ صحیح راہ کی طرف بڑھنے اور برائیوں سے بچنے کے لئے تمام ضروری اسباب اس کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

جو افراد ان شرائط میں اپنی آزادی اور اختیار سے صحیح استفادہ کرتے ہیں ان کے لئے مخصوص شرائط میں بالخصوص مشکلات میں فرشتے مدد کے لئے آتے ہیں اور ان کو صحیح راہ پر لگا دیتے ہیں۔ سعادت کی طرف قدم بڑھانے، مقصد کو پانے اور مشکلات کو حل اور موانع کو دور کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

خدا کی عام اور مطلق امداد کے علاوہ اس کی خصوصی امداد بھی ان فریب کھائے انسانوں کے شامل حال ہوتی ہے اور اسی خصوصی امداد کے ذریعہ شیطان کی تمام قوتوں پر غلبہ پا کر قرب الٰہی کی طرف راہ کمال کو طے کرنے میں مزید سرعت پیدا ہو جاتی ہے وہ سو سال کی راہ ایک ہی شب میں طے کر لیتے ہیں، یہ امداد پروپیگنڈوں کے ختم کرنے کا سبب بھی ہوتی ہے جو اپنی اور دوسروں کی سعادت میں صالح انسانوں کے بلند مقاصد کی راہ میں دشمنوں اور ظالم قوتوں اور شیطانی وسوسوں کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: علامہ محمد حسین طباطبائی کی المیزان فی تفسیر القرآن، محمد تقی مصباح کی اخلاق در قرآن، ج ۱ ص ۱۹۳۔۲۳۶۔

مغربی انسان شناسوں کی نگاہ میں انسان کی فطرت

دور حاضر کے ماہر نفسیات ''ناتھالی ٹربو یک'' نے انسان کے بارے میں چند اہم سوالوں اور ان کے جوابات کو فلسفی اور تجربی انسان شناسوں کی نگاہ سے ترتیب دیا ہے جس کو پروفیسر ''ونس پاکرڈ'' نے ''عناصر انسان'' نامی کتاب میں پیش کیا ہے، ہم ان سوالات میں سے دو اہم سوالوں کو جو انسان کی فطرت سے مربوط ہیں یہاں نقل کر رہے ہیں۔[1]

اس کتاب کو جناب حسن افشار نے ''آدم سازان'' کے عنوان سے ترجمہ اور انتشارات بہبہانی نے ۱۳۷۰ میں منتشر کیا ہے اور ہم نے جناب افشار کے ترجمہ کو تھوڑی تبدیلی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ انسان کی فطرت کیا ذاتاً اچھی ہے یا بری ہے یا نہ ہی اچھی ہے اور نہ ہی بری؟

منفی نظریات

فرویڈ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ: انسان ایک منفی اور مخالف سرشت کا مالک ہے اور وہ ایسی چاہتوں سے برانگیختہ ہوتا ہے جس کی جڑیں ماحولیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاص طور سے جنسی خواہشات[2] اور غصہ میں آجانے کو[3] صرف اجتماعی معاملات سے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔

تجربہ پسند نظریہ کے حامی[4]: (ہابز) کے لحاظ سے انسان صرف اپنی منفعت کی راہ میں حرکت کرتا ہے۔

نظریہ سودخوری[5]: (بنتام ہیل) کے مطابق انسان کے تمام اعمال اس کی تلاش منفعت کا نتیجہ ہیں۔

---

[1] Vance Pakard, The People Shapers,pp 361, Biston, Toronto, 1977.

[2] Sex۔ [3] Aggression۔ [4] Empiricists۔ [5] Utillitarians.۔

نظریہ لذت پسندی کے نمائندے کہتے ہیں کہ ۱: انسان لذت کے ذریعہ اپنی ضرورت حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے اور رنج وغم سے دوچار ہونے سے فرار کرتا ہے

نظریہ افعال گرایان کے حامی ۲: (لورنز۳ کا کہنا ہے انسان ذاتی طور پر برا ہے یعنی اپنے ہی ہم شکلوں کے خلاف ناراضگی کی وجہ سے دنیا میں آیا ہے۔

آرتھونلک کا ماہر نفسیات۴: (نیوبلڈ۵: انسان کی ناراضگی کے سلسلہ میں اس گروہ کا نظریہ بھی عقیدہ افعال پسندوں کے مشابہ ہے۔

دوسرا سوال اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کا حیوانات سے جدا ہونا ماہیت کے اعتبار سے ہے یا مرتبہ حیوانیت کے اعتبار سے ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف نظریات بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بعض نظریات کو ''ناتھالی ٹربوویک'' نے سوال و جواب کی صورت میں یوں پیش کیا ہے۔

انسان و حیوان ایک مخصوص طرز عمل کی پیروی کرتے ہیں یا انسان میں ایسے نظری ارادے ہیں جو حیوانی ضرورتوں سے بہت بالا ہیں؟

۱۔ Hedonists.

۲۔ "Ethologists" کردارشناسی (Ethology) ایسا کردار و رفتاری مطالعہ ہے جو جانور شناسی کی ایک شاخ کے عنوان سے پیدا ہوا ہے اور بہت سی انواع واقسام کی توصیف رفتار اور مشاہدہ کی مزید ضرورت کی تاکید کرتا ہے۔ تفسیر رفتار بہ عنوان نتیجہ، تکامل انسان کے طبیعی انتخاب کا سرچشمہ ہے، لیکن بعد میں اس کا اطلاق انسان و حیوان کے انتخابی پہلو پر ہونے لگا اور اس وقت حضوری گوشوں پر اطلاق ہوتا تھا اور آج کل علم حیات کی طرف متمائل ہوگیا ہے۔

۳۔ Lorenz.

۴۔ Orthonoleculer Psychiatrists.

۵۔ Newbold.

صلح پسندی کے مدعی (ہیوم، ہارٹلی) کا کہنا ہے: انسان کے طرز عمل میں دوسرے تمام حیوانات کے طرز عمل کی طرح کچھ ضدی چیزیں ہیں جو خود بخود ہو جاتی ہیں۔

عقیدۂ تجربہ پسندی کے ہمنوا (ہابز) کے مطابق: انسان کی فطرت بالکل مشینی انداز میں ہے جو قوانین حرکت کی پیروی کرتا ہے، انسان کے اندر روح کے عنوان سے کوئی برتری کی کیفیت نہیں ہے۔

فرونڈ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ: انسان تمام حیوانوں کی طرح صرف نفسانی خواہشوں کے دباؤ[1] کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ اس خواہش کو شرمندہ تعبیر حیاتی ضرورتیں وجود میں لاتی ہیں۔ انسان کا طرز عمل، لذت کی طرف رجحان اور رنج الم سے دوری کی پیروی کرنا ہے حتی وہ طرز عمل جو ایسا لگتا ہے کہ بلند و بالا مقاصد کی بنیاد پر ہے حقیقت میں وہ بہت ہی پست مقاصد کو بیان کرتا ہے۔

عقیدہ کردار و اعمال کے علمبردار (اسکینر) کے مطابق: طرز عمل چاہے انسان کا ہو چاہے حیوان کا سبھی شرائط کے پابند ہیں۔ کبھی انسان کے طرز عمل پر نگاہ ہوتی ہے لیکن اس چیز پر نگاہ نہیں ہوتی جو انسان کے طرز عمل کو حیوان کے طرز عمل سے جدا کر دے جیسے ''آزادانہ ارادہ اندرونی خواہش اور خود مختار ہونا'' اس طرح کے غلط مفاہیم، بے فائدہ اور خطرناک ہیں چونکہ انسان کی اس غلط فکری کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص مخلوق ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

عقیدہ عقل (ڈیکارٹ): پست حیوانات مشین کی طرح ہیں یعنی ان کا طریقۂ عمل بعض مادی قوانین کے تحت ہے اور انسان حیوانی فطرت کے علاوہ عقلی فطرت بھی رکھتا ہے جو اسے قضاوت، انتخاب اور اپنے آزاد ارادہ کے انجام دینے کی اجازت دیتی ہے۔

---

1. Tensions.

فرویڈ کے جدید ماننے والے (فروم، اریکسن) کے مطابق: انسان ایسی توانائی رکھتا ہے جو زندگی کی معمولی ضرورتوں پر راضی ہونے سے بالاتر ہے اور وہ اچھائیاں تلاش کرنے کے لئے فطری توانائی رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ وہ انہیں حاصل کر سکے گا یا نہیں اجتماعی اسباب پر منحصر ہے انسان کے اچھے کام ہو سکتے ہیں کہ بلند و بالا ارادے سے آغاز ہوں لہٰذا وہ صرف پست مقاصد سے منحرف نہیں ہوتے ہیں۔

انسان پسندی کے شیدائی (مازلو، روجرز) کے مطابق: انسان کی فطرت حیوان کی فطرت سے بعض جہتوں میں برتر ہے، ہر انسان یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ کمال کی طرف حرکت کرے اور خود کو نمایاں کرے، نامناسب ماحول کے شرائط وغیرہ مثال کے طور پر فقیر آدمی کا اجتماعی ماحول جو اپنے تہذیب نفس کی ہدایت کو غلط راستہ کی طرف لے جا کر نابود کر دیتا ہے یہ ایسی ضرورتیں ہیں جو انسان کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن حیوان کے لئے باعث اہمیت نہیں ہیں مثال کے طور پر محبت کی ضرورت، عزت اعتبار، صحت، احترام کی ضرورت اور اپنی فہم کی ضرورت وغیرہ۔

عقیدۂ وجود کے پرستار (سارٹر) کے بقول: انسان اس پہلو سے تمام حیوانوں سے جدا ہے کہ وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اعمال کی ذمہ داری صرف اسی پر ہے، یہی معرفت انسان کو تنہائی اور ناامیدی سے باہر لاتی ہے اور یہ چیز انسان ہی سے مخصوص ہے۔

مبہم نظریات

نظریہ افعال پسندی کے حامی [۱] (واٹسن [۲]، اسکینر [۳] کے مطابق: انسان ذاتاً اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ ماحول اس کو اچھا یا برا بناتا ہے۔

۱۔ ehaviorists

۲۔ Wanson

۳۔ Skinner

معاشرہ اور سماج پسندی نظریہ (مانڈورا[1]، مائکل[2] کے مطابق: اچھائی یا برائی انسان کو ایسی چیز کی تعلیم دیتی ہیں جو اس کے لئے اجر کی سوغات لاتی ہیں اور اس کو سزا سے بچاتی ہیں۔

وجود پسندی کا نظریہ (سارٹر) کے بقول: انسان ذاتاً اچھا یا برا نہیں ہے بلکہ وہ جس عمل کو انجام دیتا ہے اس کی ذاتی فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا اگر تمام لوگ اچھے ہوں تو انسان کی فطرت بھی اچھی ہے اور اسی طرح اس کے برعکس۔

مثبت نظریات

فرویڈ کے جدید ماننے والے (فروم، اریکسن[3] انسان کے اچھے ہونے کے لئے اس کے اندر مخصوص توانائی موجود ہے لیکن یہ کہ وہ اچھا ہے یا نہیں، اس معاشرہ سے مربوط ہے جس میں وہ زندگی گذار رہا ہے اور ان دوستوں سے مربوط ہے جس کے ساتھ خاص طور سے بچپنے میں رابطہ رکھتا تھا فرویڈ کے نظریہ کے برخلاف اچھے اعمال فطری زندگی کی ضرورتوں سے وجود میں نہیں آتے ہیں۔ انسان پسندی[4] (مازلو[5]، زوجرز[6]: انسان کے اندر نیک ہونے اور رہنے کی قابلیت موجود ہے اور اگر اجتماعی ضرورتیں یا اس کے غلط ارادہ کی دخالت نہ ہو تو اس کی اچھائی ظاہر ہو جائے گی۔

---

۱. Bandura۔

۲. Mischel۔

۳. Erikson۔

۴. Humanists

۵. Maslow۔

۶. Rogers

رومانی افراد[1] (روسو) انسان اپنی خلقت کے وقت سے ایک اچھی طبیعت کا مالک ہے اور جو وہ برا عمل انجام دیتا ہے وہ اس کی ذات میں کسی چیز کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ برے معاشرہ کی وجہ سے ہے۔

---

[1] Romanticists رومانی انداز، فنون اور بین الاقوامی عقیدہ فلسفہ میں غالباً (نئے قدامت پسندی کے مقابلہ میں اور مکانیزم و عقل پرستی سے پہلے) مغربی یورپ اور روس میں ۱۸ ویں صدی کے آخر اور ۱۹ ویں صدی کے آغاز تک چھا گیا تھا۔ رومانیزم فطرت کی طرف سادہ انداز میں بازگشت کے علاوہ غفلت یعنی میدان تخیل اور احساس تھا، نفسیات شناسی کے مفاہیم اور موضوعات سے مرتبط، بیان، سادہ لوحی انقلابی اور لاتعلقی اور حقیقی لذت ان کے جدید تفکر میں بنیادی اعتبار رکھتا ہے۔ رومانیزم، ظاہر پسندی ہنر و افکار اور انسان کے مفاہیم میں محدودیت کے خلاف ایک خاص طغیان تھا اور اپنے فعل میں تاکید بھی کرتے تھے کہ دنیا کو درک کرنے والا اس پر مقدم ہے، یہیں سے نظریۂ تخیل محور و مرکز قرار پاتا ہے۔

نظام خلقت میں انسان کا مقام

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔ خلافت، کرامت اور انسان کے امانت دار ہونے کے مفاہیم کی وضاحت کریں؟

۲۔ آیات قرآن کی روشنی میں انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی وضاحت کریں؟

۳۔ خلافت کیلیئے، حضرت آدمؑ کے شایستہ وحقدار ہونے کا معیار بیان کریں؟

۴۔ کرامت انسان سے کیا مراد ہے اس کو واضح کریں نیز قرآن کی روشنی میں اس کی اقسام کا ذکر فرمائیں؟

۵۔ ذاتی اور کسبی کرامت کی وضاحت کریں؟

پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن مجید انسان کی موجودہ نسل کی تخلیق کو حضرت آدمؑ کی خلقت سے مخصوص جانتا ہے اور انسانوں کی فکر، خواہشات اور غیر حیوانی توانائی سے استوار ہونے کی تاکید کرتا ہے، حضرت آدمؑ اور ان کی نسل کی تخلیق سے مربوط آیات گذشتہ دو فصلوں میں بیان کی گئی آیات سے زیادہ ہیں جن میں حضرت آدمؑ کی خلافت و جانشینی نیز دوسری مخلوق پر انسان کی برتری و کرامت اور دوسری طرف انسان کی پستی، تنزلی دوسری مخلوقات سے بھی گر جانے کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے انسان کی خلافت کے مسئلہ اور اس کی کرامت کے بارے میں قرآن مجید نے دو لحاظ سے لوگوں کے سامنے متعدد سوالات اٹھائے ہیں، جن میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت آدمؑ کی جانشینی سے مراد کیا ہے اور وہ کس کے جانشین تھے؟

۲۔ آیا خلافت اور جانشینی حضرت آدمؑ سے مخصوص ہے یا ان کی نسل بھی اس سے مستفید ہو سکتی ہے؟

۳۔ حضرت آدمؑ کا خلافت کے لئے شایستہ و حقدار ہونے کا معیار کیا ہے اور کیوں دوسری مخلوقات خلافت کے لائق نہیں ہیں؟

۴۔ انسان کی برتری اور کرامت کے سلسلہ میں قرآن میں دو طرح کے بیانات کا کیا راز ہے؟ کیا یہ بیانات، قرآن کے بیان میں تناقض کی طرف اشارہ نہیں کرتے ہیں؟ اس فصل میں ہم خلافت الٰہی اور کرامت انسان کے عنوان کے تحت مذکورہ سوالات کا جائزہ و تحلیل اور ان کے جوابات پیش کریں گے۔

خلافت الٰہی

اولین انسان کی خلقت کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات میں ذکر کئے گئے مسائل میں سے ایک انسان کا خلیفہ ہونا ہے، سورۂ بقرہ کی ۳۰ویں آیت میں خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿وإذا قَالَ رَبُّکَ لِلمَلائِکَةِ إِنّی جَاعِلٌ فِی الأرضِ خَلِیفَةً قالُوا أتَجعَلُ فِیهَامَن یُفسِدُ فِیهَاوَیَسفِکُ الدِّمَاءَ وَ نَحنُ نُسَبّحُ بِحَمدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ قَالَ إِنّی أعلَمُ مَالاتَعلَمُونَ﴾

اور (یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک نائب زمین میں بنانے والا ہوں تو کہنے لگے: کیا تو زمین میں ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو زمین میں فساد اور خونریزیاں کرتا پھرے حالانکہ ہم تیری تسبیح وتقدیس کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی ثابت کرتے ہیں، تب خدا نے فرمایا:

اس میں تو شک ہی نہیں کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

خلیفہ اور خلافت، ''خلف'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیچھے اور جانشین کے ہیں جانشین کا استعمال کبھی تو حسی امور کے لئے ہوتا ہے جیسے ﴿وَهُوَالَّذِی جَعَلَ اللَّیلَ وَ النَّهارَ خِلفَةً﴾[۱] ''اور وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے رات اور دن کو جانشین بنایا۔'' اور کبھی اعتباری امور کے لئے جیسے ﴿یَا دَاود إِنَّا جَعَلنَاکَ خَلِیفَةً فِی الأرضِ فَاحکُم بَینَ النَّاسِ بِالحَقّ﴾ اے داود! ہم نے تم کو زمین میں نائب قرار دیا تو تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو[۲] اور کبھی غیر طبیعی حقیقی امور میں استعمال ہوتا ہے جیسے حضرت آدمؑ کی خلافت جو سورہ بقرہ کی ۳۰ ویں آیت میں مذکور ہے۔

۱۔ سورۂ فرقان، آیت:۶۲۔ ۲۔ سورۂ ص، آیت:۲۶

حضرت آدمؑ کی خلافت سے مراد انسانوں کی خلافت یا ان سے پہلے دوسری مخلوقات کی خلافت نہیں ہے بلکہ مراد، خدا کی خلافت و جانشینی ہے، اس لئے کہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ ”میں جانشین قرار دوں گا“ یہ نہیں فرمایا کہ ”کس کا جانشین“ مزید یہ کہ فرشتوں کے لئے جانشینی کا مسئلہ پیش کرنا، ان میں آدمؑ کا سجدہ بجالانے کے لئے آمادگی ایجاد کرنا مطلوب تھا اور اس آمادگی میں غیر خدا کی طرف سے جانشینی کا کوئی کردار نہیں ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ فرشتوں نے کہا: کیا اس کو خلیفہ بنائے گا جو فساد و خونریزی کرتا ہے جب کہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں، اصل میں یہ ایک مؤدبانہ درخواست تھی کہ ہم کو خلیفہ بنادے کیوں کہ ہم سب سے بہتر اور لائق ہیں اور اگر جانشینی خدا کی طرف سے مدنظر نہ تھی تو یہ درخواست بھی بے وجہ تھی، اس لئے کہ غیر خدا کی طرف سے جانشینی اتنی اہمیت نہیں رکھتی ہے کہ فرشتے اس کی درخواست کرتے، نیز غیر خدا سے جانشینی حاصل کرنے کے لئے تمام اسماء کا علم یا ان کو حفظ کرنے کی توانائی لازم نہیں ہے، پس خلافت سے مراد خداوند عالم کی جانشینی ہے۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ خداوند عالم کی جانشینی صرف ایک اعتباری جانشینی نہیں ہے بلکہ تکوینی جانشینی ہے جیسا کہ آیت کے سیاق وسباق سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے خداوند عالم فرماتا ہے ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسمَاءَ كُلَّهَا﴾ ”اور خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دی“ فرشتوں کو خداوند عالم کی طرف سے جناب آدمؑ کے سجدہ کرنے کا حکم ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ خلافت، خلافت تکوینی (عینی حقائق میں تصرف) کو بھی شامل ہے۔[1] خلافت تکوینی کا اعلیٰ رتبہ، خلیفۃ اللہ کو قوی بناتا ہے تاکہ خدائی کام انجام دے سکے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ ولایت تکوینی کا مالک ہو جائے۔

---

(۱) تشریعی خلافت سے مراد، لوگوں کی ہدایت اور قضاوت کے منصب کا عہدہ دار ہونا ہے۔ اور خلافت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص خدا کے ایک، چند یا تمام اسماء کا مظہر بن جائے اور صفات باری تعالیٰ اس کے ذریعہ مرحلہ عمل یا ظہور میں واقع ہوں۔

خلافت کے لئے حضرت آدمؑ کے لائق ہونے کا معیار

آیۂ کریمہ کے ذریعہ ﴿وَعَلَّمَ آدمَ الأسماءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُم عَلَىٰ المَلائِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسمَآءِ هٰؤُلَآءِ إِن كُنتُم صَادِقِينَ﴾[1] "اور حضرت آدمؑ کو تمام اسماء کا علم دے دیا پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان اسماء کے نام بتاؤ" یہ اچھی طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خلافت خدا کے لئے حضرت آدمؑ کی معیار قابلیت، تمام اسماء کا علم تھا۔ اس مطلب کی سورۂ بقرہ کی ۳۳ویں آیت بھی تائید کرتی ہے۔

لیکن یہ کہ اسماء سے مراد کیا ہے اور خداوند عالم نے کس طرح حضرت آدمؑ کو ان کی تعلیم دی اور فرشتے ان اسماء سے کیونکر بے خبر تھے اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث ہوئی ہے۔ جس کو ہم پیش نہیں کریں گے صرف ان میں سے پہلے مطلب کا بطور اختصار ذکر کریں گے، آیات قرآن میں وضاحت کے ساتھ یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ ان اسماء سے مراد کن موجودات کے نام ہیں اور روایات میں ہم دو طرح کی روایات سے روبرو ہیں، جس میں سے ایک قسم نے تمام موجودات کے نام اور دوسری قسم نے چہاردہ معصومینؑ کے نام کا ذکر کیا ہے۔[2] لیکن حضرت آدمؑ کی خلافت تکوینی کی وجہ اور اس بات پر قرآن کی تائید کہ خداوند عالم نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم دیا سے مراد یہ ہے کہ موجودات، فیض خدا کا وسیلہ بھی ہوں اور خداوند عالم کے اسماء بھی ہوں اور کسی چیز سے چشم پوشی نہ ہوئی ہو۔

مخلوقات کے اسماء سے حضرت آدمؑ کا آگاہ ہونا اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف سے خلافت اور جانشینی کے حدود کو ان کے اختیار میں قرار دیا جائے۔ اور اسماء خداوند عالم کے جاننے کا مطلب، مظہر اسماء الٰہی ہونے کی قدرت ہے یعنی ولایت تکوینی کا ملنا ہے

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۳۱

[2] ملاحظہ ہو: مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۱۱ ص ۱۴۵۔ ۱۴۷، ج ۲۶ ص ۲۸۳۔

اور اسماء کا جاننا، فیض الٰہی کا ذریعہ ہے، یہ انہیں خلافت کے حدود میں تصرف کے طریقے بتاتا ہے اور اس وضاحت سے ان دو طرح کی روایات کے درمیان ظاہری اختلاف اور ناہماہنگی برطرف ہو جاتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسماء سے مراد اس کا ظاہری مفہوم نہیں ہے جس کو ایک انسان فرض، اعتبار اور واضح کرتا ہے، اسی طرح ان اسماء کی تعلیم کے معنی بھی ان الفاظ وکلمات کا ذہن میں ذخیرہ کرنا نہیں ہے، اس لئے کہ مذکورہ طریقہ سے ان اسماء کا جاننا کسی بھی صورت میں خلافت الٰہی کے لئے معیار قابلیت اور خلافت تکوینی کے حصول کے لئے کوئی اہم رول نہیں ادا کر سکتا ہے، اس لئے کہ اگر علم حصولی کے ذریعہ اسماء وضعی اور اعتباری کا حفظ کرنا اور یاد کرنا مراد ہوتا تو حضرت آدمؑ کے خبر دینے کے بعد چونکہ فرشتہ بھی ان اسماء سے آگاہ ہو گئے تھے لہٰذا انہیں بھی خلافت کے لائق ہونا چاہیئے تھا بلکہ اس سے مراد چیزوں کی حقیقت جاننا ان کے اور اسماء خداوند عالم کے بارے میں حضوری معرفت رکھنا ہے جو تکوینی تصرف پر قدرت کے ساتھ ساتھ حضرت آدمؑ کے وجود کی برتری بھی ہے۔[1]

---

[1] بعض مفسرین نے احتمال دیا ہے کہ ''اسماء'' کا علم مافوق عالم وملائکہ ہے، یعنی اس کی حقیقت ملائکہ کی سطح سے بالاتر ہے کہ جس عالم میں وجود کی معرفت میں ترقی اور وجود ملائکہ کے رتبہ وکمال سے بالاتر کمال رکھتا ہے اور وہ عالم، عالم خزائن ہے جس میں تمام اشیاء کی اصل وحقیقت ہے اور اس دنیا کی مخلوقات اسی حقیقت اور خزائن سے نزول کرتی ہیں ﴿وَإِن مِّن شَیْءٍ إِلاَّ عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلاَّ بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (حجر/۲۱) ''اور ہمارے یہاں تو ہر چیز کے بے شمار خزانے پڑے ہیں اور ہم ایک نپی، تلی مقدار ہی بھیجتے ہیں'' ملاحظہ ہو: محمد حسین طباطبائی کی المیزان فی تفسیر القرآن، کے ذیل آیت ہے۔

حضرت آدمؑ کے فرزندوں کی خلافت

حضرت آدمؑ کے تخلیق کی گفتگو میں خداوند عالم کی طرف سے خلافت اور جانشینی کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ اور سورۂ بقرہ کی ۳۰ ویں آیت نے بہت ہی واضح طور پر خلافت کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اب یہ سوال درپیش ہے کہ کیا یہ خلافت حضرت آدمؑ سے مخصوص ہے یا دوسرے افراد میں بھی پائی جا سکتی ہے؟

جواب یہ ہے کہ: مذکورہ آیت حضرت آدم کی ذات میں خلافت کے انحصار پر نہ صرف دلالت نہیں کرتی ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جملہ ﴿أَتَجعَلُ فِيهَا مَن يُفسِدُ فِيهَا وَ يَسفِكُ الدِّمَاءَ﴾ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خلافت حضرت آدمؑ کی ذات سے منحصر نہیں ہے، اس لئے کہ اگر صرف حضرت آدمؑ سے خلافت مخصوص ہوتی تو چونکہ حضرت آدمؑ معصوم ہیں اور معصوم فساد و خونریزی نہیں کرتا ہے لہٰذا خداوند عالم فرشتوں سے یہ فرما سکتا تھا کہ آدم فساد اور خونریزی نہیں کریں گے، البتہ یہ شبہ نہ ہو کہ تمام افراد بالفعل خدا کے جانشین و خلیفہ ہیں، اس لئے کہ یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ مقرب الٰہی فرشتے جس مقام کے لائق نہ تھے اور جس کی وجہ سے حضرت آدم کا سجدہ کیا تھا، وہ تاریخ کے بڑے بڑے ظالموں کے اختیار میں قرار پائے اور وہ خلافت کے لائق بھی ہوں؟ پس یہ خلافت حضرت آدمؑ اور ان کے بعض فرزندوں سے مخصوص ہے جو تمام اسماء کا علم رکھتے ہیں، لہٰذا اگر چہ نوع انسان خدا کی جانشینی اور خلافت کا امکان رکھتا ہے لیکن جو حضرات عملی طور پر اس مقام کو حاصل کرتے ہیں وہ حضرت آدمؑ اور ان کی بعض اولادیں ہیں جو ہر زمانہ میں کم از کم ان کا ایک فرد سماج میں ہمیشہ موجود ہے اور وہ زمین پر خدا کی حجت ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جس کی روایات میں بھی تاکید ہوئی ہے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو: کلینی، محمد بن یعقوب، الاصول من الکافی، ج۱، ص۱۷۸ و ۱۷۹۔

کرامت انسان

انسان کی کرامت کے سلسلہ میں قرآن مجید کا دو پہلو بیان موجود ہے: قرآن مجید کی بعض آیات میں انسان کی کرامت، شرافت اور دوسری مخلوقات پر اس کی برتری کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور بعض آیات میں انسان کی تذلیل اور اس کو حیوانات سے پست تر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ اسراء کی ۷۰ ویں آیت میں خداوند عالم نے بنی آدم کی تکریم کی ہے اور بہت سی دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں اس کی برتری بیان ہوئی ہے۔[1] سورۂ تین کی چوتھی آیت اور سورۂ مومنون کی ۱۴ ویں آیت میں انسان کی بہترین انداز میں خلقت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے[2] اور دوسری بہت سی آیات میں یوں مذکور ہے کہ جو کچھ بھی زمینوں و آسمانوں میں ہے انسان کے لئے مسخر یا اس کے لئے پیدا کی گئی ہے[3] اور ملائکہ نے اس کا سجدہ کیا ہے، وہ تمام اسماء کا جاننے

۱۔ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلاً﴾ (سورۂ اسراء، آیت: ۷۰) اور ہم نے یقیناً آدمؑ کی اولاد کو عزت دی اور خشکی اور تری میں ان کو لئے پھرے اور انہیں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں اور اپنی بہتیری مخلوقات پر ان کو فضیلت دی۔

۲۔ ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (سورۂ تین، آیت: ۴) یقیناً ہم نے انسان کو بہت اچھے حلیے (سانچے) میں پیدا کیا۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (سورۂ مومنون، آیت: ۱۴) تو خدا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں میں بہتر ہے۔

۳۔ ﴿أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً﴾ (سورۂ لقمان، آیت: ۲۰) کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا ہی نے یقینی طور پر تمہارا تابع کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً﴾ (سورۂ بقرہ، آیت: ۲۹) اور وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔

والا، مقام خلافت[1] اور بلند درجات[2] کا حامل ہے، یہ تمام چیزیں دوسری مخلوقات پر انسان کی برتری، شرافت اور کرامت کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور دوسری طرف ضعیف ہونا[3] لالچی ہونا[4] ظالم و ناشکرا[5] اور جاہل ہونا[6] چوپائے کی طرف بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہونا[7] اور پست ترین درجہ میں ہونا[8] یہ وہ امور ہیں جو قرآن مجید کی بعض دوسری آیات میں بیان ہوئے ہیں اور دوسری مخلوقات پر انسان کی عدم برتری کی علامت ہے بلکہ ان کے مقابلہ میں انسان کے پست تر ہونے کی علامت ہے، کیا یہ دو طرح کی آیات ایک دوسرے کی متناقض ہیں یا ان میں سے ہر ایک کسی خاص مرحلہ کو بیان کر رہی ہے یا مسئلہ کسی اور انداز میں ہے؟

مذکورہ آیات میں غور و فکر ہمیں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ انسان قرآن کی نظر میں دو طرح کی کرامت رکھتا ہے: کرامت ذاتی یا وجود شناسی اور کرامت اکتسابی یا اہمیت شناسی۔

---

[1] یہ آیات خلافت الٰہی کی بحث میں بیان ہو چکی ہیں۔

[2] اس حصہ کی آیتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

[3] ﴿وَ خُلِقَ الإنسَانُ ضَعِيفاً﴾ (سورۂ نساء، آیت: ۲۸) اور انسان کمزور خلق کیا گیا ہے۔

[4] ﴿إنَّ الإنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً﴾ (سورۂ معارج، آیت: ۱۹) یقیناً انسان بہت لالچی پیدا ہوا ہے۔

[5] ﴿إنَّ الإنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ (سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۴) یقیناً انسان بڑا نا انصاف اور ناشکرا ہے۔

[6] ﴿إنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً﴾ (سورۂ احزاب، آیت: ۷۲) یقیناً انسان بڑا ظالم و جاہل ہے۔

[7] ﴿أُولٰئِكَ كَالأنعَامِ بَل هُم أَضَلّ﴾ (سورۂ اعراف، آیت: ۱۷۹) وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

[8] ﴿ثُمَّ رَدَدنَاهُ أَسفَلَ سَافِلِينَ﴾ (سورۂ تین، آیت: ۵) پھر ہم نے اسے پست سے پست حالت کی طرف پھیر دیا۔

کرامت ذاتی

کرامت ذاتی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو خلق کیا ہے کہ جسم کی بناوٹ کے اعتبار سے بعض دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں زیادہ امکانات وسہولیات کا حامل ہے یا اس کے امکانات کی ترکیب وتنظیم اچھے انداز میں ہوئی ہے، بہر حال بہت زیادہ سہولت اور توانائی کا حامل ہے اس طرح کی کرامت، نوع انسان پر خداوند عالم کی مخصوص عنایت کا اشارہ ہے جس سے سبھی مستفیض ہیں، لہٰذا کوئی یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ ان چیزوں سے مزین ہونے کی بنا پر دوسری مخلوق کے مقابلہ میں فخر کرے اور ان کو اپنا انسانی کمال اور معیار کا اعتبار سمجھے یا اس کی وجہ سے مورد تعریف قرار پائے، بلکہ اتنی سہولت والی ایسی مخلوق تخلیق کرنے کی وجہ سے خداوند عالم کی حمد وتعریف کرنی چاہیئے جس طرح وہ خود فرماتا ہے ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰہُ أحسَنُ الخَالِقِینَ﴾ اور سورہ اسرا کی ۷۰ ویں آیت ﴿وَلَقَد کَرَّمنَا بَنِی آدمَ وَحَمَلنَاھُم فِی البَرِّ وَ البَحرِ ورَزَقنَاھُم مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَفَضَّلنَاھُم عَلیٰ کَثِیرٍ مِمَّن خَلَقنَا تَفضِیلا﴾ اور بہت سی آیات جو دنیا اور مافیہا کو انسان کے لئے مسخر ہونے کو بیان کرتی ہیں جیسے'' ﴿وَسَخَّرَ لَکُم مَافِی السَّمٰوَاتِ وَمَافِی الأَرضِ جَمِیعاً مِنہُ﴾[۱] اور جیسے ﴿خَلَقَ لَکُم مَافِی الأَرضِ جَمِیعا﴾ وغیرہ تمام آیات صنف انسان کی کرامت تکوینی پر دلالت کرتی ہیں اور ﴿خُلِقَ الإِنسَانُ ضَعِیفاً﴾[۲] جیسی آیات اور سورۂ اسراء کی ۷۰ ویں آیہ جو کہ بہت سی مخلوقات (نہ کہ تمام مخلوقات) پر انسان کی برتری کو پیش کرتی ہے یعنی بعض مخلوقات پر انسان کی ذاتی عدم برتری کی یاددہانی کراتی ہے۔[۳]

---

[۱] سورۂ جاثیہ، آیت:۱۳۔ [۲] سورۂ نساء، آیت:۲۸

[۳] گذشتہ بحثوں میں غیر حیوانی صلاحیتوں کے سلسلہ میں گفتگو کی ہے اور انسان کی دائمی روح بھی معرفت انسان کی ذاتی اور وجودی کرامت میں شمار ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ کبھی یا ان میں سے بعض انسان کی اعلیٰ خلقت سے مربوط آیات جو متن کتاب میں بھی مذکور ہیں مدنظر ہوں۔

کرامت اکتسابی

اکتسابی کرامت سے مراد ان کمالات کا حاصل کرنا ہے جن کو انسان اپنے اختیاری اعمال صالحہ اور ایمان کی روشنی میں حاصل کرتا ہے، کرامت کی یہ قسم انسان کے ایثار و کوشش اور انسانی اعتبارات کا معیار اور خداوند عالم کی بارگاہ میں معیار تقرب سے حاصل ہوتا ہے یہ وہ کرامت ہے جس کی وجہ سے یقیناً کسی انسان کو دوسرے انسان پر برتر جانا جاسکتا ہے، تمام لوگ اس کمال وکرامت تک رسائی کی قابلیت رکھتے ہیں، لیکن کچھ ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ اس سے بے بہرہ رہتے ہیں، گویا اس کرامت میں نہ تو تمام لوگ دوسری مخلوقات سے برتر ہیں اور نہ تمام لوگ دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں پست یا مساوی ہیں لہٰذا وہ آیتیں جو انسان کی کسبی کرامت کو بیان کرتی ہیں دو طرح کی ہیں:

الف: کرامت اکتسابی کی نفی کرنے والی آیات

اس سلسلہ کی موجودہ آیات میں سے ہم صرف چار آیتوں کے ذکر پر اکتفا کر رہے ہیں:

۱۔ ﴿ثُمَّ رَدَدنَاهُ أَسفَلَ سَافِلِينَ﴾[۱]

پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت کی طرف پھیر دیا۔

بعض انسانوں سے اکتسابی کرامت کی نفی اس بنا پر ہے کہ گذشتہ آیت میں انسان کی بہترین شکل وصورت میں خلقت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور بعد کی آیت میں اچھے عمل والے اور مومنین اسفل السافلین میں گرنے سے مستثنیٰ قرار پائے ہیں اگر ان کا یہ گرنا اور پست ہونا اختیاری نہ ہوتا تو انسان کی خلقت بیکار ہوجاتی اور خداوند عالم کا یہ عمل کہ انسان کو بہترین شکل میں پیدا کرے اور اس کے بعد بے وجہ اور انسان کے اختیار یا اس سے غلطی سرزد نہ ہوتے ہوئے بھی

---

[۱] سورۂ تین، آیت:۵۔

سب سے پست مرحلہ میں ڈالنا غیر حکیمانہ ہے مزید یہ کہ بعد والی آیت بیان کرتی ہے کہ ایمان اور اپنے صالح عمل کے ذریعہ، انسان خود کو اس حالت سے بچا سکتا ہے، یا اس مشکل میں گرنے سے نجات حاصل کر سکتا ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نزول انسان کے اختیاری اعمال اور اکتسابی چیزوں کی وجہ سے ہے۔

۲۔ ﴿أولئک کالأنعام بَل هُم أَضَلُّ أُولِئکَ هُمُ الغافِلُونَ﴾[۱]

یہ لوگ گویا جانور ہیں بلکہ ان سے بھی کہیں گئے گذرے ہیں یہی لوگ غافل ہیں۔

۳۔ ﴿إنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الصُّمُّ البُکمُ الَّذِینَ لا یَعقِلُونَ﴾[۲]

بیشک کہ زمین پر چلنے والوں میں سب سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو کبھی نہیں سمجھتے ہیں۔

۴۔ ﴿إنَّ الإنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً إِذَامَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً وَإِذَامَسَّهُ الخَیرُ مَنُوعاً﴾[۳]

بیشک انسان بڑا لالچی پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف پہونچتی ہے تو بے صبر ہو جاتا ہے اور جب اس تک بھلائی اور خیر کی رسائی ہوتی ہے تو اترانے لگتا ہے۔

مذکورہ دو ابتدائی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ عقل وفکر کا استعمال نہ کرنے اور اس کے مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ سے انسانوں کی مذمت کی گئی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں کرامت سے مراد کرامت اکتسابی ہے چونکہ بعد والی آیت نماز پڑھنے والوں کو نماز پڑھنے اور ان کے اختیاری اعمال کی بنا پر استثناء کرتی ہے لہٰذا تیسری آیت اکتسابی کرامت سے مربوط ہے۔

---

[۱] سورۂ اعراف، آیت: ۱۷۹۔

[۲] سورۂ انفال، آیت: ۲۲۔

[۳] سورۂ معارج، آیت: ۱۹-۲۱۔

ب: کرامت اکتسابی کو ثابت کرنے والی آیات

اس سلسلہ میں بھی بہت سی آیات موجود ہیں جن سے ہم دو آیتوں کا مثال کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

۱۔﴿إِنَّ أَكرَمَكُم عِندَاللّٰهِ أَتقكُم﴾[1]

۲۔ان آیات کا مجموعہ جو کسبی کرامت کی نفی کے بعد بعض انسانوں کو اس سے استثناء کرتی ہیں جیسے ﴿إِنَّ الإنسَانَ لَفِی خُسرٍ إلا الَّذِینَ آمَنُوا [2] ثُمَّ رَدَدنَاهُ أَسفَلَ سَافِلِینَ إلا الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَات [3] ﴿إِنَّ الإنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً...... إلا المُصَلِّینَ﴾[4]

جیسا کہ اشارہ ہوا کہ اکتسابی کرامت کے اختیار سے وابستہ ہے اور اس کو حاصل کرنا جیسا کہ گذشتہ آیتوں میں آچکا ہے کہ تقوی، ایمان اور اعمال صالحہ کے بغیر میسر نہیں ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں وسیع اور قدیمی مسئلہ ''انسان کا اشرف المخلوقات ہونا'' وغیرہ بھی واضح و روشن ہو جاتا ہے، اس لئے کہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے مراد دوسری مخلوقات خصوصاً مادی دنیا کی مخلوقات کے مقابلہ میں مزید سہولت اور بہت زیادہ توانائی کا مالک ہونا ہے (چاہے قابلیت، بہتر اور بہت زیادہ امکانات کی صورت میں ہو) اپنے اور قرآنی نظریہ کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے۔اور وہ مطالب جو انسان کی غیر حیوانی فطرت کی بحث اور کرامت ذاتی ہے مربوط آیتوں میں بیان ہو چکے ہیں ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی

---

[1] سورۂ حجرات، آیت:۱۳۔

[2] سورۂ عصر، آیت:۲و۳۔

[3] سورۂ تین، آیت:۵و۶۔

[4] سورۂ معارج، آیت:۱۹۔

ہیں، اگر چہ ممکن ہے کہ بعض دوسری مخلوقات جیسے فرشتے بعض خصوصیات میں انسان سے بہتر ہوں یا بعض مخلوقات جیسے جن، انسانوں کے مقابلہ میں ہوں[1] لیکن اگر تمام مخلوقات پر انسان کی فوقیت و برتری منظور نظر ہے تب بھی کسی صورت میں ہو تو بھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم کی تمام مخلوقات پر تمام انسان فوقیت اور برتری رکھتے ہیں، البتہ انسانوں کے درمیان ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو خداوند عالم کی ہر مخلوق بلکہ تمام مخلوقات سے برتر ہیں اور اکتسابی کرامت کے اس درجہ و مرتبہ کو حاصل کر چکے ہیں جسے کوئی حاصل ہی نہیں کر سکتا یہ وہی لوگ ہیں جو ولایت تکوینی اور لامحدود خلافت الٰہی کے حامل ہیں۔

اس مقام پر ایک اہم سوال یہ درپیش ہے کہ اگر کرامت اکتسابی انسان سے مخصوص ہے تو قرآن مجید میں کرامت اکتسابی نہ رکھنے والے انسانوں کو کیونکر چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے پست سمجھا گیا ہے؟ اور کس طرح ایک اہم اور معتبر شئی کا ایک امر تکوینی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور ان دونوں مقولوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی کرامت اکتسابی اگر چہ اقدار شناسی کے مقولہ میں سے ہے لیکن یہ ایک حقیقی شئی ہے نہ کہ اعتباری، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر قابل اہمیت شئی ضروری نہیں ہے کہ اعتباری اور وضعی ہو، جب یہ کہا جاتا ہے کہ شجاعت، سخاوت، ایثار و قربانی اعتباری چیزوں میں سے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سخی، ایثار کرنے والے، فداکار شخص کو صرف اعتبار اور وضع کی بنیاد پر اچھا اور لائق تعریف و تمجید سمجھا گیا ہے بلکہ ایسا شخص واقعاً سخاوت، ایثار اور فداکاری نامی حقیقت کا حامل ہے جس سے دوسرے لوگ دور ہیں بس کرامت اکتسابی بھی اسی طرح ہے انسان

---

[1] ایک دوسرے زاویہ سے جس طرح فلسفہ و عرفان اسلامی میں بیان ہوا ہے نیز روایات میں مذکور ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کا نورانی وجود، تمام مخلوقات کے لئے فیضان الٰہی کا واسطہ اور نقطہ آغاز و علت ہے اور علم حیات کے اعتبار سے سب سے رفیع درجات و کمالات کے مالک اور خداوند عالم کی اعلیٰ ترین مخلوق میں سے ہیں۔

کی اکتسابی کرامت صرف اعتباری اور وضعی شئی نہیں ہے بلکہ انسان واقعاً عروج وکمال پاتا یا سقوط کرتا ہے۔ لہٰذا مزید وہ چیزیں جن سے انسانوں کو اکتسابی اور عدم اکتسابی کرامت سے استوار ہونے کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنا چاہیئے اور ایک کو بلند اور دوسرے کو پست سمجھنا چاہیئے، اسی طرح انسانوں کو حیوانات اور دوسری مخلوقات سے بھی موازنہ کرنا چاہیئے اور بعض کو فرشتوں سے بلند اور بعض کو جمادات وحیوانات سے پست سمجھنا چاہیئے اسی وجہ سے سورۂ اعراف کی ۱۷۹ویں آیت میں کرامت اکتسابی نہ رکھنے والے افراد کو چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ بتایا گیا ہے۔ سورہ انفال کی ۲۲ویں آیت میں ''بدترین متحرک'' کا عنوان دیا گیا ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگ آرزو کریں گے کہ اے کاش مٹی ہوتے ﴿وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَالَيْتَنِي كُنتُ تُرَاباً﴾[1] اور کافر (قیامت کے دن) کہیں گے اے کاش میں مٹی ہوتا۔

---

[1] سورۂ نبا، آیت: ۴۰۔

خلاصۂ فصل

۱۔ گذشتہ فصل میں ہم نے ذکر کیا کہ انسان بعض مشترکہ خصوصیات کا حامل ہے بعض مغربی مفکرین نے مثال کے طور پر وہ افراد جو انسان کی سرگرمی کو بنیادی محور قرار دیتے ہیں یا انتہا پسندی کے شکار معاشرہ پرست افراد بنیادی طور پر ایسے عناصر کے وجود کے منکر ہیں اور وہ انسان کی حقیقت کے سادہ لوح ہونے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

اس گروہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی مشترکہ فطرت کو قبول کرتے ہیں لیکن انسان کے اچھے یا برے ہونے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں بعض اس کو برا اور بعض صرف اچھا سمجھتے ہیں بعض نے انسان کو دو پہلو رکھنے والی تصویر سے تعبیر کیا ہے۔

۲۔ قرآن کریم نے اس سوال کے جواب میں جو کہ انسانوں کو بنیادی طور پر اچھی اور بری خواہشات کا حامل جانتے ہیں ان کے معنوی و مادی پہلوؤں کو جدا کر کے تجزیہ و تحلیل کی ہے۔

۳۔ انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک تکوینی شئی ہے یعنی انسان کائنات میں تصرف اور ولایت تکوینی کے مقام کو حاصل کرسکتا ہے اس مقام کو حاصل کرنے کی راہ اور حضرت آدمؑ کی صلاحیت کا معیار تمام اسماء کے بارے میں ان کی حضوری معرفت ہے، اسماء مخلوقات اس کی جانشینی کے اختیارات پر استوار ہے۔ اسماء الٰہی، قدرت اور ولایت تکوینی کو فراہم کرتا ہے اور وسیلہ فیض کے اسماء اس کے لئے اشیاء میں طریقہ تصرف مہیا کرتے ہیں۔

۴۔ حضرت آدمؑ کی اولادوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو مقام خلافت کو حاصل کر چکے ہیں اور روایتوں کے مطابق ہر زمانے میں کم از کم ایک فرد زمین پر خلیفۃ اللہ کے عنوان سے موجود ہے۔

۵۔ انسان دو طرح کی کرامت رکھتا ہے: ایک کرامت ذاتی جو تمام افراد کو شامل ہے

اور باقی مخلوقات کے مقابلہ میں بہتر اور بہت زیادہ امکانات کا حامل ہے اور دوسرا کرامت اکتسابی کہ اس سے مراد وہ مقام و منزلت ہے جس کو انسان اپنی تلاش و جستجو سے حاصل کرتا ہے اور اس معنوی کمال کے حصول کی راہ، ایمان اور عمل صالح ہے اور چونکہ افراد کی آزمائش کا معیار و اعتبار اسی کرامت پر استوار ہے اور اسی اعتبار سے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لہٰذا قرآن کبھی انسان کی تعریف اور کبھی مذمت کرتا ہے۔

تمرین

۱۔گذشتہ فصول کے مطالب کی بنیاد پر انسان مشترکہ فطرت وحقیقت رکھنے کے باوجود رفتار، گفتار، اخلاق واطوار میں مختلف کیوں ہیں۔؟

۲۔عالم ہستی میں انسان کی رفعت ومنزلت اورالٰہی فطرت کے باوجوداوراس کی بہترین ترکیبات سے مزین ہونے کے باوجوداکثرافرادصحیح راستہ سے کیوں منحرف ہوجاتے ہیں؟

۳۔اگرجستجو کا احساس انسان کے اندرایک فطری خواہش ہے تو قرآن نے دوسروں کے کاموں میں تجسس کرنے کی کیوں مذمت کی ہے؟ آیایہ مذمت اس الٰہی اور عالم فطرت کے نظر اندزاکرنے کے معنی میں نہیں ہے؟

۴۔خدا کی تلاش، خودپسندی اور دوسری خواہشوں کوکس طرح سے پوراکیاجائے تاکہ انسان کی حقیقی سعادت کونقصان نہ پہنچے؟

۵۔قرآنی اصطلاح میں روح، نفس، عقل، قلب جیسے کلمات کے درمیان کیارابطہ ہے؟

۶۔انسان کے امانت دارہونے سے مرادکیاہے نیزمصادیق امانت بھی ذکرکریں؟

۷۔غیردینی حقیقی قوانین میں، انسان کی کرامت اکتسابی موردتوجہ ہے یااس کی غیر اکتسابی کرامت؟

۸۔اگرحقیقی اہمیت کامعیارانسان کی کرامت اکتسابی ہے تو مجرم اوردشمن افراد کے علاوہ ان انسانوں کاختم کرناجوکرامت اکتسابی کے حامل نہ ہوں کیوں جائزنہیں ہے؟

۹۔آیاجانشینی اوراعتباری خلافت، جانشین اورخلیفہ کی اہم ترین دلیل ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

ا۔انسان کے جانشین خدا ہونے کے سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے رجوع کریں:

—جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۹) زن در آئینہ جلال و جمال۔تہران: مرکز نشر فرہنگی، رجاء۔

—..........(۱۳۷۲) تفسیر موضوعی قرآن، ج۶، تہران: رجاء۔

—صدر، سید محمد باقر (۱۳۹۹) خلافة الانسان و شهادة الانبياء، قم مطبعة الخيام.

—محمد حسین طباطبائی (۱۳۶۳) خلقت وخلافت انسان در المیزان۔گردآورندہ شمس الدین ربیعی، تہران، نور فاطمہ۔

—محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم، موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

—مطہر، مرتضی (۱۳۷۱) انسان کامل، تہران: صدرا۔

—موسوی یزدی، علی اکبر و دیگران (۱۳۹۹) الامامة والولاية فى القرآن الكريم: مطبعة الخيام.

—تفاسیر قرآن، سورہ بقرہ کی ۳۰ویں آیت کے ذیل میں۔

۲۔انسان کی کرامت کے سلسلہ میں:

—جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۲) کرامت در قرآن، تہران: مرکز نشر فرہنگی رجاء۔

—مصباح، محمد تقی (۱۳۶۷) معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم موسسہ در راہ حق۔

—واعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان از دیدگاہ اسلام۔قم: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ۔

٧

آزادی اور اختیار

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔ انسان کے سلسلہ میں تین اہم نظریات بیان کریں؟

۲۔ مفہوم اختیار کی وضاحت کریں اور اس کے مفہوم کے چار موارد استعمال ذکر کریں؟

۳۔ قرآن مجید کی ان آیات کی تقسیم بندی اور تفسیر کریں جو انسان کے مختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں؟

۴۔ انسان کے اختیار کو مشکوک کرنے والے شبہات کی وضاحت کریں؟

۵۔ انسان کے جبر سے متعلق، شبہات کی اقسام نیز ان کا تحلیل و تجزیہ کریں؟

جو اعمال انسان سے صادر ہوتے ہیں ایک عام تقسیم کے اعتبار سے دو گروہ میں تقسیم ہوتے ہیں:

جبری اعمال جو بغیر ارادے اور قصد کے انجام پاتے ہیں اور اختیاری اعمال جو انتخاب اور انسان کے ارادوں کے نتیجہ میں عالم وجود میں آتے ہیں، دوسرے گروہ کے متعلق، کام کا انجام دینے والا خود اس کام کی علت اور اس کام کا حصہ دار سمجھا جاتا ہے، اسی بنا پر اس انجام دیئے گئے کام کے مطابق ہم اس کو لائق تعریف یا مذمت سمجھتے ہیں، تمام اخلاقی دینی، تربیتی اور حقوقی قوانین اسی یقین کی بنیاد پر استوار ہیں۔

کسی کام کو انجام دے کر خوش ہونا یا افسوس کرنا، عذر خواہی یا دوسرے سے مربوط کام کے مقابلہ میں حق طلب کرنا بھی اسی سچائی پر یقین اور بھروسہ کی بنیاد پر ہے۔ دوسری طرف یہ بات قابل قبول ہے کہ انسان کے اختیاری طریقہ عمل میں مختلف تاریخی، اجتماعی، فطری، طبیعی عوامل موثر ہیں۔ اس طرح سے کہ وہ اس کی انجام دہی میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور انسان ہر پہلو میں بے قید و شرط اور مطلقاً آزادی کا حامل نہیں ہے۔

دینی تعلیمات میں قضا و قدر اور الٰہی ارادے اور غیب کا مسئلہ انسان کے اختیاری اعمال سے مربوط ہے اور مذکورہ امور سے انسان کا ارادہ و اختیار، نیز اس کا آزاد ہونا کس طرح ممکن ہے؟ اس کو بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ مسائل کو انسان کے بنیادی مسئلہ اختیار سے مربوط جاننا چاہیئے اور زندگی سنوارنا

اس کرامت کو حاصل کرنا ہے جس کے بارے میں گذشتہ فصل میں گفتگو ہو چکی ہے[1] انہیں چیزوں کی وجہ سے انسان کے اختیار کا مسئلہ مختلف ملتوں اور مختلف علمی شعبوں کے دانشوروں اورادیان و مذاہب کے مفکرین اور ماننے والوں کے درمیان ایک اہم اور سرنوشت ساز مسئلہ کے عنوان سے مورد توجہ قرار پایا ہے لہذا اس کے بارے میں مختلف سوالات اور بحث و مباحثہ کے علاوہ مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

مندرجہ ذیل سوالات وہ ہیں جن کے بارے میں ہم اس فصل میں تجزیہ و تحلیل کریں گے۔

۱۔ اختیار سے مراد کیا ہے؟ آیا یہ مفہوم، مجبوری (اضطرار) اور ناپسندیدہ (اکراہ) کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے؟

۲۔ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کے بارے میں قرآن کا کیا نظریہ ہے؟

۳۔ انسان کے اختیاری اعمال میں قضا و قدر، اجتماعی قوانین، تاریخی، فطری نیز طبیعی عوامل کا کیا کردار ہے اور یہ سب باتیں انسان کے آزاد ارادہ سے کس طرح سازگار ہیں؟

۴۔ کیا علم غیب اور خدا کا عام ارادہ (ارادۂ مشیت) جو انسان کے اختیاری اعمال میں بھی شامل ہے انسان کے مجبور ہونے کا سبب ہے؟

---

[1] گذشتہ فصل میں انسان کی کرامت اکتسابی کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور ہم نے ذکر کیا کہ انسان کی کرامت اکتسابی اس کی اختیاری تلاش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی جو کچھ اس فصل میں اور آئندہ فصل میں بیان ہوگا، اس کا شمار کرامت اکتسابی کے اصول میں ہوگا اور انسان کے مسئلہ اختیار کے حل کے بغیر کرامت اکتسابی کا کوئی معنی و مفہوم نہیں ہے۔

انسان کی آزادی کے سلسلہ میں تین اہم نظریات

انسان کے اختیار اور جبر کا مسئلہ بہت قدیمی ہے اور شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی آخرت کے مسئلہ کے بعد جبر و اختیار کی بحث سے زیادہ انسان شناسی کے کسی مسئلہ کے بارے میں یوں گفتگو مختلف ملتوں اور مذاہب کے ماننے والوں اور معاشرہ کی مختلف قوموں کے درمیان چاہے وہ دانشور ہوں یا عوام، رائج نہ تھی، پہلے تو یہ مسئلہ کلامی، دینی اور فلسفی پہلوؤں سے زیادہ مربوط تھا لیکن علوم تجربی کی خلقت و وسعت اور علوم انسانی کے باب میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ سے جبر و اختیار کی بحث علوم تجربی سے بھی مربوط ہوگئی اسی لئے علوم تجربی کی بحث میں مفکرین خصوصاً علوم انسانی کے ماہرین نے اپنے نظریات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ایک طرف تو اختیار ،انسان کا ضمیر اور بہت سی دلیلوں کا وجود اور دوسری طرف اختیاری اعمال اور اس کے اصول میں بعض غیر اختیاری اعمال کا موثر ہونا اور بعض فلسفی اور دینی تعلیمات میں غلط فہمی کی بنا پر مختلف نظریات بیان ہوئے ہیں بعض نے بالکل انسان کے اختیار کا انکار کیا ہے اور بعض لوگوں نے اختیار انسان کو تسلیم کیا ہے اور بعض لوگوں نے جبر و اختیار کے ناکارہ ہونے کا یقین رکھنے کے باوجود دونوں کو قبول کیا ہے حالانکہ کوئی معقول وجہ و جواز اس کے متعلق پیش نہیں کیا ہے۔

رواقی وہ افراد ہیں جو انسان کے اچھے یا برے ہونے کی ذمہ داری کو خود اسی کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں۔اور دنیا کے تمام حوادث منجملہ انسان کے اختیاری اعمال کو بھی انسان کے ذریعہ غیر قابل تغییر، تقدیر الٰہی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

اسلامی سماج و معاشرہ میں اشاعرہ نے جبر کے مسلک کو قبول کیا ہے[1] اور معتزلہ نے

---

[1] اشاعرہ، جہمیہ کے برخلاف انسان کو اس کے اختیاری اعمال میں جمادات کی طرح سمجھتے تھے اس یقین پر کہ انسان کا فعل، قدرت وارادۂ خدا سے مربوط ہونے کے باوجود خداوند عالم اپنے اردہ اور قدرت کے ساتھ انسان

بقیہ حاشیہ اگلے ص پر......

تفویض کو قبول کیا ہے اوران لوگوں نے کہا ہے کہ انسان کے اختیاری اعمال خداوند عالم سے الگ اس کی قدرت وانتخاب کی وجہ سے انجام پاتے ہیں[1] اس نظریہ کے مشابہ دنیا کی تمام مخلوقات کے سلسلہ میں بعض عیسائی اور مغربی دانشوروں کے نظریئے بیان ہوئے ہیں۔[2]

اسلامی سماج اور معاشرہ میں تیسرا نظریہ، اہل بیتؑ اوران کے ماننے والوں کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ میں انسان اپنے اختیاری فعل میں نہ مجبور ہے اور نہ ہی آزاد بلکہ ان دونوں کے درمیان کی ایک حقیقت ہے:

''لَاجَبرَ ولاَ تَفوِیضَ بَل أمرٌبَینَ الأمرَین''۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کے اعمال میں نہ صرف یہ کہ انسان کے خدا کے ساتھ سرگرم ہونے میں کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ خدااور انسان کی صحیح شناخت کا تقاضا اور واقعی واختیاری فعل کی حقیقت کو دقیق درک کرنا ہے۔

عقیدۂ جبر، اسلام سے پہلے عرب کے جاہل مشرکوں کے یہاں بھی موجود تھااور قرآن مجید

بقیہ پچھلے ص کا حاشیہ......

کے اندر قدرت وارادہ ایجاد کرتا ہے اوراس فعل سے انسان کا ارادہ مربوط ہوتا ہے۔ اوراس حقیقت (فعل سے انسان کے ارادہ کے مربوط ہونے) کو کسب کہا ہے۔ لیکن ہر اعتبار سے انسان کے لئے تحقق فعل میں کسی تاثیر کے قائل نہیں ہیں ملاحظہ ہو: تھانوی، محمد علی، کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم مکتبہ لبنان ناشرون بیروت:۱۹۹۶۔

[1] کہا گیا ہے کہ بعض معتزلہ کے علماء جیسے ابوالحسن بصری اور نجار، تفویض کا اعتقاد رکھتے تھے۔

[2] سنت عیسائیت میں خداوند عالم نے دنیا کو چھ روز میں خلق کیا ہے اور ساتویں روز آرام کیا ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر دنیا اس گھڑی کی مانند ہے جس میں خداوند عالم نے آغاز خلقت ہی میں چابی بھر دیا ہے اوراس کے بعد دنیا خدا سے جدا اور مستقل ہو کر اپنی حرکت پر باقی ہے۔

ایک غلط نظریہ کے عنوان سے نقل کرتے ہوئے اس فکر کے فرسودہ ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور فرماتا ہے:

﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشرَكُوا لَو شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشرَكنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمنَا مِن شَيئٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبلِهِم﴾[1]

عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گذر چکے ہیں جھٹلاتے رہے۔

دوسری آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ مشرکین کا اعتقاد ہر طرح کی علمی حمایت سے دور ہے اور یہ نظریہ صرف نصیحت پر مبنی ہے، یوں فرماتا ہے:

﴿وَقَالُوا لَو شَاءَ الرَّحمٰنُ مَا عَبَدنَاهُم مَّا لَهُم بِذٰلِكَ مِن عِلمٍ إِن هُم إِلَّا يَخرُصُونَ﴾[2]

اور کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی پرستش کرتے ان کو اس کی کچھ خبر ہی نہیں یہ لوگ تو بس الٹی سیدھی باتیں کیا کرتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں جاہل عرب کے عقیدۂ جبر کا قرآن کے نازل ہونے اور اسلام کی شدید مخالفت کے بعد اس کا کوئی مقام نہیں رہا۔ اگر چہ کبھی کبھی اس سلسلہ میں بعض مسلمان بزرگان دین سے سوالات کر کے جوابات حاصل کیا کرتے تھے[3] لیکن حکومت بنی امیہ کے تین

---

[1] سورۂ انعام، آیت: ۱۴۸۔ [2] سورۂ زخرف، آیت: ۲۰۔

[3] مثال کے طور پر امام علیؑ نے اس شخص کے جواب میں جس نے قضا و قدر الٰہی کو جبر سے ملا دیا تھا، فرمایا۔۔ کیا تم گمان کر رہے ہو کہ (جو کچھ جنگ صفین میں اور دوران سفر ہم نے انجام دیا ہے) ہمارے اختیار سے خارج حتمی او جبری قضا و قدر تھا؟ اگر ایسا ہی ہے تو سزا و جزا، امر و نہی سب کچھ غلط اور بے وجہ ہے۔ صدوق، ابن بابویہ، التوحید، مکتبۃ الصدوق، تہران: ۱۳۸۷ھ، ص ۳۸۰۔

اموی خلفاء نے اسلامی شہروں میں اپنے ظلم کے جواز کے لئے عقیدۂ جبر کو رواج دیا اور اس نظریئے کے مخالفین سے سختی سے پیش آتے رہے، ان لوگوں نے اپنے جبری نظریہ کے جواز کے لئے بعض آیات و روایات سے بھی استفادہ کیا تھا، تفویض کا نظریہ جو معتزلہ کی طرف سے بیان ہوا ہے عقیدہ جبر کے ماننے والوں کی سخت فکری و عملی مخالفت نیز عقیدہ جبر کے مقابلہ میں یہ (تفویض کا نظریہ) ایک طرح کا ردعمل تھا۔ جب کہ آیات و روایات اور پیغمبر نیز ان کے سچے ماننے والوں کی زندگی کا طرز عمل بھی مذکورہ دونوں نظریوں کی تائید نہیں کرتا ہے بلکہ اہل بیتؑ کے نظریہ "الامر بین الامرین" سے مطابقت رکھتا ہے۔

بہر حال اگرچہ عقلی، نقلی اور اندرونی (ضمیر) تجربہ کے ذریعہ انسان کے اختیار کا مسئلہ ایک غیر قابل انکار چیز ہے جس پر بہت سے تجربی دلائل گواہ ہیں لیکن سیاسی اور بعض دینی و فلسفی تعلیمات سے غلط استفادہ اور اس سلسلہ میں بیان کئے گئے شبہات کے جوابات میں بعض فکری مکاتب کی ناتوانی کی بنا پر اسلامی معاشرہ کا ایک گروہ عقیدۂ جبر کی طرف مائل ہو گیا اور وہ لوگ اس کے معتقد ہو گئے [1] البتہ یہ چیز اسلامی معاشرہ سے مخصوص نہیں ہے دوسرے مکاتب فکر کے دانشوروں کے درمیان اور متعدد غیر مسلم فرق و مذاہب میں بھی اس عقیدے کے حامی افراد موجود ہیں۔[2]

---

[1] اس سلسلہ میں مغربی مفکرین وفلاسفہ کے نظریات کو ہم "ضمائم" میں بیان کریں گے۔

[2] انسانی علوم تجربی کے بعض غیر مسلم مفکرین وفلاسفہ کے نظریات "ضمائم" میں بیان ہوں گے۔

مفہوم اختیار

لفظ اختیار مختلف جہات سے مستعمل ہے یہاں انسان کے اختیار کے معنی کو واضح کرنے کے لئے جو کرامت اکتسابی کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے چار موارد ذکر کئے جا رہے ہیں۔

ا۔ اضطرار اور مجبوری کے مقابلہ میں اختیار

کبھی انسان کسی خاص شرائط اور ایسے حالات و مقامات میں گھر جاتا ہے جس کی بنا پر مجبور ہو کر کسی عمل کو انجام دیتا ہے مثال کے طور پر ایک مسلمان بیابان میں گم ہو جاتا ہے اور راستہ بھول جاتا ہے بھوک اور پیاس اسے اس حد تک بے چین کر دیتی ہے جس کی وجہ سے اس کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے لیکن ایک مردار کے علاوہ اس کے سامنے کوئی غذا نہ ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے مجبوراً اس حیوان کے گوشت کو اتنی ہی مقدار میں استعمال کر سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ موت سے نجات حاصل کر سکے، اس مقام پر کہا جائے گا کہ اس شخص نے اپنی خواہش اور اختیار سے مردار گوشت نہیں کھایا بلکہ وہ مجبور تھا اور اضطرار کی وجہ سے مردار کے گوشت کو مصرف کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید اس کی غذا کے جائز ہونے کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيكُمُ المَيتَةَ و ... فَمَنِ اضطُرَّ غيرَ بَاغٍ وَلا عَادٍ فَلا إِثمَ عَلَيهِ﴾[1]

اس نے تو تم پر بس مردہ جانور اور ... لہٰذا جو شخص مجبور ہو اور سرکشی کرنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو تو اس پر گناہ نہیں ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۱۷۳۔

۲۔ اکراہ کے مقابلہ میں اختیار

کبھی خود انسان کسی کام کے انجام دینے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے یا کسی کام سے نفرت کرتا ہے لیکن ایک دوسرا شخص اس کو ڈراتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لئے مجبور کرتا ہے اس طرح کہ اگر اس شخص کا خوف نہ ہوتا تو وہ اس کام کو انجام نہ دیتا اس مسلمان کی طرح جو اسلامی دشمنوں کی طرف سے قتل ہو جانے کے خوف کی بنا پر ظاہر میں زبان سے اظہار کفر کرتا ہے، اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ اس نے با اختیار اس عمل کو انجام نہیں دیا، جیسا کہ سورۂ نحل کی ۱۰۶ ویں آیت میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلاَّ مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيمَانِ﴾

جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے سوائے اس شخص کے جو اس عمل پر مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو۔[۱]

اضطرار سے اکراہ کا فرق یہ ہے کہ اکراہ میں دوسرے شخص کا خوف زدہ کرنا بیان ہوتا ہے جب کہ اضطرار میں ایسا نہیں ہے بلکہ بیرونی حالات اور صورت حال اس عمل کی متقاضی ہوتی ہے۔

۳۔ اختیار یعنی انتخاب و آزمائش کے بعد ارادہ

جب بھی انسان کے سامنے کسی کام کے انجام دینے کے لئے متعدد راہیں ہوں تو وہ اس کا تجزیہ کرتا ہے اسے خوب پرکھتا ہے اس کے بعد ایک راہ کا انتخاب کرتا ہے اور اسی کے مطابق اس کام کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ کام اختیار کے ساتھ انجام پایا ہے لیکن اگر کوئی کام سوچے سمجھے بغیر انتخاب اور اس کا ارادہ کرلیا گیا تو کہا جائے گا کہ یہ کام غیر اختیاری طور پر سرزد ہوا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کے ہاتھ میں رعشہ ہو اور اس کا ہاتھ حرکت دینے کے ارادہ کے بغیر ہی لرز رہا ہو۔

---

[۱] سورۂ نحل، آیت: ۱۰۶۔

۴۔ اختیار یعنی رغبت، محبت اور مرضی کے ساتھ انجام دینا

اس استعمال میں آزمائش اور انتخاب کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کسی کام میں صرف اکراہ اور مجبوری نہ ہو اور وہ کام کسی کی رضایت اور خواہش کے ساتھ انجام پائے تو اس کام کو اختیاری کہا جاسکتا ہے، خدا اور فرشتوں کے کام میں اسی طرح کا اختیار ہے، اس معنی کے مطابق خداوند عالم اور فرشتوں کے کام، اختیاری ہیں البتہ ان کی طرف سے کسی کام کے انجام پانے کے لئے آزمائش اور انتخاب کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے مثال کے طور پر خداوند عالم اپنے کام کے انجام دینے میں تجزیہ و تحلیل اور انتخاب کی حاجت نہیں رکھتا ہے اور اس کے لئے کسی بھی چیز میں ایسا ارادہ جو پہلے نہ رہا ہو تصور نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ مختار ہونے کا یہ معنی ہے کہ خواہش، رغبت اور فاعل کی خود اپنی مرضی سے وہ کام انجام پائے[۱]۔

اس وضاحت سے ارادہ واختیار میں موجود اہم اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے، اس اعتراض میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر اختیاری کام سے پہلے ایک ارادہ کا ہونا ضروری ہے تو خود ارادہ کرنا بھی تو ایک نفسیاتی کام ہے لہٰذا اس سے پہلے بھی ایک ارادہ ہونا چاہیئے اور یہ تسلسل باقی رہے گا جو کہ محال ہے لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ارادہ کوئی ارادی کام نہیں ہے اور ضروری نہیں ہے کہ اس کے پہلے بھی ایک ارادہ ہو بلکہ یہ ایک اختیاری کام ہے اور ارادہ واختیار میں بہت فرق ہے، چونکہ حقیقی عامل وسبب نفس انسان ہے اور اس میں کوئی اضطرار و مجبوری نہیں ہے لہٰذا کام اختیاری ہے چاہے اس کے پہلے کوئی ارادہ نہ رہا ہو۔

---

[۱] کام کو انسان کے اختیاری ہونے کو اس کے ارادہ سے ملانا نہیں چاہیئے، کسی کام کے ارادی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس ارادہ سے پہلے ایک ارادہ ہو اور وہ کام بھی ارادہ سے پہلے ہو لیکن اختیاری ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کام کے صدور میں حقیقی عامل کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود وہ شخص ہے۔ اس بیان کے مطابق خود ارادہ انسان کے لئے بھی ایک اختیاری کام موجود ہے اگر چہ وہ ایک ارادی کام نہیں ہے یعنی ارادہ کرنے کے لئے کسی سابق ارادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ چار معانی میں سے جو انسان کے اختیاری کاموں میں مورد نظر ہے نیز کرامت اکتسابی کے حاصل کرنے کا طریقۂ عمل بھی ہے وہ تیسرا معنی ہے۔ یعنی جب بھی انسان متعدد موجودہ راہوں اور کام کے درمیان تجزیہ و تحلیل کے ذریعہ کسی کام کا انتخاب کرلے اور اس کے انجام کا ارادہ کرلے تو اس نے اختیاری کام انجام دیا ہے اور اپنی اچھی یا بری سرنوشت کی راہ میں قدم بڑھایا ہے، اس لئے تجزیہ و تحلیل، انتخاب اور ارادہ، اختیار انسان کے تین بنیادی عنصر شمار ہوتے ہیں، البتہ منتخب کام لازمی طور پر انسان کی رغبت اور ارادہ کے مخالف نہیں ہے یہ ہوسکتا ہے کہ خود بخود وہ کام انسان کے لئے محبوب و مطلوب ہو اس شخص کی طرح جو خدا کی عبادت اور راز و نیاز کا عاشق ہے اور نیمۂ شب میں با اشتیاق بستر خواب سے بلند ہوتا ہے اور نماز شب پڑھتا ہے یا اس شخص کی طرح جس کے پاس موسم گرما میں تھوڑا سا ٹھنڈا اور میٹھا پانی موجود ہے جس سے ہاتھ اور چہرہ دھلنا اس کے لئے لذت بخش ہے لیکن ظہر کے وقت اسی پانی سے وضو کرتا ہے، مطلوب اور اچھا عمل اگر معرفت اور ارادہ کے ہمراہ ہو تو ایک اختیاری عمل اور کرامت اکتسابی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے قدرت انتخاب نہ رکھنے والے جمادات اور فرشتوں میں جن کے سامنے متعدد راہیں نہیں ہوتیں اور غیر ترقی یافتہ انسان میں جو ابھی قدرت انتخاب سے مزین نہیں ہے، اس کے لئے ایسے انتخاب کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔[1]

---

[1] اختیار کی تعریف کے اعتبار سے، چاہے بہت کم ہی میں کیوں نہ ہو کیا حیوانات اختیار رکھتے ہیں؟ اس میں اختلاف ہے لیکن بعض آیات کے ظواہر اور بعض تجربی شواہد بہت معمولی حد تک ان کے اختیار کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔

انسان کے مختار ہونے پر قرآنی دلیلیں

گذشتہ مفہوم کے مطابق انسان کا اختیار قرآن کی نظر میں بھی مورد تائید ہے اور بہت سی آیات بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چار طرح کی آیات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

۱۔ وہ آیات جو بہت ہی واضح طور پر انسان کے اختیار کو بیان کرتی ہیں:

﴿وَقُلِ الحَقُّ مِن رَّبِّكُم فَمَن شَاءَ فَليُؤمِن وَمَن شَاءَ فَليَكفُر﴾[۱]

اور تم کہہ دو کہ سچی بات (قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے۔

۲۔ وہ آیات جو اتمام حجت کے لئے پیغمبروں کے بھیجنے اور آسمانی کتب کے نزول کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں:

﴿لِيَهلِكَ مَن هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحيَىٰ مَن حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ﴾[۲]

تا کہ جو شخص ہلاک ہو وہ حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ ہدایت کی حجت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے۔

﴿رُسُلاً مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعدَ الرُّسُلِ﴾

بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر (بھیجے) تا کہ لوگوں کی خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔[۳]

---

[۱] سورۂ کہف، آیت: ۲۹۔

[۲] سورۂ انفال، آیت: ۴۲

[۳] سورۂ نساء، آیت: ۱۶۵۔

۳۔وہ آیات جوانسان کے امتحان اور مصیبت میں مبتلا ہونے پر دلالت کرتی ہیں:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾

جو کچھ زمین پر ہے،ہم نے اسے زینت قرار دیا ہے تا کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں سے کون سب سے اچھے اعمال والا ہے۔[1]

۴۔وہ آیات جو بشیر و نذیر، وعد و وعید، تعریف و مذمت اور اس کے مثل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اسی وقت فائدہ مند اور مفید ہوں گی جب انسان مختار ہو۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے خدا نے جہنم کی آگ کا وعدہ کرلیا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔[2]

عقیدۂ جبر کے شبہات

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ انسان کا مختار اور باضمیر ہونا عقلی نقلی دلیلوں کے علاوہ تجربی شواہد سے بھی ثابت اور مورد تائید ہے لیکن کسی بنا پر (منجملہ بعض شبہات کی وجہ سے جو انسان کے اختیار کے بارے میں بیان ہوئے ہیں) بعض لوگ جبر کے قائل ہیں یہاں ہم ان شبہات کا تجزیہ کریں گے۔

(۱) جبر الٰہی

مذکورہ شبہات میں سے ایک شبہ جبر الٰہی ہے تاریخ اسلام میں ایک گروہ کو ''مجبرہ'' کہتے ہیں یہ گروہ معتقد تھا کہ دینی تعلیمات کے ذریعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنے اختیاری اعمال

---

[1] سورۂ کہف، آیت: ۷۔

[2] سورۂ توبہ، آیت: ۶۸

میں مجبور ہے، جبر الٰہی کے ماننے والوں کے استناد اور ان کے دینی بیانات کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا گروہ

وہ آیات و روایات جو علم غیب کے بارے میں ہیں، ان میں مذکور ہے کہ خداوند عالم، انسان کے اختیاری اعمال کے انجام پانے سے پہلے ان اعمال اور ان کے انجام پانے کی کیفیت سے آگاہ ہے اور انسانوں کی خلقت سے پہلے وہ جانتا تھا کہ کون انسان صالح وسعادت مند ہے اور کون برا و بد بخت ہے اور یہ حقائق لوح محفوظ نامی کتاب میں ثبت ہیں جیسے:

﴿وَمَا یَعزُبُ عَن رَّبِّکَ مِن مِّثقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الأرضِ وَلافِی السَّمَاءِ وَ لا أصغَرَ مِن ذٰلِکَ وَلا أکبَرَ إلا فِی کِتَابٍ مُّبِینٍ﴾[1]

اور تمہارے پروردگار سے ذرہ بھر بھی کوئی چیز غائب نہیں رہ سکتی نہ زمین میں اور نہ ہی آسمان میں چھوٹی بڑی چیزوں میں سے کوئی ایسی نہیں مگر وہ روشن کتاب میں ضرور ہے۔

دوسرا گروہ

وہ آیات و روایات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ انسان کے کام خدا کے ارادہ اور اس کی طرف سے معینہ حدود میں انجام پاتے ہیں جیسے وہ آیات جو ہر شیٔ کے تحقق منجملہ انسان کے اختیاری اعمال کو خدا کی اجازت، مشیت، ارادہ نیز قضا و قدر الٰہی کا نتیجہ سمجھتی ہیں جیسے یہ آیات:

﴿وَمَا کَانَ لِنَفسٍ أن تُؤمِنَ إلا بِإذنِ اللّٰہِ﴾[2]

کسی شخص کو یہ اختیار نہیں ہے کہ بغیر اذن خدا ایمان لے آئے۔

---

[1] سورۂ یونس، آیت: ۶۱

[2] سورۂ یونس، آیت: ۱۰۰

﴿مَن يَشَاء اللّٰهُ يُضلِلهُ وَمَن يَشَأ يَجعَلهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّستَقِيمٍ﴾[1]

اللہ جسے چاہے اسے گمراہی میں چھوڑ دے اور جسے چاہے اسے سیدھے راستہ پر لادے۔

﴿وَمَاتَشَاؤُنَ إلا أن يَشَاءَ اللّٰهُ﴾[2]

اور تم لوگ وہی چاہتے ہو (انجام دینا) جو خدا چاہتا ہے۔

پس انسان اس وقت ایمان لاتا ہے اور صحیح وغلط راستہ اختیار کرتا ہے یا کسی کام کو انجام دے سکتا ہے جب خدا کی مرضی شامل حال ہو ایک روایت میں امام علی رضاؑ سے بھی منقول ہے کہ :

"لا يكُون إلا مَاشاء اللّٰه وَأراده وَ قدّر وَقضى"[3]

کوئی بھی چیز بغیر خدا کی مرضی وارادہ نیز قضاوقدر کے پوری نہیں ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ

وہ آیات وروایات جو بیان کرتی ہیں کہ: انسانوں کی اچھی اور بری فطرت پہلے ہی سے آمادہ ہے صرف فطرت طبیعت مختلف ہے۔ بعض انسانوں کی فطرت اچھی ہے اور وہ اسی اعتبار سے ہدایت پاتے ہیں اور بعض دوسرے انسانوں کی فطرت بری ہے جس کی بنا پر گمراہ ہو جاتے ہیں جیسے دو آیتیں ﴿كَلّا إنَّ كِتَابَ الفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ﴾[4] ﴿كَلاّ إنَّ كِتَابَ الأبرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ﴾[5] بیان کرتی ہیں کہ اچھے لوگوں کی سرنوشت بلند مقام (عِلِّيِّينَ) اور برے افراد کی سرنوشت پست مقام (سِجّين) بتائی گئی ہے جیسا کہ مختلف احادیث بیان کرتی ہیں کہ اچھے انسانوں

---

[1] سورۂ انعام، آیت: ۳۹

[2] سورہ تکویر، آیت: ۲۹

[3] کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ج ۱، دار الکتب الاسلامیہ، تہران: ۱۳۴۸، ص ۱۵۸۔

[4] سورۂ مطففین، آیت: ۷۔

[5] سورۂ مطففین، آیت: ۱۸۔

کی فطرت میٹھے پانی اور برے افراد کی فطرت تلخ پانی سے تخلیق ہوئی ہے نیز ان احادیث میں سے بعض احادیث میں آیا ہے کہ "الشَقِی مَن شقیٰ فِی بطنِ أمهِ وَالسعِید مَن سَعد فِی بطنِ أمهِ"[1] بد بخت وہی ہے جو شکم مادر میں بد بخت ہے اور سعادت مند وہی ہے جو شکم مادر ہی سے سعادت مند ہے۔

جبر الٰہی کا تحلیل و تجزیہ

پہلے گروہ کے شبہہ کا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم کا کسی شخص کے اچھے یا برے کام کے انجام دینے کا علم، اس کام کے عالم خارج میں بغیر کسی قید و شرط کے انجام پانے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کام کو تمام قیود اور شرائط کے ساتھ انجام دینے کے معنی میں ہے، منجملہ انسان کے اختیاری کام میں یہ قیود، کام کو پرکھنا، انتخاب کرنا اور ارادہ کے ذریعہ انجام دینا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کسی کام کے انجام پانے کے بارے میں خدا کا علم، جبر اور اختیار دونوں سے سازگار ہے اس لئے کہ اگر خدا جانتا ہے کہ یہ کام جبر کی بنا پر اور فاعل کے ارادہ کے بغیر انجام اور صادر ہوا ہے جیسے اس شخص کے ہاتھ کی لرزش جسے رعشہ ہو تو ظاہر ہے وہ فعل جبری ہے لیکن اگر خدا یہ جانتا ہے کہ فاعل نے اس کام کو اپنے اختیار اور ارادہ سے انجام دیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ فعل اختیاری ہے اور فاعل مختار ہے جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ انسان کے اختیاری امور میں کام کے انجام پانے کی ایک شرط اور قید، انسان کا اختیار ہے، اسی بنا پر خدا جانتا ہے کہ انسان مختار ہے اور اس کام کو اپنی مرضی اور اختیار سے انجام دے رہا ہے۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جبر الٰہی کے معتقدین نے یہ تصور کیا ہے کہ چونکہ خداوند عالم فعل کے صادر ہونے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ ہم کیا کریں گے لہٰذا ہم مجبور ہیں، جب کہ یہ تصور بھی غلط ہے اور ہمیں خود سے خدا کا موازنہ نہیں کرنا چاہیئے، خداوند عالم لا محدود اور زمان و مکان سے بالاتر

[1] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، دار الکتب الاسلامیہ، تہران: ۱۳۶۳۔

ہے اس کے لئے ماضی، حال و مستقبل کا تصور نہیں ہے۔ مادی مخلوقات اگر چہ زمانہ کے ہمراہ ہیں اور اپنے اور دوسرے کے ماضی و مستقبل کے حالات سے جاہل و بے خبر ہیں اور دھیرے دھیرے ان کے لئے حوادث واقع ہوتے ہیں، لیکن اس خدا کے بارے میں جو زمان و مکان سے بالاتر ہے اس کے لئے حرکت و زمان کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور یہ کائنات اس کے لئے پوری طرح سے آشکار ہے، گذشتہ اور آئندہ کے حوادث کے بارے میں خداوند عالم کا علم ہمارے حال اور موجودہ حوادث کے بارے میں علم رکھنے کی طرح ہے وہ کاروان ہستی اور سلسلۂ حوادث کو ایک ساتھ اور ایک ہی دفعہ میں مشاہدہ کرتا ہے، غرض یہ کہ کسی چیز کے پورا ہونے سے پہلے اور پورا ہونے کے وقت، اور پورا ہونے کے بعد کا علم اس کے لئے متصور نہیں ہے، بہر حال جس طرح اس شخص کے بارے میں ہمارا علم جو ہمارے ہی سامنے اچھا کام کرتا ہے اس کے مجبور ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے اسی طرح خدا کا علم (ہمارے اعتبار سے اس اچھے کام کے پورا ہونے سے پہلے) بھی اس شخص کے مجبور ہونے کا سبب نہیں ہوتا ہے۔

دوسرے گروہ کی وضاحت میں (قدر، قضا، مشیت اور ارادۂ خدا کی آیات و روایات میں) قابل ذکر یہ ہے قدر چاہے انسان کے اختیاری کام یا غیر اختیاری کام میں ہو ضروری شرائط فراہم ہونے کے معنی میں ناکافی ہے اور قدر کے وقوع پذیر ہونے سے کام حتمی اور قطعی طور پر پورا نہیں ہوتا ہے بلکہ تمام شرائط کے فراہم ہونے کی بنا پر ضرور پورا ہوتا ہے اس لئے انسان کے اختیاری امور میں قدر یعنی کسی فاعل سے فعل کا حتمی صادر ہونا اور واقع ہونا، جبر کا لازمہ نہیں ہے اس لئے کہ اگر کسی فعل کے صدور کے لئے علت ناقصہ (نہ کہ تامہ) فراہم ہوئی ہے تو صدور فعل حتمی نہیں ہے کہ اس فعل کے سلسلہ میں اختیاری یا جبری ہونے کے بارے میں بحث کی جائے اور اگر صدور فعل کے تمام شرائط فراہم ہوں اور صرف فاعل نے قصد نہ کیا ہو تو معلوم ہوا کہ فاعل کا قصد ایک دوسری شرط ہے جو فعل کے حتمی پورا ہونے کے لئے ضروری ہے اور اس صورت میں فعل اختیاری ہوگا۔

قضائے الٰہی

جو قدر کے مقابلہ میں ایک کام کے پورا ہونے کے لئے کافی اور ضروری شرائط کے فراہم ہونے کے معنی میں ہے وہ بھی انسان کے اختیار سے منافات نہیں رکھتا ہے اس لئے کہ قضائے الٰہی اس وقت پوری ہوتی ہے جب کسی کام کے پورا ہونے کے تمام شرائط جن میں سے ایک انسان کا ارادہ بھی ہے، فراہم ہوجائے اور اختیاری کاموں میں انسان کے قصد وارادہ کے بغیر قضائے الٰہی انسان کے اختیاری امور میں مکمل نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا قضاء الٰہی بھی انسان کے اختیار سے سازگار ہے۔

مشیت، ارادہ اور اذن خدا کو بیان کرنے والی آیات وروایات جو دلالت کرتی ہیں کہ جو بھی کام انسان انجام دیتا ہے اس کی اجازت اور ارادہ سے پورا ہوتا ہے اور جس کا خدا نے ارادہ کیا ہے انسان اس کے علاوہ انجام نہیں دیتا ہے یہ مطلب بھی انسان کے اختیار سے سازگار ہے اس لئے کہ ان آیات وروایات میں مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کا ارادہ خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں اور خدا کے ارادہ اور اجازت کے سامنے قرار پاتا ہے یعنی ہمارے ارادہ کرنے اور اپنے کام کو انجام دینے کے بجائے خدا ارادہ کرے اور اسے انجام دے اور ہم نے کوئی ارادہ نہ کیا ہو یا کام کے پورا ہونے میں ہمارا ارادہ مؤثر نہ ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے انجام میں مستقل اور خدا سے بے نیاز نہیں ہیں اور مزید یہ کہ کسی بھی کام کے انجام دینے میں ہمارا قصد اور ارادہ مؤثر ہے اور طول میں خدا کی اجازت قصد اور ارادہ مؤثر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہمارے کام ہمارے ہی اختیار سے انجام پائیں اس لئے کہ اگر وہ نہ چاہے تو ہم کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتے یا ہمارا ارادہ اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔[1]

---

[1] مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: محمد حسین طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱، ص۹۹، محمد تقی مصباح معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) ص۲۸۱، ۲۸۲۔

خدا کے سرگرم ہونے کا راز

قرآن نے (تفویض) نام کے غلط نظریہ کی نفی کے لئے خدا کے ارادے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے اس نظریہ والوں کا یقین یہ تھا کہ خدا نے دنیا کو خلق کیا اور اس کو اسی کے حال پر چھوڑ کر خود آرام کر رہا ہے یا دنیا خلق ہونے کے بعد اس کی قدرت اختیار سے خارج ہوگئی ہے اور اس میں خدا کا کوئی کردار نہیں ہے انسان کے سلسلہ میں یعنی خداوند عالم صرف آغاز خلقت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور جب انسان کی تخلیق ہوگئی تو پھر انسان پوری طرح خلاق و سرگرم ہے اور خداوند عالم (نَعُوذُ بِاللّٰہِ) بیکار ہے۔ خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ تم اپنے ارادہ سے جو یہ کام انجام دے رہے ہو یہ بھی میری خواہش و مرضی سے ہے قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿وَقَالَتِ الیَهُودُ یَدُ اللّٰہِ مَغلُولَۃٌ﴾ یہودی کہتے ہیں خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے خداوند عالم فرماتا ہے ایسا نہیں ہے ﴿بَل یَدَاہُ مَبسُوطَتَانِ﴾[1] اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یعنی خدا پوری طرح سے اختیار رکھتا ہے اور سرگرم ہے آیات تاکید کرتی ہیں کہ یہ گمان نہ کرنا کہ اگر انسان اپنے اختیار سے کام انجام دے رہا ہے تو خداوند عالم بیکار ہے۔

دنیا اور خدا کا رابطہ گھڑی اور اس شخص کے رابطہ کی طرح ہے جو گھڑی کو چابی دیتا ہے ایسا نہیں ہے کہ دنیا گھڑی کی طرح چابی دینے کے بعد خود حرکت کرے اور کسی چابی دینے والے کی محتاج نہ ہو بلکہ یہ خداوند عالم ہے جو دنیا کو ہمیشہ چلانے والا ہے ﴿کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَأنٍ﴾[2] کہ وہ ہر وقت سرگرم ہے۔ انسان بھی دنیا کے حوادث سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ مشمول تدبیر و تقدیر الٰہی ہے حتی کہ انسان آخرت میں بھی مشیت و ارادہ خدا سے خارج نہیں ہے جیسا کہ سورہ ہود کی ۱۰۸ ویں

---

[1] سورہ مائدہ، آیت: ۶۴

[2] سورہ رحمن، آیت: ۲۹۔

آیت جو ظلم کر کے ظالمانہ طور پر جہنم میں اور خوش بختی کے ساتھ بہشت میں داخلہ کو بیان کرنے کے بعد دونوں گروہوں کے بارے میں فرماتی ہے:

﴿خَالِدِينَ فِيهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰاتُ وَالأَرضُ إِلا مَاشَاءَ رَبُّكَ﴾

جب تک آسمان و زمین ہے وہ ہمیشہ اسی (جنت یا جہنم) میں رہیں گے مگر جب تیرا پروردگار چاہے۔

ان دو عبارتوں میں "لوگ ہمیشہ ہونگے" اور "جب تک دنیا باقی ہے" پر توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مراد یہ نہیں ہے کہ کسی وقت خداوند عالم خوش بختوں یا ظالموں کو بہشت اور جہنم سے نکالے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ کہیں یہ تصور نہ ہو کہ یہ موضوع قدرت خدا کے حدود سے خارج ہو گیا ہے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے کیونکہ اگر ایسا ہی ہوگا تو خداوند عالم اپنی مخلوق کا محکوم واقع ہو جائے گا۔

تیسرے گروہ کی روایات کے سلسلہ میں یعنی وہ روایات جو فطرت انسان کو بیان کرتی ہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ روایات تقاضوں کو بیان کر رہی ہیں علت تامہ کو بیان نہیں کر رہی ہیں یعنی جو لوگ پیدا ہو چکے ہیں ان میں سے بعض کی فطرت گناہ اور ویرانی کی طرف رغبت کا تقاضا کرتی ہے اور بعض افراد کی فطرت اچھائی کی طرف رغبت رکھتی ہے جیسے وہ نوزاد جو زنا سے متولد ہوا ہو اس بچہ کے مقابلے میں جو صالح باپ سے متولد ہوا ہے گناہ کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے لیکن کسی میں بھی جبر نہیں ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اچھے یا برے ہونے میں فطرت کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ خداوند عالم پہلے سے جانتا ہے کہ کون اپنے اختیار سے صحیح اور کون بری راہ انتخاب کرے گا اسی لئے پہلے گروہ کو اچھی طینت اور دوسرے کو بری طینت سے خلق کیا ہے۔

اس کی مثال ایک باغبان کی طرح ہے جو تمام پھولوں کو اس کی قیمت اور رشد و بالیدگی کے مطابق ایک مناسب گلدان میں قرار دیتا ہے گلدان پھولوں کے اچھے یا برے ہونے میں تاثیر

نہیں رکھتا ہے اسی طرح طینت بھی صرف ایک ظرف ہے جو اس روح کے مطابق ہے جسے اپنے اختیار سے اچھا یا برا ہونا ہے طینت وہ ظرف ہے جو اپنے مظروف کے اچھے یا برے ہونے میں اثر انداز نہیں ہوتا دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس کے لئے فلسفی مقدمات ضروری ہیں لہٰذا اس سے چشم پوشی کی جا رہی ہے۔[1]

(۲) اجتماعی اور تاریخی جبر

اجتماعی اور تاریخی جبر کا عقیدہ بعض فلاسفہ اور معاشرہ شناسی کے ان گروہوں کے درمیان شہرت رکھتا ہے جو معاشرہ اور تاریخ کی اصالت پر زور دیتے ہیں ان کے عقیدہ کے مطابق کسی فرد کی معاشرے اور تاریخ سے الگ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ معاشرہ اور تاریخ ایک باوقار وجود کی طرح اپنے تمام افراد کی شخصیت کو مرتب کرتے ہیں لوگوں کا تمام فکری (احساس) اور افعالی شعور تاریخ اور معاشرے کے تقاضہ کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں اور انسان اپنی شخصیت کو بنانے میں ہر طرح کے انتخاب اور اختیار سے معذور ہے مثال کے طور پر ہیگل، مارکس، اور ڈورکھیم کے نظریوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ہیگل جو تاریخ کے لئے ایک واقعی حقیقت کا قائل ہے معتقد تھا کہ تاریخ صرف تاریخی حوادث یا سادہ سلسلۂ عبرت کے لئے ہے کہ جس کی نظری اور فکری تجزیہ و تحلیل نہیں ہوتی، اس کی نظر میں گو ہر تاریخ، عقل ہے (اس کا نظریہ اسی مفہوم کے اعتبار سے ہے) اور ہر تاریخی حادثہ اس کے مطابق انجام پاتا ہے، تاریخ ساز افراد، مطلق تاریخ کی روح کے پورا ہونے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور بغیر اس کے کہ خود آگاہ ہوں اس راہ میں قدم بڑھاتے ہیں [2] مارکس کا نظریہ تھا کہ انسان کا ہر فرد تاریخ اور معاشرہ کا نتیجہ ہے۔ تمام انسانی کام تہذیب و ثقافت، مذہب، ہنر اور

---

[1] ''ضمائم'' کی طرف رجوع کریں۔

[2] بعض فلاسفۂ تاریخ بھی معمولاً تاریخ کے لئے ایسے اعتبارات، قوانین اور مراحل مانتے ہیں جو غیر قابل تغیر ہیں اور انسانوں کے ارادے، خواہشات، جستجو اور معاشرے انہیں شرائط و حدود میں مرتب ہوتے ہیں۔

اجتماعی افراد کے علاوہ تمام چیزیں معاشرہ پر پھیلے ہوئے اقتصادی روابط پر مبنی ہیں ۔[1] اس لئے انسان کے ہر فرد کی آمادگی کا تنہا حاکم اس کے معاشرے پر حاکم اقتصادی روابط کو سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ اقتصادی روابط زمانہ کے دامن میں متحول ہوتے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ متحول ہوتا ہے اور معاشرے کے معقول ہونے سے انسانوں کی شخصیت، حقیقت، تہذیب وثقافت اور اس کے اعتبارات بھی متحول ہو جاتے ہیں۔ ڈورکھیم اس جبر کی روشنی میں ''نظریہ آئیڈیا'' کی طرف مائل ہوا ہے کہ انسان ایک فردی واجتماعی کردار رکھتا ہے اور اس کا اجتماعی کردار ارادوں، خواہشوں احساسات اور تمام افراد کے جذبات کے ملنے اور ان کے ظاہر ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی روح معاشرہ ہے۔

اور یہ معاشرتی روح بہت قوی ہے جو افراد کے وجودی ارکان پر مسلط ہے شخصی اور انفرادی ارادہ اس کے مقابلے میں ایستادگی کی توانائی نہیں رکھتا ہے۔ وہ افراد جو اس اجتماعی روح کے تقاضوں کے زیر اثر ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو چیزیں سماج اور معاشرہ نے انسان کو دی ہیں اگر وہ اس کو واپس کر دے تو حیوان سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

اجتماعی اور تاریخی جبر کا تحلیل وتجزیہ

پہلی بات: سماج اور تاریخ کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ یہ مرکب اعتباری ہیں جو افراد کے اجتماعی اور زمان ومکان کے دامن میں ان کے روابط سے حاصل ہوتے ہیں اور وہ چیزیں جو وجود رکھتی ہیں وہ ہر فرد کے روابط اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں عمل وردعمل کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔

دوسری بات: ہم اجتماعی وتاریخی عوامل، اقتصادی روابط جیسے، اعتبارات، آداب ورسوم اور تمام اجتماعی وتاریخی عناصر کی قدرت کے منکر نہیں ہیں اور ہمیں افراد کی شخصیت سازی کی ترکیبات

---

[1] البتہ مارکس کا ''نظریۂ اجتماعی جبر'' فیوربیچ اور ہیگل کے تاریخی جبر نظریئے سے وجود میں آیا ہے۔

میں ان کے کردار سے غافل بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اجتماعی اور تاریخی عوامل میں سے کوئی بھی انسان کے اختیار کو سلب کرنے والے نہیں ہیں اگر چہ معاشرہ زمان و مکان کی آغوش میں اپنے مخصوص تقاضے رکھتا ہے اور انسان سے مخصوص اعمال وطرز سلوک کا خواہاں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان مجبور ہے اور اس سے اختیار سلب ہو گیا ہے جبکہ انسان ان تمام عوامل کے مقابلہ میں استقامت کر سکتا ہے حتی معاشرہ کی سرنوشت میں اثر انداز ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس طرح کے اثرات کی مثالوں کو معاشروں کی تاریخ میں بہت زیادہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔

(۳) فطری اور طبیعی جبر

فلسفۂ مادی اور مادہ پرستی کے ہمراہ ارثی صفات کے سلسلہ میں علمی ارتقاء انسان کی جبری زندگی کا عقیدہ پیش کرتا ہے۔ جو لوگ انسان کے اندر معنوی جوہر کے وجود کے منکر ہیں اور اس کو صرف اپنی تمام تر قدرتوں سے مزین ایک پیکر اور جسم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی بہت سی توانائیاں انسانی خصوصیات کے ارثی و وراثتی عوامل کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں اور انسان کے تمام نفسیاتی و ذہنی حالات کا مادی جواز پیش کرتے ہیں اور لذت، شوق علم، احساس اور ارادہ کو مغز کے اندر سلسلۂ اعصاب اور الکٹرانک حرکتوں کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں لہٰذا طبیعی طور پر عقیدہ جبر کی طرف گامزن ہیں [۱] ایسی صورت میں انسان کو اخلاقاً اس کے اعمال کے مقابلے میں ذمہ دار نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں جزا وسزا اپنے معنی ومفہوم کھودیں گے اس لئے کہ ان سوالوں کے مقابلہ میں کہ کیوں فلاں شخص مرتکب جرم ہوا ہے؟ تو جواب دینا چاہیئے کہ اس کے ذہن میں مخصوص الکٹرانک اشیا کا تحقق اس کے تحریک کا باعث ہوا ہے اور یہ حادثہ وجود میں آیا ہے

---

[۱] اسکینر، کتاب ''فراسوی آزادی ومنزلت'' میں کہتا ہے کہ جس طرح بے جان اشیاء کو جاندار سمجھنا (بے جان چیزوں سے روح کو نسبت دینا) غلط ہے۔ اسی طرح لوگوں کو انسان سمجھنا اور ان کے بارے میں فکر کرنا اور صاحب ارادہ سمجھنا بھی غلط ہے، ملاحظہ ہو: اسٹیونس، لسلی ہفت نظریہ دربارۂ طبیعت انسان، ص ۱۶۳۔

اور اگر سوال یہ ہو کہ کیوں یہ مخصوص اشیاء اس کے ذہن اور اعصاب میں حائل ہوئیں؟ تو جواب یہ ہے کہ فلاں حادثہ بھی فلاں فطری اور الکٹرانک حوادث کی وجہ سے تھا۔ اس تحلیل کی روشنی میں مغز کے مادی حوادث انسان کے بیرونی امور و حوادث کے اسباب ہیں۔ مغز کے مادی حوادث میں سے کوئی بھی ارادی اختیاری امر اور انسانوں میں تبدیلی وغیرہ اُن ارثی صفات اور فطری بناوٹ میں تبدیلی کی بنا پر ہے جن کا ان کی ترکیبات میں کوئی کردار نہیں ہے۔ یعنی لوگوں نے ترقی کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیرونی فطرت کے قوانین کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان سے مخصوص کام سرزد ہوں اور یہ عوامل جدا ہونے والے نہیں ہیں۔ وہ کام جو انسان سے سرزند ہوتے ہیں نہ مخصوص نفسیاتی مقدمات (فہم و خواہشات) میں جو فطری اور بیرونی طبیعی حوادث سے بے ربط نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارا دیکھنا، اگرچہ یہ کام ہے جو نفس انجام دیتا ہے لیکن نفس کے اختیار میں نہیں ہے۔ عالم خارج میں فطری بصارت کی شرطوں کا متحقق ہونا موجب بصارت ہوتا ہے اور یہ بصارت ایک ایسا عنصر ہے جو ہمارے اختیاری کام میں موثر ہے۔

اس تاثیر کی دلیل یہ ہے کہ انسان جب تک کسی چیز کو نہیں دیکھے گا اس کی طرف راغب ہونے کا احساس بھی نہیں کرے گا لیکن جب اس کو دیکھتا ہے تو اس کا ارادہ مورد نظر کام کے انجام سے مربوط ہو جاتا ہے۔[1] دیکھنا، ایک غیر اختیاری چیز ہے اور طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ پس جو بھی

---

[1] باباطاہر کہتے ہیں:

زدست دیده و دل ہر دو فریاد	کہ ہر چہ دیده بیند دل کند یاد
بسازم خنجری نیشش ز پولاد	زنم بر دیده، تادل گردد آزاد

میں چشم و دل، دونوں سے رنجیدہ ہوں کہ جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے اسے دل محفوظ کر لیتا ہے۔ میں ایسا خنجر بنانا چاہتا ہوں جس کی نوک فولاد کی ہو اور اسی سے آنکھ پھوڑ دوں گا تا کہ دل آزاد ہو جائے۔

از دل برود، ہر آن کہ از دیده برفت

جو کچھ آنکھ سے پوشیدہ ہو جاتا ہے دل سے بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

چیزاس پر مرتب ہوگی اسی قوانین کے تابع ہوگی۔

انسان بھی اگر چہ خواہشات سے وجود میں آتا ہے جو ہمارے اندر موجود ہے لیکن فطرت سے بے ربط نہیں ہے۔نفسیاتی علوم کے ماہرین نے بھی اس بات کو ثابت کیا ہے کہ فطری عوامل خصوصاً انسان میں خواہشات کے برانگیختہ کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ہم لوگوں نے بھی تھوڑا بہت آزمایا ہے اور معرفت بھی ہے کہ زعفران خوشی دلاتا ہے اور مسور کی دال قلب میں نرمی پیدا کرتی ہے۔قانون وراثت کی بنیاد پر انسان اپنے آباء واجداد کی بہت سی خصوصیات کا وارث ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

یہ تمام چیزیں طبیعی وفطری عوامل کے مطابق انسان کے مجبور ہونے کی دلیل ہے اور ان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ارادہ، فطری اور طبیعی عوامل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے گرچہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر کسی ارادہ کے کیا ہے۔[1]

فطری اور طبیعی جبر کا تحلیل و تجزیہ

اس طرح کے جبر کا عقیدہ انسان کے کردار و شخصیت سازی اور طبیعی ،فکری اور موروثی عوامل کے کردار میں افراط ومبالغہ سے کام لینا ہے۔انسانوں کی متفاوت ومتفرق زندگی اور وراثت کے عنصر کا کسی طرح سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن انسان کے کردار و شخصیت سازی کے سلسلہ میں تمام موثر عوامل سے چشم پوشی کرتے ہوئے صرف ارثی علت میں منحصر کرنا کسی طرح صحیح نہیں

---

[1] قابل ذکر بات یہ ہے کہ حیاتی اور مادی جبر میں انسان کے معنوی جوہر اور روحانی حالات کی نفی پر تاکید ہوئی ہے اور انسان کو ہمیشہ ایک مادی مخلوق سمجھا جاتا ہے لیکن فطری شبیہہ کا جبر میں کوئی اصرار پایا نہیں جاتا ہے بلکہ فطری اسباب وعلل اور ان پر حاکم قوانین کے مقابلہ میں فقط انسان کے تسلیم ہونے کی تاکید ہوئی ہے یعنی اگر انسان میں روح اور حالات نفسانی ہیں تو یہ حالات فطری علتوں کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں اور اس میں انسان کے ارادہ واختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔

ہے۔انسان کواس زاویہ سے نگاہ کرنے میں بنیادی اعتراض اس کے معنوی اور روحانی جہت سے چشم پوشی کرنا ہے۔جبکہ گذشتہ فصلوں میں قرآنی آیات اور فلسفی براہین سے استدلال کرتے ہوئے ہم نے انسانوں کے فہم واحساسات کے مرکز معنوی اور غیر مادی جوہر کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ نفس مجرد کے وجود کو ثابت کرنے کے بعد اس قسم کے جبر پر اعتقاد کے لئے کوئی مقام نہیں ہے اس لئے کہ ارادہ کا آزاد ہونا انسان کے روح مجرد کی قابلیتوں میں سے ایک ہے اور انسان کے آزاد ارادے کو مورد نظر قرار دیتے ہوئے، اگر چہ مادی ترکیبات کے فعل وانفعالات اور فطری عوامل کا کردار قابل قبول ہے لیکن ہم اس نکتہ کی تاکید کر رہے ہیں کہ ان امور کا سرگرم ہونا اختیار انسان کے سلب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔مادی ترکیبات کے فعل وانفعالات کے حصول اور بعض خواہشات کے برانگیختہ ہونے میں خارجی عوامل اور ان کی تاثیروں کے باوجود کیا ہم ان عوامل کے مقابلہ میں استقامت کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں اپنی اور دوسروں کی روزمرہ زندگی میں بہت زیادہ نمونوں سے روبرو ہوتے رہے ہیں۔

قانون وراثت کا بھی یہ تقاضا نہیں ہے کہ جو فرزند اپنے آباء واجداد سے بعض خصوصیات کا وارث ہوا ہے وہ کسی بھی انتخاب کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔اگر مذکورہ امور کو بعض انسانی اعمال کا نتیجہ فرض کر لیا جائے تو یہ جزء العلۃ ہوں گے لیکن آخر کار، انسان بھی اختیار استعمال کر سکتا ہے اور ان تمام عوامل کے تقاضوں کے برخلاف دوسرے طریقہ کار کے انتخاب کی بنا پر انسان کے بارے میں مادی فعل وانفعال اور وراثت کی صحیح پیش بینی، فطری عوامل کے اعتبار سے نہیں کی جاسکتی ہے۔

خلاصۂ فصل

۱۔ گذشتہ فصل میں ہم نے بیان کیا ہے کہ کرامت اکتسابی، انسان کے اختیار وارادہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے۔ ہم اس فصل میں مسئلہ اختیار اور اس کے حدود کے اعتبار سے تجزیہ وتحلیل کریں گے۔

۲۔ انسان ایسی مخلوق ہے جو آزمائش، انتخاب اور قصد وارادے سے اپنے کام کو انجام دیتا ہے۔ عقلی ونقلی دلیلیں انسان کے اندر پائے جانے والے عنصر (اختیار) کی تائید کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ شبہات بیان کئے گئے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے۔

۳۔ مسلمانوں کے درمیان ایک گروہ (مجبرہ) ہے جو بعض آیات و روایات سے استفادہ کرتے ہوئے انسان کو ارادۂ الٰہی کے زیر اثر فاقد اختیار سمجھتا ہے۔ وہ آیات و روایات جو خدا کے علم مطلق اور وہ آیات و روایات جو یہ بیان کرتی ہیں کہ کوئی بھی چیز خدا کے اذن وارادے سے خارج نہیں ہے اور وہ دلیلیں جو بیان کرتی ہیں کہ انسانوں کا مقدر پہلے سے ہی آراستہ ہے۔ اس گروہ (مجبرہ) نے ایسی ہی دلیلوں سے استناد کیا ہے۔

۴۔ اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ تمام مورد نظر دلیلیں عقیدۂ تفویض کی نفی کر رہی ہیں اور اس نکتہ کو ثابت کر رہی ہیں کہ خداوند عالم ابتداء خلقت سے تا ابد دنیا کا عالم ونگراں نیز محافظ ہونے کے باوجود انسان سے اختیار سلب نہیں کرتا ہے اور یہ کہ تمام چیزیں اس کے قضاء وقدر سے مربوط ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر واقعہ کے پورا ہونے کے لئے کافی ووافی شرائط کا ہونا ضروری ہے جملہ شرائط میں، انتخاب کے بعد قصد کا ہونا ہے اور یہ کہ تمام اشیاء خداوند عالم کے ارادے اور اذن کے حدود میں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کا ارادہ انسان کے ارادے کے مقابلہ میں ہے۔ بلکہ ہمارا ارادہ بھی ارادۂ پروردگار کے ہمراہ اور درمیان میں موثر ہے۔

۵۔دوسرا شبہ اجتماعی و تاریخی جبر کے نام سے معروف ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسان قدرت استقامت نہ رکھنے کے باوجود تاریخی و اجتماعی عوامل اور تقاضوں سے متاثر ہے۔ ''ہیگل، ڈورکھیم اور مارکس'' فرد و اجتماع کے درمیان رابطہ کے سلسلہ میں ایسا ہی نظریہ رکھتے تھے۔ علم جنٹک کی پیشرفت کے ساتھ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا انتخاب دراصل دماغ کے کیمیائی فعل وانفعالات کا نتیجہ ہے اور انسان کا ایک دوسرے سے متفاوت ہونا اس کے جسمی اور موروثی تفاوت کی وجہ سے ہے، لہٰذا انسان اپنی جسمی اور طبیعی خصلتوں سے مغلوب و مقہور ہے۔

۶۔ان دو شبہوں کے جواب میں مذکورہ عوامل کے وجود کا منکر نہیں ہونا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کی تکمیل میں سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی روابط بھی بہت زیادہ اثر انداز ہیں اور انسانوں کی زندگی کے تفاوت میں عنصر وراثت بھی دخیل ہے۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس نظریہ کے ماننے والوں نے ان عوامل کی تاثیر کے مقدار میں مبالغہ کیا ہے اور درونی و معنوی عوامل کی تاثیر کو بھول بیٹھے ہیں۔انسان کا نفس ایک غیر مادی عنصر ہے اور ارادہ اس کی قوتوں میں سے ہے جو مادی اور ضمنی محدودیتوں کے باوجود بھی اسی طرح سرگرمی اور استقامت انجام دے رہا ہے۔

تمرین

ا۔انسان کے فردی اور اجتماعی حالات و کردار کے چند نمونے جو اس کے مختار ہونے کی علامت ہیں ذکر کریں؟

۲۔مفہوم اختیار کے استعمال کے چار موارد کی وضاحت کریں؟

۳۔(امر بین الامرین) سے مراد کیا ہے جو اہل بیت علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں کے نظریہ کو بیان کرتا ہے؟

۴۔بعض لوگوں نے خداوند عالم کے علم غیب سے متعلق شبہ جبر کے جواب میں کہا ہے کہ: جس طرح بہت ہی صمیمی اور گہرے دوست کی اپنے دوست کے آئندہ کاموں کے سلسلہ میں پیشن گوئی اس کے دوست کے مجبور ہونے کا سبب نہیں بنتی اسی طرح خداوند عالم کا علم غیب بھی انسان کے مجبور ہونے کا سبب نہیں ہوتا ہے۔آپ کی نظر میں کیا یہ جواب یقینی اور قانع کرنے والا ہے؟

۵۔کیا انسان کے کاموں میں خدا کو سرگرم سمجھنا اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ ہم انسان کے برے کاموں، تمام گناہوں اور ظلم کو اللہ کی طرف نسبت دیں؟اور کیوں؟

۶۔کیا آیۂ شریفہ (ومارمیت إذرمیت ولکن الله رمی) عقیدۂ جبر کی تائید نہیں کر رہی ہے؟اور کیوں؟

۷۔انسان کا مختار ہونا، انسانی حوادث کے قانون مند ہونے سے کس طرح سازگار ہے؟

۸۔وہ اختیار جو حقوقی اور فقہی مباحث میں فریضہ، ثواب اور عقاب کے شرائط میں سے ہے اور وہ اختیار جو کلامی و فلسفی اور انسان شناسی کے مباحث میں مورد نظر ہے ان دونوں کے درمیان کیا نسبت ہے؟

۹۔اختیاری کاموں کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل توضیحات میں سے کون سی توضیح صحیح

ہے؟اختیاری فعل وہ فعل ہے جو انسان کے قصد کے تحت ہو۔اور

الف:اچانک ظاہر ہوتا ہے اور انجام پاتا ہے۔

ب:صاحب علت ہے اور انجام پاتا ہے۔

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔ جبر وتفویض اوراس کے غلط ہونے کے بارے میں ملاحظہ ہو:

۔حسن زادہ آملی، حسن (۱۳۶۶) خیر الاثر درر د جبر وقدر :قم انتشارات قبلہ۔

۔سبحانی، جعفر (۱۴۱۱) **الھیات علی ھدی الکتاب و السنة والعقل** ۔ج ۲،قم: **المرکز العالمی للدراسات الاسلامیہ**.

۔کاکایی ،قاسم (۱۳۷۴) خدا محوری (اکازیونالیزم) در تفکر اسلامی و فلسفہ مالبرانچ، تہران: حکمت۔

۔مجلسی، محمد باقر (۱۳۶۸) جبر وتفویض، تحقیق مہدی رجائی، مشہد، بنیاد پژوہشہای اسلامی۔

۔مرعشی شوشتری، محمد حسن (۱۳۷۲) ''جبر واختیار وامر بین الامرین'' مجلہ رہنمون ش۶۔

۔ملاصدرا شیرازی، صدرالدین (۱۳۴۰) ''رسالہ جبر واختیار، خلق الاعمال اصفہان: بی نا۔

۔موسوی خمینی، روح اللہ (امام خمینی) (۱۳۶۲) طلب وارادہ، ترجمہ شرح سید احمد فہری، تہران: مرکز انتشارات علمی وفرہنگی۔

۲۔ جبر کے شبہات اوراس کی تحقیقات کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو:

۔جعفر، محمد تقی، جبر واختیار، قم: انتشارات دار التبلیغ اسلامی۔

۔جعفر سبحانی (۱۳۵۲) سرنوشت از دیدگاہ علم وفلسفہ، تہران: غدیر۔

۔سعید مہر، محمد (۱۳۷۵) علم پیشین الٰہی و اختیار انسان، تہران، پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی۔

۔صدر، محمد باقر (۱۳۵۹) انسان مسؤول وتاریخ ساز، ترجمہ محمد مہدی فولادوند تہران، بنیاد قرآن۔

۔محمد حسین طباطبائی (۱۳۶۱) نہایۃ الحکمۃ، تعلیق: محمد تقی مصباح یزدی، ج۲، ص۳۴۶،
تہران: انتشارات، الزہراء۔
۔طوسی، نصیر الدین (۱۳۳۰) جبر و قدر، تہران: دانشگاہ تہران۔
۔محمد تقی مصباح، آموزش فلسفہ، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی۔
۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی)
قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔
۔مطہری، مرتضی (۱۳۴۵) انسان و سرنوشت، تہران: شرکت سہامی انتشار۔
۔............مجموعہ آثار، ج۱، تہران: صدرا۔
۔احمد واعظی (۱۳۷۵) انسان از دیدگاہ اسلام، قم: دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ۔

ملحقات

ا۔ مغربی انسان شناسی کے منکرین اور مسئلہ اختیار۔

ناٹالی ٹربوویک نے انسان کے اختیار یا جبر کے باب میں مغربی منکرین کے نظریوں کو دو سوالوں کے ضمن میں یوں بیان کیا ہے:

الف: عقیدۂ جبر کیا ہے؟

انسان آزاد ہے یا مجبور؟

کیا انسان کے اعمال و کردار، اس کے آزاد ارادے کا نتیجہ ہیں یا تقریباً اور مکمل طور پر ماحول، وراثت، بچپن کے ابتدائی دور یا خدا کی طرف سے تعیین ہوتا ہے؟ مختلف فکری مکاتب کے ابتدائی نظریات کو عقیدۂ جبر کے کامل جنون سے لے کر اس کے کامل تناقض کو مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے:

عقیدۂ جبر تام[1]

آزاد ارادہ کا نسبی یا مکمل طور پر انکار

عقیدہ تجربہ (ہابز)
عقیدہ ہمبستگی[2] (ہارٹلی[3] ہیوم)
عقیدہ نفع (بنتام، میل)
فرائیڈ کے ماننے والے عقیدہ کردار (واٹسن، اسکینر)

---

[1] Total Determinism

[2] Associationists

[3] Hartley۔

عقیدہ جبر معتدل
معمولی آزادی ارادہ

- فرائیڈ کے نئے ماننے والے (فروم اریکسن)
- انسان محوری (مازلو، روجرز)
- عقیدہ خرد (وکارسٹ)
- وجود پسندی، انسان محوری[1] (می[2] فرینکل[3])
- خدا کو قبول کرنے والوں کا عقیدہ وجود[4]

عقیدہ جبر یا تناقض
تمام ارادہ کی آزادی

- (ببر[5] ٹیلچ[6] فورنیر[7])
- عقیدہ عروج و بلندی[8] (کانٹ)
- عقیدہ وجود (سارتر)

۱۔ Existential Humanists-
۲۔ May-
۳۔ Farnki-
۴۔ heistic Existentialists
۵۔ Buber
۶۔ Tillich
۷۔ Fournier
۸۔ Transcendentalists.

ب: عقیدۂ جبر کے اصول کیا ہیں؟

فطری خواہشات

فرویڈ کے ماننے والے: انسان اپنی معرفت زندگی (جنسیت، بھوک، دور کرنا[1] اور ان کے مثل چیزوں) اور فطری خواہشات کے زیر نظر انسان کے تمام طرز سلوک و کردار صرف ان سازشوں کا نتیجہ ہیں جو فطری ضرورتوں اور مختلف اجتماعی تقاضوں کے درمیان حاصل ہوتی ہیں۔ فطری خواہشیں غالباً بے خبر ضمیر میں موثر ہیں۔ اس طرح کا انسان نہ صرف ان کے زیر اثر قرار پاتا ہے بلکہ اکثر خود بھی اس کنٹرول سے بے خبر ہے۔

آرتھونلک کے اعصابی اطباء: (نیو بلڈ) اس گروہ کا نظریہ، عقیدۂ اخلاق کے نظریہ کی طرح ہے۔ انسان محوری (روجرز، مازلو) انسان مادرزاد خواہشات کا حامل ہے جو اسے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے پیش کرتا ہے۔

موروثی وجود

وراثت سے استفادہ کا مکتب:[2] (جنسن[3] شاکلے[4] ہرنشٹائن[5] اکثر انسان کا شعور میراثی ہوتا ہے۔ عقل و خرد سے مربوط تمام رفتار و کردار، ایسے حصہ میں قرار پاتے ہیں جو مخصوص طریقے سے وارث کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔[6] نظریۂ علم حیات کے مطابق اکثر انسان کے رفتار و کردار اور اس کی افسردگی، بیرونی و درونی ارثی توجہ کا نتیجہ ہیں۔

۱۔ Elimination-
۲۔ Inherited L.O. School
۳۔ Jensen-
۴۔ Schockley
۵۔ Hernstien-
۶۔ Eysenck.

ماحول کی توانائیاں

افعال پسندی کے نظریہ کے حامی: (واٹسن) کے مطابق انسان کے رفتار و کردار کو ماحول ہی معین کرتا ہے۔

اصول پسندی کے حامی: (اسکینر) کا کہنا ہے کہ اسباب ماحول، رفتار و کردار کے اہم ترین معین کرنے والوں میں سے ہیں۔ اگرچہ فطری عوامل بھی موثر ہیں۔

اجتماعی محافظت کا نظریہ پیش کرنے والے: (بانڈرا، برکوتز[1] اکثر رفتار و کردار، مخصوصاً اجتماعی رفتار و کردار، ماحول کی دین ہے نہ کہ فطری خواہشات کا رجحان۔

فرائڈ کے نئے ماننے والے: (فردم اریکسن) کا کہنا ہے ثقافتی اور اجتماعی ماحول انسان کے طرز سلوک کو ترتیب دینے والی بہت ہی اہم قوت ہے۔ علم حیات کی فطری خواہشات کم اہمیت کی حامل ہے۔

کارل مارکس کے عقیدہ کے حامی کہتے ہیں: اسباب صنعت یا اقتصادی نظام انسان کے اعتباری چیزوں اور یقینیات کو ترتیب دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس کے طرز سلوک کے ایک عظیم حصہ کو بھی معین کرتے ہیں۔

انسان پسندی کے دعویدار: (روجرز، مازلو) کے مطابق طرز سلوک کو اجتماعی عوامل اور معین ماحول ترتیب دے سکتا ہے۔

اگر معنوی احترام اور جسمانی آسودگی کی ابتدائی ضرورتیں حاصل نہ ہوں تو ماحول و محیط کے اسباب انسان کو منحرف کر سکتے ہیں اور تکامل و ارتقاء کی راہ میں مانع ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ابتدائی ضرورت فراہم ہو جائے ہو تو انسان ترقی کر سکتا ہے اور اپنی ہی طرح[2] دوسرے اہداف کو پورا کر سکتا ہے جو بیرونی ماحول کے زیر اثر نہیں ہیں۔

---

[1] Berkowitz۔

[2] Self_actualization

معنوی قوتیں [1]

اکثر مفکرین ایسی طاقتوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں جو کسی اندازے یا وضاحت سے واضح نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اکثر بزرگ علماء انسان کے طرز سلوک میں خدا یا خداؤں کی دخالت کے معتقد ہیں، پوری تاریخ میں حتیٰ گذشتہ چند سالوں میں بھی اکثر معاشروں نے مادّیات کے مقابلہ میں معنویات کی زیادہ تاکید کی ہے۔

ا۔ خداوند عالم کی عالم گیر خالقیت اور مسئلہ اختیار

خداوند عالم کی عالم گیر خالقیت جو کہ انسان کے اختیاری اعمال میں بھی شامل ہے اور قرآن کی آیات میں بھی اس کی وضاحت ہوئی ہے جیسے ﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾[2] ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُم وَمَا تَعمَلُونَ﴾[3] یہ آیات عقیدۂ جبر رکھنے والوں کے لئے ایک دلیل وسند بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات میں غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بھی اس کی سرگرمی کی نفی نہیں کر رہی ہیں بلکہ حقیقی توحید اور انسان کے اختیاری کاموں میں خداوند عالم کے مقابلہ میں انسان کی سرگرمی کے برابر نہ ہونے کو بیان کر رہی ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب کسی کام کو دو یا چند فاعل کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو مذکورہ کام کو متعدد فاعل سے انجام پانا مندرجہ ذیل چار صورتوں میں سے ایک ہی صورت میں ہوگا۔

الف: ایک حقیقی فاعل ہے اور دوسرا مجازی فاعل شمار ہوتا ہے اور فعل کے انجام دینے میں کوئی کردار نہیں رکھتا ہے۔

ب: ایک فاعل حقیقی ہے اور دوسرا اس کا مددگار ہے۔

---

[1] Spiritual Forces

[2] سورۂ رعد، آیت: ۱۶

[3] سورۂ صافات، آیت: ۹۶۔

ج: متعدد فاعل نے ایک دوسرے کی مدد سے کام کو انجام دیا ہے اور کام کا بعض حصہ ہر ایک سے منسوب ہے۔

د: دو یا چند فاعل فعل کو انجام دینے میں حقیقی کردار ادا کرتے ہیں اور یہ فعل ان میں سے ہر ایک کا نتیجہ ہے لیکن ہر ایک کی علت فاعلی دوسرے سے بالاتر اور ساتھ میں واقع ہے۔

قرآن مجید کی آیات صرف چوتھی صورت سے مطابقت رکھتی ہیں اور خداوند عالم کی فاعلیت کو انسان کی فاعلیت کے ذیل میں بیان کرتی ہیں لہٰذا انسان کا اختیاری فعل درحقیقت فعل خدا بھی ہے اور فعل انسان بھی، مخلوق خدا بھی ہے اور مخلوق انسان بھی ہے اس لئے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے درمیان واقع ہیں اور فعل کو ان دونوں کی طرف نسبت دینے میں بھی کوئی عقلی مشکل نہیں ہے۔[1]

۲۔ طینت کی روایات کا دوسرا جواب

ایک فلسفی مقدمہ قرآن میں موجود ہے جس کے بہت ہی دقیق ہونے کی وجہ سے ہم آسان لفظوں میں اشارہ کرتے ہوئے اس مقدمہ کو پیش کریں گے۔ البتہ یہ مقدمہ بہترین جواب اور روایات طینت کے لئے بہترین توجیہ ہے:

عالم مادی کے علاوہ عالم برزخ، عالم قیامت اور عالم آخرت جیسے دوسرے جہان بھی ہیں اور روایات، مذکورہ عالم میں سے عالم آخرت کو بیان کر رہی ہیں۔ عالم آخرت میں زمان و مکان وجود نہیں رکھتا ہے جو کچھ اس دنیا میں زمان و مکان کے دامن میں واقع ہوتا ہے اس عالم میں اکٹھا اور بسیط انداز میں ذخیرہ ہوتا رہتا ہے۔ اس دنیا کے ماضی، حال اور آئندہ، اس دنیا میں یکجا ہوں گے۔ پوری یہ دنیا جس میں طولانی زمان و مکان موجزن ہیں اس دنیا میں صرف ایک وجود کی

---

[1] اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: جوادی آملی، عبد اللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم توحید و شرک، مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) ص ۱۰۶، ۱۲۴۔

طرح بسیط اور بغیر اجزا کے ہوں گے۔ لہٰذا وہ چیزیں جو اس دنیا میں موجود ہیں وہاں بھی ہیں[1]
روایات طینت اُس دنیا اور اس نکتہ کو بیان کرنا چاہتی ہیں کہ یہ انسان جو پوری زندگی بھر ترقی
کرتا ہے اور بعد میں اپنے اختیار سے ایسے اعمال انجام دیتا ہے جس کی وجہ سے اچھا یا برا ہو جاتا
ہے۔ یہ تمام چیزیں اس دنیا میں یکجا موجود ہیں اور انسان کا اچھا یا برا ہونا اس کے دنیا میں آنے
سے پہلے اس عالم میں معلوم ہے۔ اس لئے کہ اس دنیا کے یا اس کے تمام مراحل وہاں موجود ہیں۔
آیا اب یہ گفتگو یعنی اس دنیا میں اچھا یا برا معلوم ہونے کا معنی جبر ہے؟ نہیں، اگر لوگ اس دنیا میں
با اختیار عمل انجام دیتے ہیں تو اس دنیا میں بھی اسی طرح یکجا ہوں گے اور اگر مجبور ہیں تو وہاں بھی
یکجا جبر ہی ہوگا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید انسان کو اس دنیا میں مختار بتا رہا ہے تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کا یکجا اور بسیط وجود بھی مختار ہے۔ ایسے عالم کا ہونا، اس میں
انسان کا حاضر ہونا اور وہاں اچھا اور برا معلوم ہونا انسان کے مختار ہونے سے منافات نہیں رکھتا
ہے۔ پس روایات طینت، انسان کے مجبور ہونے کا سبب نہیں ہیں۔

۳۔ فلسفی جبر

بعض فلسفی قواعد بھی انسان کے اختیاری کاموں میں جبر کے توہم کا سبب بنے ہیں اسی
بنا پر بعض لوگوں نے قواعد کو غلط یا قابل استثناء کہا ہے اور بعض لوگوں نے انسان کے اختیاری
کاموں کو جبری قرار دیا ہے۔ منجملہ قاعدہ ﴿الشّئی مَالم یجِب لم یُوجد﴾ ہے (ہر وہ چیز جب
تک سرحد ضرورت و وجوب تک نہ پہنچے وجود میں نہیں آئے گی) جبر ایجاد کرنے میں اس قاعدہ
کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قاعدہ انسان کے اختیاری کاموں کے بھی بشمول ہے۔ اختیاری کام بھی
جب تک سرحد ضرورت و وجوب تک نہ پہنچیں پورے نہیں ہوں گے۔ چونکہ ایسا ہی ہے لہٰذا ہر
اختیاری کام جب تک سرحد وجوب تک نہیں پہنچا ہے پورا نہیں ہوگا اور جب سرحد ضرورت و وجوب

---

[1] اس عالم میں ''ابھی'' کی تعبیر مجبوری کی وجہ سے ہے ورنہ اس دنیا میں حال، گذشتہ اور آئندہ نہیں ہے۔

تک پہنچ جائے گا تو انسان چاہے یا نہ چاہے قطعاً وہ کام محقق ہوگا۔ اسی لئے انسان محکوم و مجبور ہے اور اس کے ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس شبہ کے جواب میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ قاعدہ عقلی اور کلی ہے اور قابل استثناء نہیں ہے اور یہ بات اپنی جگہ ثابت اور مسلم ہے۔ لیکن اس قاعدہ سے جبر کا استخراج اس سے غلط استفادہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ یہ قاعدہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ انسان کے اختیاری کام کن شرائط میں مرحلہ وجوب وضرورت تک پہنچتے ہیں بلکہ صرف مرحلہ ضرورت و وجوب تک پہنچنے کی صورت میں اختیاری کام کے حتمی پورا ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اختیاری کام میں یہ وجوب و ضرورت ارادہ کے پورا ہونے سے وابستہ ہے اور جب تک ارادہ پورا نہ ہو وہ مرحلہ ضرورت و وجوب تک نہیں پہنچے گا لہٰذا اگرچہ اس قاعدہ کے مطابق جس وقت اختیاری کام مرحلہ ضرورت تک پہنچے گا پورا ہونا حتمی ہے لیکن اس کا مرحلہ ضرورت تک پہونچنا ارادہ کے تحقق سے وابستہ ہے اور ایسی صورت میں یہ قاعدہ نہ صرف انسان کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے معنی انسان کا حقیقی مختار ہونا ہے۔

دوسرا قاعدہ جو جبر کے توہم کا باعث ہوا ہے وہ قاعدہ (ارادہ کا بے ارادہ ہونا) ہے۔ اس شبہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر اختیاری فعل ارادہ سے پہلے ہونا چاہیئے اور خود ارادہ بھی انسان کے درونی اختیاری امور میں سے ہے لہٰذا اس کے اختیاری ہونے کے لئے دوسرے ارادہ کا اس کے پہلے ہونا ضروری ہے اور پھر تیسرے ارادہ کا بھی دوسرے ارادہ سے پہلے ہونا ضروری ہوگا، اور یہ سلسلہ لامحدود ہونے کی وجہ سے متوقف ہو جاتا ہے جس کا یہ معنی ہے کہ وہ ارادہ اب اختیاری نہیں رہا بلکہ جبر ہو گیا ہے اور جب وہ ارادہ جبری ہو گیا تو اختیاری کام بھی جو اس سے وابستہ ہے جبری ہو جائے گا۔

اس کا جواب جو کم از کم فارابی کے زمانے سے رائج ہے متعدد و متنوع جوابات سے مزین ہے، جن میں سے سب سے واضح جواب ذکر کیا جا رہا ہے۔

اختیاری فعل کا معیار یہ نہیں ہے کہ ارادہ سے پہلے ہو، تا کہ اختیاری فعل کے لئے کوئی ارادہ نہ ہو، بلکہ اختیاری فعل کا معیار یہ ہے کہ ایسے فاعل سے صادر ہو جو اپنے کام کو رضایت اور رغبت سے انجام دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دوسرا عامل اس کو اس کی رغبت کے خلاف مجبور کرے۔ انسان کے تمام اختیاری کام منجملہ انسان کا ارادہ اسی طرح ہے اور ہمیشہ انسان کی خواہش سے انجام پاتا ہے اور انسان ان کے انجام دینے میں کسی جبر کا شکار نہیں ہے۔

تیسرا قاعدہ جو فلسفی جبر کے توہم کا موجب ہوا ہے وہ قاعدہ (ایک معلول کے لئے دو علت کا محال ہونا) ﴿استحالۃُ توارد العلّتین علیٰ معلولٍ واحدٍ﴾ ہے اس شبہ میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام مخلوقات منجملہ انسان کے اختیاری افعال خداوند عالم کی مخلوق اور معلول ہیں۔ اور یہ موضوع متعدد عقلی و نقلی دلیلوں پر مبنی ہے جسے ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ اس وقت اگر انسان کے اختیاری امور کے بارے میں کہا جائے کہ یہ حوادث انسان کے اختیار و ارادہ سے وابستہ ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ انسان بھی ان حوادث کے رونما ہونے کی علت ہے اور اس کا لازمہ ایک معلوم کے لئے (انسان کا اختیاری فعل) دو علت (خدا و انسان) کا وجود ہے اور اس کو فلسفہ میں محال مانا گیا ہے کہ ایک معلوم کے لئے دو علتوں کا ایک دوسرے کے مقابلہ میں اور ہم رتبہ ہونا لازم آتا ہے، لیکن اس درمیان دو علتوں کا وجود اس طرح کہ ایک دوسرے سے بالاتر ہوں یہ فلسفی اعتبار سے نہ صرف محال نہیں ہے بلکہ فلسفی مباحث کے مطابق دنیا کی خلقت اسی اصول پر استوار ہے اور انسان کے اختیاری امور کے سلسلہ میں صورت یوں ہے کہ انسان کے اختیاری امور سے منسوب خداوند عالم کی علت اور اس کی فاعلیت بالاتر ہے اور انسان اور اس کا اختیار ادراہ خدا کے

ساتھ واقع ہے۔ اسی بنا پر خداوند عالم کی علیت، انسان اور اس کے اختیار کی علیت بھی قابل قبول ہے اور یوں کسی طرح کا کوئی جبر لازم نہیں آتا ہے۔[1]

[1] اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے رجوع کریں: سبحانی، الالٰهیات علی هدی الکتاب والسنة والعقل ج۲ ص ۲۰۳، ۲۰۴، محمد تقی مصباح، معارف قرآن (خداشناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) ص ۳۷۸، ۳۸۹۔

مقدمات اختیار

اس فصل کے مطالعہ سے اپنی معلومات کو آزمائیں

۱۔ان عناصر کا نام بتائیں جن کا انسان ہر اختیاری عمل کے پورا کرنے میں محتاج ہے؟

۲۔انسان کے اختیاری اعمال میں تین عناصر میں سے ہر ایک کی وضاحت کریں؟

۳۔معرفت انسان کے اسباب کو آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے بیان کریں؟

۴۔اندرونی کشش (خواہشات) کی تقسیم کرتے ہوئے ہر ایک کے بارے میں مختصر سی وضاحت کریں؟

۵۔انتخاب اعمال کے معیار کی وضاحت کریں؟

۶۔عالم آخرت کے کمالات ولذتوں کے چار امتیاز اور برتری کو بیان کریں؟

گذشتہ فصل میں ہم نے انسان کے متعلق اختیاری طرز عمل اور کام کو مرتب کرنے والے مختلف اسباب کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ ان اسباب کے درمیان انسان کا اختیار بہت ہی اہم رول ادا کرتا ہے اور انسان کا قصد وانتخاب اس کے اختیاری کام اور سلوک میں سرنوشت ساز ہے۔ اس طرح اختیاری طرز سلوک اور عمل میں دقت وتوجہ، حقیقت و اختیار کی ساخت وساز میں معاون ومددگار رہے۔ اسی بنا پر خصوصاً اختیار کی کیفیت کی ترتیب میں قدیم الایام سے متنوع ومتعدد سوالات بیان ہوئے ہیں جن میں سے بعض اہم سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کیا انسان کا اختیار بے حساب و بہت زیادہ ہے اور کیا کسی قاعدہ واصول پر مبنی نہیں ہے یا اختیار کی ترتیب بھی دوسرے عوامل واسباب کے ماتحت ہے؟

۲۔ اختیار کو فراہم کرنے والے اسباب کون ہیں اور انسان کی توانائی، خواہش اور معلومات کا اس سلسلہ میں کیا کردار ہے؟

۳۔ اختیاری کام میں انتخاب وتعیین کا معیار کیا ہے اور سرگرم وعقلمند انسانوں اور بہت زیادہ متاثرہ افراد کہ جو اپنے انتخاب کی باگ ڈور معاشرے کے حالات وماحول کے شانے پر ڈال دیتے ہیں اور غفلت یا کسی جماعت کے ساتھ اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کون سے تفاوت واختلاف موجود ہیں بیان کریں؟

۴۔ کیا انسان کی معرفت کے عام اسباب اور طرز عمل (تجربہ اور تعقل وتفکر) صحیح راہ کے انتخاب ومعرفت کے لئے تمام مراحل میں کفایت کرتے ہیں؟

۵۔ خصوصاً وحی کے ذریعہ استفادہ کی بنیاد پر اور گذشتہ سوالات کے جوابات کے منفی ہونے کی صورت میں حقیقی سعادت کے حصول اور صحیح راستہ کے انتخاب اور اس کی معرفت میں (خصوصاً طریقہ وحی) اور (عام طریقہ معرفت) میں سے ہر ایک کا کیا کردار ہے؟ اور کیا اس موضوع میں دونوں طریقہ ایک دوسرے سے ہماہنگ ہیں؟ اس فصل میں ہم مذکورہ بالا سوالات کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کریں گے۔

اختیار کو مہیا کرنے والے عناصر

ہر اختیاری عمل کا تحقق کم از کم تین عنصروں کا محتاج ہے۔

۱۔ معلومات ومعرفت

۲۔ خواہش وارادہ۔

۳۔ قدرت وتوانائی۔

معرفت

اختیاری کاموں میں معرفت ایک چراغ کی مانند ہے جو امور اختیاری میں واضح اور روشن کر دینے والا کردار ادا کرتی ہے، چونکہ ہمارے لئے طریقۂ انجام اور کام کو پہچاننا اور ان کی اچھائی اور برائی کو جدا کرنا ضروری ہے تا کہ ہم سب سے بہتر کا انتخاب کر سکیں اور ہمارا یہ اختیاری کام حکیمانہ اور عقل پسندی پر مبنی ہو لیکن کام کے اچھے اور برے کی معرفت حقیقی کمال کے سلسلہ میں صحیح معلومات اور اس کی راہ حصول پر مبنی ہے۔ جب تک ہم اپنے حقیقی اور مکمل کمال اور اس کے راہ حصول کو نہیں سمجھ سکیں گے اس وقت تک کام کی اچھائی اور برائی کو صحیح طرح مشخص نہیں کر سکتے اور نہ ہی معقول ودرست انتخاب کر سکتے ہیں۔ حقیقی کمال اور اس کے راہ حصول کی معرفت بھی تین دوسری معرفت پر مبنی ہے، اور وہ مبداء معاد، دنیا اور آخرت کی شناخت ہے اس لئے کہ جو نہیں جانتا کہ اس

کا اور موجودات کا وجود مستقل اور کافی ہے یا خالق دو عالم سے وابستہ ہے وہ حقیقی اور مکمل کمال اور اپنے وجود کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا ہے اور دوسری طرف جو اللہ پر عقیدہ نہیں رکھتا اس کے لئے یہ فریضہ واضح نہیں ہے کہ وہ خدا تک پہنچ سکتا ہے یا خدا سے قریب ہو سکتا ہے یا اس کی آخری آرزو لقاء اللہ ہے تو کیا اس تک دست رسی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ لہٰذا ایسے انسان کا طریقۂ عمل اس شخص سے جداگانہ جو اپنے وجود اور تمام موجودات کو خدا کی ملکیت جانتا ہے، اور اپنا کمال خدا سے نزدیک ہونے کو سمجھتا ہے ان دونوں افراد میں کمال کے حصول کی راہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔

معاد کا موضوع بھی کچھ اسی طرح کا ہے اگر زندگی، مادی دنیا کی زندگی میں منحصر نہ ہو تو قابل حصول معنوی کمالات، دنیاوی لذتوں سے کہیں بالاتر ہوں گے اور انسان کو اپنے طریقۂ عمل میں اس معرفت کو حاصل کرنا چاہیئے کہ کس طرح اپنے اختیاری کوشش سے اس کمال کو حاصل کرے اور ضرورت کے وقت بہت ہی جلد ختم ہونے والی دنیاوی لذتوں کو آخرت کی برتر اور پائیدار لذت پر قربان کر دے، پس مرحلۂ معرفت میں مسئلہ مبدا، معاد دنیا و آخرت کا رابطہ اور مکمل کمال کی راہ امور اختیاری کے انجام میں عقلائی اور ضروری ہے۔ اور یہ مسئلہ یعنی قرآن مجید کا مبدا و معاد اور اس کے بارے میں معلومات نیز دنیاوی و اخروی زندگی کی خصوصیات اور ان دونوں کے درمیان رابطہ پر تاکید کرنا اس قضیہ کے اہم رازوں میں سے ایک راز ہے۔

انسان کے امکانات اور ضروری معرفت

اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اختیاری کام کے انجام میں معرفت اہم کردار ادا کرتی ہے اور شناخت میں بھی مکمل کمال کی معرفت اور اس کی راہ حصول کے محتاج ہیں دوسرا اہم سوال جو بیان ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کن راہوں سے اس ضروری معرفت کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور کیا معرفت کے عام اسباب و امکانات اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں؟

قرآن مجید نے حواس، عقل اور دل کا اسباب کے عنوان سے ذکر کیا ہے جن کو خداوند عالم نے راہ کمال طے کرنے کے لئے انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے اور اس راہ میں ان سے استفادہ کی تاکید کی ہے، اور کافروں اور منافقوں کی ان اسباب کے استعمال نہ کرنے یا ان کے تقاضوں کے مطابق عمل نہ کرنے پر مذمت و ملامت کی ہے۔ سورہ دھر کی دوسری آیت میں حواس کو قابو میں رکھنے کو انسان کے لئے آزمائش قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿إِنَّا خَلَقنَا الإِنسَانَ مِن نُطفَةٍ أَمشَاجٍ نَّبتَلِيهِ فَجَعَلنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً﴾

ہم نے انسان کو مخلوط نطفے (مختلف عناصر) سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں (اسی وجہ سے) ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

یہ آیت مواقع آزمائش کے فراہم ہونے میں انسان کی سماعت و بصارت اور آخرکار اس کے صعود یا نزول کے اہم کردار کی طرف اشارہ کرتی ہے سورہ نحل کی ۷۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ أَخرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُم لا تَعلَمُونَ شَيئاً وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمعَ وَالأَبصَارَ وَالأَفئِدَةَ لَعَلَّكُم تَشكُرُونَ﴾

اور خدا ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، تم بالکل نا سمجھ تھے اور تم کو کان دیا اور آنکھیں دیں اور دل عطا کئے تاکہ تم شکر کرو۔

یہ آیت بھی انسان کی سعادت میں عمومی (حواس و دل) اسباب معرفت کے کردار اور خداوند عالم سے تشکر کے بارے میں بیان ہوئی ہے۔

اس آیہ کریمہ کے سلسلہ میں متعدد و مختلف سوالات کئے گئے ہیں یہاں ان دو سوالوں کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کریں گے جو ہمارے موضوع سے بہت زیادہ مربوط ہیں۔

۱۔ فلسفی مباحث میں کہا گیا ہے کہ ہر موجود مجرد اپنے آپ سے آگاہ ہے اور انسان کا نفس ایک موجود مجرد ہے لہٰذا اپنی ذات کے بارے میں معلومات رکھنا چاہیئے البتہ انسان بھی ابتدائی بدیہی چیزوں کو فطری طور پر جانتا ہے اور فطرت کی بحث میں ہم نے بیان بھی کیا ہے کہ انسان فطری طور پر خدا سے آشنا ہے جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے کہ بعض انبیاء اور ائمہ معصومینؑ شکم مادر ہی میں صاحب دانش تھے لیکن آیہ شریفہ میں انسان کو ولادت کے وقت کسی بھی طرح کی معلومات سے بالکل عاری بتایا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیہ اس ظاہری علوم کو بیان کر رہی ہے جو انسان عام طور پر حاصل کرتا ہے اور انبیاء وائمہ کے استثنائی علوم نیز انسان کے نامعلوم اور نصف معلوم علوم[۱] کو بیان نہیں کر رہی ہے، لہٰذا اپنے سلسلہ میں نفس کی معلومات اور ابتداء خلقت کے تمام فطری معارف میں خدا کے بارے میں نامعلوم حضوری معرفت اور معصوم رہبروں کے علوم بھی (**لا تعلمون شیئاً**) کی عبارت سے کوئی منافات نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ عبارت معلوم اور

---

[۱] جب لفظ علم، عرف میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد معلومات ہے لیکن دقیق فلسفی اعتبار سے علم کی تین قسمیں ہیں: ''بے خبری''، ''نصف معلومات''، ''پوری معلومات''۔ ''بے خبری'' وہ علم ہے جس کے بارے میں انسان کوئی درک وفہم نہیں رکھتا ہے حتی اس سے متعلق سوال کے مقابلہ میں کہتا ہے کہ: میں نہیں جانتا ہوں! لیکن تجربیات اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ایسی بے خبری کا علم انسان میں بہت زیادہ ہے، ''نصف آگاہی'' وہ علم ہے جس میں انسان اس بات سے باخبر ہے کہ وہ نہیں جانتا ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ باخبر ہوجائے جس طرح ہم بہت سی چیزوں کے بارے میں جانتے ہیں لیکن فی الحال ہم غافل ہیں، لیکن کسی جذبۂ معانی یا اس کے متناسب محرک سے روبرو ہونے یا انسان کو متوجہ کرنے والے دوسرے عوامل کے ذریعہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم اسے جانتے ہیں، ''پوری معلومات'' یہ ہے کہ ہمارے پاس علم ہے اور اس بات کا بھی علم ہے کہ ہم جانتے ہیں، جب عرف میں کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں مسئلہ کا علم رکھتا ہے تو یہی تیسرا معنی مراد ہوتا ہے۔

نا معلوم تمام بشری علوم کو شامل ہے تو یہ جملہ عام ہے جو قابل تخصیص ہے اور ہم عقلی یا نقلی دلائل سے مذکورہ موارد کو تخصیص دیں گے اور آیت ان موارد کو شامل نہیں ہوگی۔

۲۔لفظ ''فؤاد'' اوراس کی جمع ''افئدہ'' سے مراد اور قرآن کی اصطلاح میں قلب اور فلسفہ کی اصطلاح میں ''نفس'' سے کیا مراد ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں فواد لفظ قلب کے مترادف ہے اسی بنا پر ہم حضرت موسیٰ کی داستان میں پڑھتے ہیں:

﴿وَأَصبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغاً إن كَادَت لَتُبدِى بِهِ لَولاأن رَّبَطنا عَلَىٰ قَلبِهَا لِتَكُونَ مِنَ المُؤمِنِينَ﴾[1]

اور موسیٰ کی ماں کا دل ایسا بے چین ہوگیا اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ راز کو فاش کر دیتی تاکہ مومنوں میں سے ہو جائے۔

اس آیت میں فواد اور قلب کا ایک ہی چیز پر اطلاق ہوا ہے اور حالت اضطراب (دل کا متحیر ہونا) اور احساس آرام کو دل کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

حقیقت میں یہ دو لفظیں انسان یا حیوان کے بدن میں ایک مخصوص عضو کے معنی میں ہیں کہ جن کا کام خود کو صاف کرنا اور اس کو گردش دینا ہے اور عام طور پر سینہ کے بائیں حصہ میں ہے لیکن عرف میں احساسات، عواطف اور مرکز ادراکات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لفظ کے لغوی و عرفی معنی کے درمیان رابطہ شاید اس طرح سے ہو کہ عرف عام تصور کرتا تھا کہ ادراک و احساس اس مخصوص اعضاء سے مربوط ہیں اور انہیں کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔[2]

---

[1] سورہ قصص آیت:۱۰۔

(۲) قرآن میں بھی کبھی لفظ قلب اسی عرفی اصطلاح میں استعمال ہوتا ہے جیسے ﴿فَإنّهَالا تَعمَى الابصَارُ وَ لَكِن تَعمَى القُلُوبُ الَّتِى فِى الصُّدُورِ﴾ سورۂ حج، آیت:۴۶ (کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ

حاشیہ۲ کا بقیہ حاشیہ اگلے ص پر.....

بہر حال قرآن میں فواد و قلب کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سینہ کے اندر مادی عضو یا کوئی روح نہیں ہے بلکہ متعدد قوتوں کا مالک ہونا ہے اس لئے کہ آیات قرآن میں مختلف امور کو قلب اور فواد کی طرف نسبت دی گئی ہے جو ہر قسم کی روحی توانائی سے مربوط ہے، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیتوں میں ''فقہ'' کو جو دقیق فہم کے معنی میں ہے اور ''عقل'' کو جو حقیقی دریافت کے معنی میں ہے قلب کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

﴿أَفَلَم يَسِيرُوافِي الأرضِ فتكُونَ لَهُم قُلُوبٌ يَعقِلُونَ بِهَا﴾

کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں (اور غور وفکر نہیں کرتے) تا کہ ان کے ایسے دل

پچھلے ص کا حاشیہ ۲ کا بقیہ حاشیہ......

وہ دل جوان سینہ میں ہے وہی اندھا، ہوجایا کرتا ہے) ممکن ہے کہا جائے کہ یہ رابطہ ایک خیالی رابطہ ہے تو کیوں قرآن اشارتاً اس کی تائید کرتا ہے؟ جواب میں کہا جاسکتا ہے چونکہ قرآن مجید انسانوں کی زبان میں نازل ہوا ہے لہٰذا اس حصہ میں ان کی اصطلاحات کے مطابق گفتگو کی ہے اور مراد یہ ہے کہ تمہارے چہرے کی آنکھوں کے بارے میں نہیں کہا ہے بلکہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ صدور سے مراد جسمانی سینہ نہیں ہے بلکہ دل سے مراد درک کرنے والی قوت ہے اور صدر سے مراد انسان کا باطن ہے، اس لئے کہ عرف میں معمولاً جب باطن کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ''میرے سینہ میں راز ہے''۔ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: ﴿إنَّ اللّٰہَ عَلِیمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ سورۂ لقمان، آیت: ۲۳۔ خداوند عالم سینوں کے اندر کے حالات کو بھی جانتا ہے، اس لئے کہ بدن کی سب سے چھپی اور مخفی جگہ سینہ ہے۔ لہٰذا قلب یعنی مرکز ادراک اور صدر یعنی انسان کے باطن کا ایک حصہ ہے۔ حتی اگر ہم یہ قبول نہ کریں کہ قلب مرکز احساس و ادراک ہے تو کم از کم ایک ایسا عضو ہے جو ہر عضو کے مقابلہ میں بہت زیادہ روح سے مربوط ہے اور ایسا عضو ہے جو بدن سے روح کی جدائی کے وقت سب سے آخر میں بیکار ہوتا ہے۔ روح کا بدن کے تمام اعضا سے رابطہ مساوی نہیں ہے اور بعض اعضا جیسے قلب و مغز میں یہ رابطہ سب سے پہلے اور قوی ہوتا ہے اور شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ قلب سے روح کا رابطہ سب اعضا پر مقدم ہے۔

ہوتے جس سے حق باتوں کو سمجھتے۔ [1]

﴿وَلَقَد ذَرَأنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِنَ الجِنِّ وَالإنسِ لَهُم قُلُوبٌ لا يَفقَهُونَ بِهَا وَلَهُم أَعيُنٌ لايُبصِرُونَ بِهَا وَلَهُم آذَانٌ لايَسمَعُونَ بِهَا......﴾ [2]

اور گویا ہم نے بہت سے جنات اور آدمیوں کو (اپنے اختیار سے عمل انجام دیں چونکہ غلط راستہ کو انتخاب کیا ہے) جہنم ہی کے واسطے پیدا کیا ان کے پاس دل تو ہے مگر اس سے سمجھتے نہیں ہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور ان کے پاس کان تو ہیں مگر ان سے سنتے ہی نہیں ہیں۔ دوسری طرف احساسات اور جذبات چاہے مثبت ہوں یا منفی مثال کے طور پر اچھا لگنے اور برا لگنے کو دل کی طرف نسبت دی گئی ہے جیسے۔

﴿إنَّمَا المُؤمِنُونَ الَّذِينَ إذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَت قُلُوبُهُم﴾ [3]

سچے ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ لگتے ہیں۔

﴿وَإذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحدَهُ اِشمَأَزَّت قُلُوبُ الَّذِينَ لايُؤمِنُونَ بِالآخِرَةِ﴾

اور صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل متنفر ہو جاتے ہیں۔ [4]

دوسری آیات میں قلب کو، مکان ایمان [5] مرکز انحراف [6] بیماری [7] اور مہر زدہ [8] سمجھا گیا ہے، بعض آیات کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ قلب علم حضوری بھی رکھتا ہے جیسے۔

﴿كَلَّا بَل رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكسِبُونَ كَلَّا إنَّهُم عَن رَّبِّهِم يَومَئِذٍ لَّمَحجُوبُونَ﴾ [9]

---

[1] سورۂ حج، آیت: ۴۶۔ [2] سورۂ اعراف، آیت: ۱۷۹۔ [3] سورۂ انفال، آیت: ۲۔
[4] سورۂ زمر، آیت: ۴۵۔ [5] سورۂ حجرات، آیت: ۷ [6] سورۂ آل عمران، آیت: ۷۔
[7] سورۂ بقرہ، آیت: ۱۰۔ [8] سورۂ بقرہ، آیت: ۷ [9] سورۂ مطففین، آیت: ۱۴، ۱۵۔

ہرگز نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو کام کرتے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے بیشک اس دن اپنے پروردگار سے روک دیئے جائیں گے۔

ان لوگوں کو روز قیامت خداوند عالم کا جلوہ دیکھنا چاہیئے لیکن ان کے اعمال آئینہ دل پر تصویر کی مانند ہو گئے ہیں جو مانع ہے کہ انوار الٰہی اس میں جلوہ گر ہو اس لئے دل وہ شئی ہے جو خداوند عالم کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ معنی روایات میں بھی آیا ہے:

﴿لا تدرکُهُ العُیُون بِمشاهدةِ العیان ولکِن تُدرکُه القلوب بحقَائقِ الإیمان﴾

ظاہری آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتی ہیں لیکن قلوب اس کو حقائق ایمان کے ذریعہ درک کرتے ہیں۔[1]

قرآن میں انتخاب واختیار کو بھی دل کی طرف نسبت دیا گیا ہے:

﴿لا یؤَاخِذُکُمُ اللهُ بِاللَّغوِ فِی أیمَانِکُم وَلکِن یُؤَاخِذُکُم بِمَا کَسَبَت قُلُوبُکُم﴾[2]

تمہاری لغو قسموں پر خدا تم سے گرفت نہیں کرے گا مگر ان قسموں پر ضرور تمہاری گرفت کرے گا جو تم نے قصداً دل سے کھائی ہو۔

﴿وَلَیسَ عَلَیکُم جُنَاحٌ فِیمَا أَخطَأتُم بِهِ وَلکِن مَّا تَعَمَّدَت قُلُوبُکُم وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوراً رَّحِیماً﴾[3]

اور ہاں اگر بھول چوک ہو جائے تو اس کا تم پر کوئی الزام نہیں ہے مگر جب تم دل سے (انتخاب کیا ہے) جان بوجھ کر کرو (مواخذہ کیا جائے گا) اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قلب قرآن مجید میں ایسی شئی ہے جو علم حضوری اور علم حصولی بھی رکھتا ہے اور احساس، ادراک، ہیجان، جذبات، انتخاب اور اختیار کو بھی اسی کی طرف نسبت دی

---

[1] نہج البلاغہ، خ/۱۷۹۔

[2] سورۂ بقرہ، آیت: ۲۲۵۔ [3] سورۂ احزاب، آیت: ۵۔

جاتی ہے صرف وہ چیز جس کو نفس کی طرف نسبت دی جاتی ہے اور قلب کی طرف نسبت نہیں دی جاتی ہے وہ بدن کے کام ہیں۔ اس لئے کہ '' قلب و فؤاد '' ایک مخصوص قوت نہیں ہے[1] قرآن مجید میں ان کے موارد استعمال کے اعتبار سے اس چیز کے مترادف ہے جسے فلسفہ میں روح یا نفس کہا جاتا ہے۔ بہر حال بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے معرفت کے لئے اسباب خلق کئے جن میں سب سے مہم آنکھ، کان اور دل ہیں۔ [2]

---

[1] فلسفی بحثوں میں انسان سے سرزد ہونے والے ہر کام کے لئے ایک مخصوص مبداء ہے۔ جب ہم مختلف اقسام کے ادراکات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ان سب چیزوں کے لئے ایک قوت ہے جیسے حس مشترک، خیال، حافظہ اور عقل لیکن نفسیاتی کیفیات اور انفعالات کے لئے کسی فاعلی مبدا کے قائل نہیں ہیں اور اس کو نفس کی طرف نسبت دیتے ہیں۔

[2] قرآن مجید مختلف وسائل سے معرفت و دانش کے حصول کے سلسلہ میں ایک خاص اہمیت و احترام کا قائل ہے لیکن انسان کے لئے بعض ایسے علم کو بھی شمار کیا ہے جو معمولی راہوں سے حاصل نہیں ہوتے ہیں، ان میں سے منجملہ وہ علوم ہیں جو وحی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں: ﴿الرَّحمٰنَ عَلَّمَ القُرآن﴾ سورۂ رحمٰن، آیت: ۲۔ ہم معمولی راہوں سے عالم قرآن ہوتے ہیں، لیکن پیغمبرؐ علم حضوری سے حقیقت و ذات وحی کو حاصل کر کے عالم قرآن ہوتا ہے۔ انبیاء پر وحی کے علاوہ ''علم لدنی'' نیز غیر انبیاء کے لئے وحی سے حاصل ہونے والے علوم غیر معمولی راہوں کو بیان کرتے ہیں۔ لفظ لدنی قرآن میں نہیں آیا ہے لیکن ایسے علم کا نام لیا گیا ہے جو خداوند قدوس کی طرف (لدنی) سے ہے: ﴿وَعَلَّمناهُ مِن لَدُنَّا عِلماً﴾ سورۂ کہف، آیت: ۶۵۔ ہم نے اسے اپنے پاس سے علم دیا اور حضرت مریم اور موسیٰ کے سلسلہ کی وحی میں آیا ہے کہ: ﴿وَأوحَینا إلیٰ أُمّ مُوسیٰ أن أرضِعِیهِ فَإذا خِفتَ عَلَیهِ فَألقِیهِ فِی الیَمِّ وَلا تَخافِی وَلا تَحزَنِی إنَّا رَادُّوهُ إلَیکِ وَجاعِلُوهُ مِنَ المُرسَلِینَ﴾ سورۂ قصص، آیت: ۷۔ (اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے پاس یہ وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلا لو پھر جب اس کی نسبت کوئی خوف ہو تو اس کو دریا میں ڈال دو اور تم بالکل نہیں ڈرنا اور نہ ہی سہمنا ہم اس کو پھر

بقیہ حاشیہ ۲ کا حاشیہ اگلے ص پر.....

مذکورہ اسباب انسان کو صحیح راہ کی طرف متوجہ اور راہ معرفت میں گمراہی سے بچانے نیز مبداو معاد اور کمال کے حصول کی راہ کے بارے میں عمومی معارف کے درک میں مدد پہنچانے کے لئے ضروری کردار ادا کرتے ہیں اور اگر کوئی ان کو استعمال کرے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے تو مبدا، معاد اور راستہ کی راہنمائیوں کو پہچان لے گا لیکن یہ اسباب، کمال کے حصول کی راہ کو لحہ بہ لحہ اور دقیق انداز میں بتانے سے ناتواں ہیں اور یہ کہ کون سا کام سعادت لاتا ہے اور کون سا کام برائی پیدا کرتا ہے اس کے لئے بالکل صحیح راہ عمل کی تعیین کے سلسلہ میں ان پر اکتفاء نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کے درمیان لحہ بہ لحہ اور بالکل صحیح رابطہ کہ تعیین کو کشف کرنا ان اسباب کی توانائی سے باہر ہے۔ اسی لئے وحی کی ضرورت ہے اور اس طرح معارف وحی کی اہمیت ہم پر آشکار ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ وہی مخصوص راہ ہے جسے خداوند عالم نے بشر کی حقیقی اور نہائی سعادت حاصل کرنے کے لئے انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے۔ اسی لئے عمومی اسباب معرفت، راہ سعادت کے عمومی طریقے بیان کرنے میں بہت کارساز ہیں لیکن خطا کا احتمال اور متاثر ہونے کا امکان نیز ان کی محدودیت وغیرہ کی وجہ سے راہ سعادت کی تفصیلی معرفت میں ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے، لہٰذا ایک اور راہ کی ضرورت ہے اور وہ راہ وحی و نبوت ہے۔

بقیہ پچھلے ص کا حاشیہ ۲ کا حاشیہ....

تمہارے پاس پہنچادیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے) مادر موسیٰ نے اسی وحی کے ذریعہ اپنے فرزند کے مستقبل کے بارے میں علم وخبر حاصل کیا تھا اور حضرت مریم کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ......﴾ سورۂ آل عمران آیت: ۴۵۔ (جب فرشتوں نے کہا اے مریم خدا تم کو صرف اپنے حکم کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ مسیح ابن مریم ہوگا)۔

خواہش اور ارادہ

خواہش وارادہ جو اختیاری کاموں میں توانائی کا کردار ادا کرتا ہے اختیاری سرگرمی میں دوسرا ضروری عنصر ہے، جو معرفت انسانی کو قصد و حرکت عطانہیں کرتی ہے بلکہ صرف راستہ بتاتی ہے۔؟ یہ تو خواہشات ہیں جو راہ کی شناخت کے بعد انسان کو جستجو میں ڈال دیتی ہیں۔ خواہش و ارادہ کا رابطہ ایک اہم بحث ہے جس کے بارے میں دو مختلف نظریے بیان ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے ارادہ کو شدید خواہش کہا ہے اور بعض لوگوں نے شدید شوق یا شدید خواہش کو ارادہ کے پورا ہونے کی شرط مانا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انسان اور اس کے مشابہ مخلوق کسی بھی مقام پر ارادہ نہیں کرسکتی ہے مگر یہ کہ اس میں خواہش موجود ہو۔ انسان کے اندر حیوانی اور پست نیز انسانی ترقی یافتہ و بلند خواہشات ہیں جن سے انسان، جنسی یا غذا اور دوسرے جسمانی امور کی خواہش کرتا ہے اس سلسلہ میں بہت زیادہ بحث ہوئی ہے اور متعدد و مختلف تقسیم بندی ہوئی ہے جن میں سے ضروری مندرجہ ذیل ہیں۔

خواہشات کی تقسیم بندی

سب سے اہم تقسیم بندی میں سے ایک تقسیم اندرونی رغبتوں کو چار قسم غرائز جذبات انفعالات اور احساسات میں تقسیم کرنا ہے۔

خواہشات

انسان کی فوری ضرورتوں کو بیان کرنے والی اور جسم کے کسی ایک اعضاء سے مربوط باطنی رغبت کو غریزہ کہا جاتا ہے جیسے کھانے اور پینے کی خواہش جو انسان کی طبیعی ضرورت کو بھی دور کرتی ہے اور معدہ سے مربوط ہے یا جنسی خواہش نسل کی بقا کا ضامن ہے اور مخصوص عضو سے مربوط ہے۔

جذبات

جذبات: وہ خواہش ہے جو دوسرے انسان کے لئے ظاہر ہوتی ہے جیسے بچوں کے لئے والدین کی محبت اوراس کے برعکس یا کسی دوسرے انسان کے لئے ہماری مختلف رغبتیں اجتماعی، طبیعی یا معنوی رابطہ جس قدر زیادہ ہوگا محبت بھی اتنی ہی شدید تر ہوگی جیسے والدین اور فرزند کے رابطہ میں ایک فطری حمایت موجود ہے۔اور استاد وشاگرد کے رابطہ میں معنوی حمایت موجود ہے۔

انفعلات

انفعالات یا منفی رجحان جو جذبات کے مقابلہ میں ہے اوراس کے برعکس یعنی ایک روحی حالت ہے جس کی بنیاد پر انسان ناپسندیدگی یا احساس ضرر کی وجہ سے کسی سے دوری کرتا ہے یا اس کو ترک کردیتا ہے اسی وجہ سے نفرت، غصہ، کینہ وغیرہ کے انفعالات میں شمار ہوتا ہے۔

احساسات

بعض اصطلاحات کے مطابق احساسات ایسی کیفیت ہے جو مذکورہ تینوں موارد سے بہت شدید ہے اور صرف انسان سے مربوط ہے۔ گذشتہ تینوں کیفیات کم وبیش حیوانات میں بھی موجود ہیں لیکن احساسات جیسے احساس تعجب، احساس احترام، احساس عشق وعبادت، یہ درونی رغبتیں کبھی کبھی چیزوں میں موثر ہوتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے منضم اور ملکر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور یہ ادراک ومعرفت کے اسباب سے مربوط ہیں اوران پر ادراکی قوتیں بھی موثر ہیں اور انہیں سے بعض خواہشات جنم لیتی ہیں۔

خواہشات کی دوسری تقسیم انفرادی واجتماعی خواہشات کی تقسیم ہے۔فطری خواہشات معمولاً انفرادی اور جذبات کی طرح ہیں اور دوسری خواہشات غالباً اجتماعی ہیں۔

دوسرے اعتبار سے خواہشات کو مادی ونفسیاتی اور پھر نفسیاتی خواہشات کو پست اور بلند

خواہشات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔خواہشات اور اس کی مانند چاہتوں کی فراہمی سے جسمانی ضرورت ختم ہو جاتی ہے یہ مادی خواہشات ہیں۔ اور وہ خواہشات جو جسم کی ضرورت کے پورا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں انہیں نفسیاتی خواہشات کہا جاتا ہے جیسے اس وقت خوشی کی ضرورت جب جسم تو سالم ہوتا ہے لیکن روح مسرور نہیں ہوتی ہے۔اس لئے اس تقسیم بندی کے اعتبار سے خواہشات تین طرح کی ہیں:

(۱) وہ خواہشات جو مادی اور جسمانی پہلو رکھتی ہیں۔

(۲) وہ خواہشات جو مادی اور نفسیاتی پہلو رکھتی ہیں لیکن وہ نفس کی پست خواہشات میں سے ہیں جیسے خوشی اور سکون۔

(۳) وہ خواہشات جو مادی اور نفسیاتی پہلو رکھتی ہیں اور نفس کی اعلیٰ خواہشات میں سے ہیں جیسے ہدف تک رسائی اور آزادی کی خواہش اسی لئے بعض لوگوں نے اعلیٰ ضرورتوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) حق کی تلاش اور حقائق کی معرفت۔

(۲) فضیلت کی خواہش نیز عدالت، حریت کی آرزو۔

(۳) مطلق خوبصورتی کی خواہش، اس لئے کہ وہ خوبصورتیاں جن سے انسان کی خواہش مربوط ہوتی ہیں بہت زیادہ اور مختلف ہیں بعض بصارت سے مربوط ہیں تو بعض سماعت سے اور بعض شعر وشاعری کی طرح خیالات سے مربوط ہیں لیکن مطلقاً خوبصورتی کی خواہش بڑی آرزؤں میں سے ہے۔

بعض لوگوں نے چوتھی قسم کا بھی اضافہ کیا ہے اور اس کو ''مذہبی حس'' کا نام دیا ہے اور بعض لوگوں نے ان تینوں کو بھی اسی چوتھی قسم کے زیر اثر قرار دیا ہے۔

ایک دوسرے اعتبار سے خواہشات دوگروہ میں تقسیم ہوتی ہیں:

۱۔وہ خواہشات جن کی حفاظت، انسان کی موجودیت اور بقامیں مددگار ہے جیسے کھانا پینا لباس اور حفاظت ذات کی خواہش۔

۲۔وہ خواہشات جو کسی کی حفاظت کے لئے نہیں ہیں بلکہ ترقی کے لئے ہیں۔

اس سلسلہ میں بھی تجزیہ وتحلیل ہوئی ہے کہ خواہشات میں سے حقیقی کون سی ہیں اور غیر حقیقی کون سی ہیں تحقیق وتجزیہ کی روشنی میں انسان کے لئے ۲ سے لے کر ۱۲ حقیقی خواہشیں تسلیم کی گئی ہیں۔ مذکورہ خواہشات کبھی ایک طرف اور ایک جہت میں ہیں تو کبھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر حیوانی اور انسانی خواہشات کے درمیان ٹکراؤ اور ناہماہنگی پائی جاتی ہے اور جب انسان دونوں خواہشوں کو بطور کامل انجام نہیں دے پاتا ہے تو مجبوراً ایک کو انتخاب کر کے دوسرے پر ترجیح دیتا ہے اور دوسرے کو محدود یا اس سے چشم پوشی کر لیتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مسئلۂ انتخاب اور ایک خواہش کو دوسری خواہش یا بہت سی خواہشوں پر ترجیح دینے اور اس کے معیار کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔

خواہشات کا انتخاب

معمولاً انسان کہ جس طرح نفسیات کے ماہرین نے کہا ہے کہ، خواہشات کے ٹکراؤ کے وقت ایسی خواہش کی طرف حرکت کرتا ہے اور ایسی خواہشات کے زیر اثر آجاتا ہے جو جذباتی ہوتی ہیں یا ان خواہشات سے بار بار سیر ہونے کی وجہ سے ایک عادت سی ہوگئی ہو یا بہت زیادہ تبلیغ کی بنا پر لوگوں کی توجہ اس کی طرف مائل ہوگئی ہو اور تمام خواہشات کے سلسلہ میں ایک قسم کی غفلت اور بے توجہی برتی گئی ہو۔ بہت ہی اہم اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ماہر نفسیات کی یہ گفتگو متاثر انسانوں کے بارے میں ہے لیکن ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ سرگرم ہو منفعل نہ ہو تو

کن معیاروں کی بنا پر بعض خواہشات کو بعض پر ترجیح دے گا؟

قرآن مجید ایک عام نگاہ میں بڑی خواہشات کو مادی اور پست خواہشات پر ترجیح کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن مجید میں بعض حیوانی خواہشات حقارت ومذمت کے ساتھ ذکر ہوئی ہیں سورہ معارج کی ۱۹ویں آیت میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً وَإِذَا مَسَّهُ الخَيرُ مَنُوعاً إِلا المُصَلِّينَ﴾

بیشک انسان بڑا ہی لالچی پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف اور پریشانی کا سامنا ہوتا ہے تو گھبرا جاتا ہے اور جب اسے بھلائی اور آسودگی حاصل ہوئی ہے تو بخیل بن جاتا ہے مگر جو لوگ نمازیں پڑھتے ہیں۔

آیہ شریفہ یہ ماننے کے بعد کہ انسان کو اس طرح خلق کیا ہے کہ اس کے اندر بعض پست خواہشات موجود ہیں آگاہ کرتی ہے کہ اگر اپنے اختیار سے بہت ہی بلند کمالات کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان خواہشات کا اسیر نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ انہیں عظیم کمالات کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ چونکہ کمال، ایثار کے دامن میں جنم لیتا ہے اسی لئے شہوت پرستی اور شکم پُری اور اس جیسی چیزوں کو اس کے سدراہ نہیں ہونا چاہیئے اور جس وقت کمال فداکاری سے مربوط ہو تو مادی حیات کو اس کو شہادت کے فیض سے روکنا نہیں چاہیئے۔ مذکورہ حقیقت مندرجہ ذیل دو آیتوں میں بھی مورد توجہ اور تاکید ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالبَنِينَ وَالقَنَاطِيرِ المُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ وَالخَيلِ المُسَوَّمَةِ وَ الأَنعَامِ وَالحَرثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الحَيٰوةِ الدُّنيَا وَاللّٰهُ عِندَهُ حُسنُ المَئَابِ﴾[1]

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت:۱۴

لوگوں کو ان کی مرغوب چیزوں بیویوں اور بیٹوں اور سونے چاندی کے بڑے بڑے لگے ہوئے ڈھیروں اور عمدہ عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ الفت بھی کر کے دکھادی گئی ہے یہ سب دنیاوی زندگی کے فائدے ہیں اور اچھا ٹھکانا تو خدا ہی کے یہاں ہے۔

﴿اعلَمُوا أَنَّمَا الحَيٰوةَ الدُّنيَا لَعِبٌ وَلَهوٌ وَ زِينَةٌ وتَفَاخُرٌ بَينكُم وَ تَكَاثُرٌ فِى الأَموَالِ وَالأَولَادِ كَمَثَلِ غَيثٍ أَعجَبَ الكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَيٰهُ مُصفَراً ثُمَّ يَكُونُ حُطَاماً وَ فِى الآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغفِرَةٌ مِنَ اللّٰهِ وَ رِضوَانٌ وَمَاالحَيٰوةُ الدُّنيَا إلا مَتَاعُ الغُرُورِ﴾[1]

جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال واولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ خواہش یہ اس بارش کی طرح ہے (جو سبزہ اگاتی ہے) جس کی ہریالی کسانوں کو خوش کر دیتی ہے اور پھر وہ کھیتی سوکھ جاتی ہے اور اس کی ہریالی زرد پڑ جاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیاوی زندگی تو بس غرور کا ساز و مان ہے۔

دوسری طرف بلند و بالا خواہش کی بہتری وتقویت کی قرآن مجید میں بھی تاکید ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی روشنی میں مقام ومنزلت[2] اور ہمیشہ باحیات رہنے کی خواہش اور خداوند عالم کی طرف رغبت کی خواہش کو مورد توجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض آیتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ سورہ فاطر کی ۱۰ ویں آیت میں انسان کے مقام ومنزلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے ذریعہ اعلیٰ معارف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

---

[1] سورۂ حدید، آیت: ۲۰۔

[2] قدر ومنزلت چاہنا ان خواہشات میں سے ہے جو اصل میں فطری ہے اور غالباً اس میں ابتدائی تجلیات

باقی حاشیہ اگلے ص پر.....

﴿مَن كَانَ يُرِيدُ العِزَّةَ فَلِلّٰهِ العِزَّةُ جَمِيعاً﴾

جو شخص عزت کا خواہاں ہے (تو جان لے) ساری عزت تو خدا ہی کے لئے ہے۔ سبھی مقام و عزت چاہتے ہیں! حقیقت میں عزت و احترام اور آبرو کا حاصل کرنا برا نہیں ہے۔ لیکن یہ جاننا چاہیئے کہ عزت صرف معاشرہ میں پائی جانے والی اعتباری عزتوں سے مخصوص نہیں ہے۔ مذکورہ آیت اسی خواہش کو بیان کر رہی ہے کہ اگر تم فقیر اور محتاج لوگوں میں عزیز ہونا چاہتے ہو تو غنی و بلند پروردگار کے نزدیک کیوں عزیز نہیں ہونا چاہتے؟ جبکہ عزت حقیقی صرف خداوند عالم کے لئے ہے۔

بقا کی خواہش بھی انسان کی فطری خواہشوں میں سے ہے انسان کبھی مرنا نہیں چاہتا ہے اس لئے کہ وہ سوچتا ہے کہ مرنا، نابود ہونے کے معنی میں ہے یا یہ چاہتا ہے کہ اس کی عمر طولانی ہو۔ قرآن مجید بنی اسرائیل کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ لوگ ہزار سال زندہ رہنا چاہتے ہیں:

.......باقی پچھلے ص کا حاشیہ ۲ کا حاشیہ.....

نوجوانی میں ظاہر ہوتی ہیں اور نفسیات شناسی میں بلوغ، انسان کا نقطۂ الفت شمار ہوتا ہے۔ اس کے پہلے بچے اکثر بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں، اس زمانے میں بچہ چاہتا ہے کہ ''خود مختار ہو'' دوسروں کی باتوں پر عمل نہ کرے جو خود سمجھتا ہے اس پر عمل کرے اور امر و نہی سے حساس ہو جاتا ہے۔ یہ حالت بھی اپنی جگہ انسان کے تکامل میں مفید و موثر ہے، یہ حکمت خداوند قدوس ہے کہ جس کی حقیقت حب کمال ہے لیکن معرفت کے نقص کی بنیاد پر محدود شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، قدر و منزلت چاہنا، بزرگوں میں اور اجتماع میں دھیرے دھیرے مقام و مرتبہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ وہ شخص چاہتا ہے کہ حاکم ہو جائے اور دوسرے اس کی بات کو سنیں اور مانیں اس کی بھی مختلف شکلیں ہیں جن میں سے منجملہ شہرت، ریاست، مقام و مرتبہ اور مشہور ہونے کی خواہش ہے۔

۱. قرآن کہتا ہے کہ حتی بعض بت پرست عزت و احترام حاصل کرنے کے ارادہ سے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ﴿وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللّٰهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُم عِزّاً﴾ سورۂ مریم، آیت: ۸۱۔ اور ان لوگوں نے خدا کے علاوہ دوسرے معبود انتخاب کر لئے ہیں تا کہ ان کی عزت کا سبب ہوں۔

﴿ يَوَدُّ أَحَدُهُم لَو يُعَمَّرُ أَلفَ سَنَةٍ ﴾[1]

ہر شخص چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار برس کی زندگی دی جاتی۔

ہزار کثرت کی علامت ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک ہزار ایک سال نہیں چاہتا ہے یہ خواہش تمام انسانوں میں ہے حتی ہمارے جد، حضرت آدمؑ میں بھی موجود تھی اسی خواہش کی بنا پر شیطان نے ان کو دھوکہ دیا ہے:

﴿ هَل أَدُلُّکَ عَلیٰ شَجَرَةِ الخُلدِ وَمُلکٍ لا یَبلیٰ ﴾[2]

کیا میں تمہیں ہمیشگی کا درخت اور وہ سلطنت جو کبھی زائل نہ ہو بتادوں۔

یہ آیت بھی بقا اور مقام ومنزلت کی خواہش کے طرف اشارہ کرتی ہے اور اس نکتہ کو بھی بیان کر رہی ہے کہ انسان میں یہ خواہش فطری ہے اس کو منفی عنصر نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ معرفت میں موجود نقص کو برطرف کرنا چاہیئے اور متوجہ رہیں کہ دنیا بقا کے قابل نہیں ہے اور ابدی حکومت خدا کے پاس ہے۔انسان کو دنیا کے بجائے آخرت سے لو لگانی چاہیئے:

﴿ وَالآخِرَةُ خَیرٌ وَأَبقیٰ ﴾[3]

اور آخرت کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔

آخر کار تمام خواہشات پر آخری خواہش برتر ہے خصوصاً انسان کا عمیق و وسیع وجود قرب خدا کے لئے اور اسی کی طرف موجزن ہے، افسوس! کہ جس سے اکثر ماہر نفسیات ناواقف ہیں۔یہ خواہش احساسات و جذبات کی طرح نہیں ہے بلکہ ان دونوں سے بہت زیادہ لطیف اور پوشیدہ ہے، چونکہ انسان کا آخری کمال اسی سے وابستہ ہے لہٰذا اس کو جاری رکھنا بھی خود انسان کے ہاتھ میں ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت:۹۶۔ [2] سورۂ طہ، آیت:۱۲۰۔ [3] سورۂ اعلیٰ، آیت:۱۷۔

چاہتیں اور فطری خواہشات، خود بخود سرگرم ہوتی ہیں مثال کے طور پر خلقت کے وقت ہی سے بچہ کے اندر بھوک کا احساس ہوتا ہے نیز جنسی خواہشات بالغ ہونے کے وقت سرگرم ہوتی ہیں اور انسان اس کو پورا کرنے کے راستہ بھی تعیین کرتا ہے۔ لیکن معنوی کمالات اولاً خود بخود سرگرم نہیں ہوتے ان کو سرگرم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے موضوع اور اس کے متعلق امور کو پہچاننے کے بعد اختیاری انداز میں اس کو انجام دیتا ہے یعنی جب کوئی خواہش انسان کے اندر سرگرم ہو تو دھیرے دھیرے قدم بڑھانا چاہیئے تا کہ آخری مراحل سے نزدیک ہوسکیں، اس سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی داستان سے مربوط آیتیں رہنمائی کرتی ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کے ڈوبنے کے بعد فرمایا:

﴿لاأُحِبُّ الأفِلِينَ﴾[1]

غروب ہونے والی چیز کو میں پسند نہیں کرتا۔

یعنی تمام انسان غروب نہ کرنے والے وجود کی طرف راغب ہو جاتے ہیں خواہش اور عبادت کی رغبت کو ایسی چیز سے مرتبط ہونا چاہیئے جو ہمیشہ موجود ہو ایسا محبوب ہو جو ہمیشہ اس کے پاس رہ سکتا ہو اور وہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ خداوند عالم سے محبت کے لئے جو چیز خدا سے مربوط ہے (منجملہ ایمان) انسان کے لئے بھی محبوب ہو جانا چاہیئے:

﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيكُمُ الإِيمَانَ﴾[2]

لیکن خدا نے تمھیں ایمان کی محبت دی ہے۔

خداوند عالم پر ایمان کی وجہ سے انسان محبوب ہوتا ہے اور یہ قرب الٰہی کے لئے ایک راہ ہے اور اس راہ میں اس وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب انسان اپنی زندگی میں خدا اور اس کی رضا کے علاوہ کوئی اور خواہش نہ رکھتا ہو:

---

[1] سورۂ انعام، آیت:۷۶۔ [2] سورۂ حجرات، آیت:۷

﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ﴾[1]

کوئی بھی نعمت خدا کی بارگاہ میں جزا کے لئے حقدار نہیں ہے) مگر یہ کہ صرف اپنے عظیم الشان پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انجام دیا ہو۔

خواہشات کے انتخاب کا معیار

یہاں یہ سوال درپیش ہے کہ مادی خواہشات پر بڑی خواہشات کی ترجیح کے لئے قرآن مجید کا کیا معیار ہے؟ ایک آسان جائزے کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک خواہش کی دوسری خواہش پر ترجیح کے لئے انسان کے پاس حقیقی معیار، لذت ہے۔ انسان ذاتاً یوں خلق ہوا ہے کہ اس چیز کی جستجو میں رہے جو اس کی فطرت کے لئے مناسب اور لذیذ ہو اور رنج والم کا باعث بننے والی چیز سے گریزاں ہو۔ اور وہ فوائد جو بعض نظریات میں خواہشات کے معیار انتخاب کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں وہ ایک اعتبار سے لذت کی طرف مائل ہیں۔

اب یہ سوال درپیش ہے کہ اگر دو لذت بخش خواہشوں کے درمیان ٹکراؤ واقع ہو تو ہم کس کو ترجیح دیں اور کس کا انتخاب کریں؟ جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں میں سے جس میں زیادہ لذت ہو یا جو زیادہ دوام رکھتی ہو یا زیادہ کمال آفریں ہو اسی کو مقدم کیا جائے گا۔ لہٰذا کثیر پائیدار یا زیادہ کمال کا جو باعث ہو، اسے انتخاب کا معیار قرار دیا جائے گا۔

بعض خواہشات کی فراہمی بہت زیادہ لذت بخش ہے لیکن کمال آفریں نہیں ہے بلکہ کبھی تو نقص کا باعث ہوتی ہے یا دوسری خواہشات کی بہ نسبت اس میں بہت کم لذت ہوتی ہے اور بہت کم کمال کا سبب بنتی ہے ایسی حالت میں انتخاب کے لئے ایجاد کمال بھی مدنظر ہونا چاہیئے۔ بہت زیادہ لذت، با دوام اور ایجاد کمال کو مدنظر قرار دینے سے انسان مزید سوالات سے دوچار ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر دو خواہشیں موقع یا بہت زیادہ لذت کے اعتبار سے برابر ہوں تو کسے مقدم

---

[1] سورۂ لیل، آیت ۲۰۔

کیا جائے؟ اگر ایک مدت کے اعتبار سے اور دوسری بہت زیادہ لذت کے اعتبار سے برتری رکھتی ہو تو ایسی حالت میں کسے انتخاب کیا جائے؟ آیا جسمانی اور مادی لذتیں بھی برابر ہیں؟ اور کون سی جسمانی لذت کس نفسیاتی لذت پر برتری رکھتی ہے؟ آپ نے مشاہدہ کیا کہ یہ تینوں معیار، مقام عمل و نظر دونوں میں مشکلات سے روبرو ہیں اور گذشتہ دلیلوں کے اعتبار سے تمام انسانوں کے لئے بعض خواہشات کو بعض پر مقدم کرنا اور انتخاب کے سلسلہ میں صحیح قضاوت کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایک بار پھر یہاں مسئلہ معرفت کی اہمیت اور مبدا و معاد کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔ گذشتہ مشکلات کو حل کرنے کے لئے انسان کی حقیقت اور دوام و پائیداری کی مقدار نیز اس کمال کے ساتھ رابطہ اور حد کو جسے حاصل کرنا چاہتا ہے، معلوم ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ کیا انسان موت سے نابود ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی اسی دنیاوی زندگی سے مخصوص ہے یا کوئی دائمی زندگی بھی ہے۔ اس کے بعد یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کون سے کمالات انسان حاصل کر سکتا ہے اور بالخصوص آخری کمال کیا ہے؟ اگر یہ دو مسئلے حل ہو جائیں اور انسان اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ موت سے نابود نہیں ہوتا ہے اور اس کی ایک دائمی زندگی ہے نیز اس کا حقیقی کمال قرب الٰہی ہے اور اس کے لئے کوئی حد نہیں ہے تو معیار انتخاب واضح ہو جائے گا۔ جو چیز انسان کو اس دائمی کمال تک پہنچائے اسے فوقیت دیتے ہوئے اسی کے مطابق عمل انجام دیا جائے یہی عام معیار ہے لیکن رہی یہ بات کہ کون سی خواہش کن شرائط کے ساتھ اس کردار کو انجام دے گی اور کون سی حرکت ہمیں اس دائمی اور بے انتہا کمال سے نزدیک یا دور کرتی ہے، ہمیں اس راہ کو وحی کے ذریعہ دریافت کرنا ہوگا اس لئے کہ وحی کی معرفت وہ ہے جو اس سلسلہ میں اساسی اور بنیادی کردار ادا کرے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے مسئلہ مبدأ و معاد کو حل کرنا چاہیئے اور اس کے بعد وحی و نبوت کو بیان کرنا چاہیئے تا کہ حکیمانہ اور معقول انتخاب واضح ہو جائے۔ اس نقطۂ نظر میں انتخاب کو سب سے زیادہ اور پائیدار لذت اور سب سے زیادہ ایجاد کمال کے معیاروں کی مدد سے انجام دیا جا سکتا ہے انسان کی

پوری زندگی کے مشخص و معین نہ ہونے اور اس کمال کی مقدار جسے حاصل کرنا چاہتا ہے اور سب سے بہتر خواہش کی تشخیص میں اس کی معرفت کے اسباب کی نارسائی کی بنا پر مذکورہ مشکلات جنم لیتی ہیں اور یہ تمام چیزیں اس (وحی کے) دائرہ میں حل ہوسکتی ہیں۔

آخرت کی لذتوں کی خصوصیات

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ قرآن کی روشنی میں دنیاوی لذتوں کے علاوہ اخروی لذتوں کے موارد ذکر ہیں۔ اور انسان کو لذتوں کے انتخاب میں انہیں بھی مورد توجہ قرار دینا چاہیئے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لذت بخش اور سب سے زیادہ پائیدار اور جو ایجاد کمال کا باعث ہو اسے انتخاب کرنا چاہیئے اسی بنا پر قرآن مجید نے آیات (نشانیوں) کے بیان کرنے کا مقصد دنیا و آخرت کے بارے میں تفکر اور دونوں کے درمیان موازنہ بتایا ہے:

﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الآیَاتِ لَعَلَّکُم تَتَفَکَّرُونَ فِی الدُّنیَا وَ الآخِرَةِ﴾

یوں خداوند عالم نے اپنے احکامات تم سے صاف صاف بیان دیئے ہیں تا کہ تم دنیا و آخرت کے بارے میں غور و فکر کرو۔[1]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اخروی کمالات اور لذتوں کو بیان کرنے والی آیات کی تحقیق و تحلیل ہمیں یہ نتیجہ عطا کرتی ہے کہ یہ لذتیں اور کمالات، دنیاوی لذتوں کے مقابلہ میں زیادہ پائیداری، برتری اور خلوص کی حامل ہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اپنی زندگی میں ایسی خواہشوں کا انتخاب کرے جو اخروی لذت و کمال کو پورا کرسکتی ہوں۔ ان آیتوں میں چار خصوصیات اور اخروی کمالات اور لذتوں کی برتری کے بارے میں مندرجہ ذیل انداز میں گفتگو ہوئی ہے:

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۹۔

۱۔ پائیداری ودوام

قرآن کی نظر میں دنیاوی زندگی ناپائیدار ومحدود ہے اور اخروی زندگی دائمی اور زمانے کی محدودیت سے عاری ہے۔

﴿بَل تُؤثِرُونَ الحَیاۃَ الدُّنیا وَ الآخِرَۃُ خَیرٌ وَ أبقَیٰ﴾[۱]

مگر تم لوگ دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔

﴿مَا عِندَکُم یَنفَدُ وَ مَا عِندَ اللّٰہِ بَاقٍ﴾[۲]

جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

۲۔ اخلاص اور رنج والم سے نجات

دنیاوی زندگی میں نعمتیں اور خوشی، رنج وغم سے مخلوط ہیں لیکن اخروی زندگی سے خالص خوشی اور حقیقی نعمت حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید بہشتیوں کی زبان میں فرماتا ہے۔

﴿الَّذی احَلَّنَا دَارَ المُقَامَۃِ مِن فَضلِہِ لا یَمَسُّنَا فِیھَا نَصَبٌ وَلا یَمَسُّنَا فِیھَا لُغُوبٌ﴾[۳]

جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشگی کے گھر میں اتارا جہاں ہمیں نہ تو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی کوئی تھکن آئے گی۔

۳۔ وسعت وفراوانی

اخروی نعمتیں، دنیاوی نعمتوں کے مقابلہ میں جو کم وکیف کے اعتبار سے محدود اور بہت کم ہیں، بہت زیادہ اور فراوان ہیں قرآن مجید فرماتا ہے۔

---

[۱] سورۂ اعلیٰ، آیت: ۱۶ و ۱۷۔

[۲] سورۂ نحل، آیت: ۹۶۔

[۳] سورۂ فاطر، آیت: ۳۵۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُم وَجَنَّةٍ عَرضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الأرضُ﴾

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کی طرف دوڑ پڑو جس کی وسعت سارے آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔[1]

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَفِيهَا مَا تَشتَهِيهِ الأنفُسُ وَتَلَذُّ الأعيُنُ﴾[2]

اور وہاں (بہشت میں) جس چیز کا جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں (موجود ہیں)۔

۴۔ مخصوص کمالات اور لذتیں

اخروی دنیا میں ان نعمتوں کے علاوہ جو دنیاوی نعمتوں کے مشابہ ہیں مخصوص نعمتیں بھی ہیں جو دنیا کی نعمتوں سے بہت بہتر اور عمدہ ہیں قرآن مجید دنیاوی نعمتوں سے مشابہ نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَرِضوَانٌ مِنَ اللهِ أَكبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الفَوزُ العَظِيمُ﴾[3]

اور خدا کی خوشنودی ان سب سے بالاتر ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

ایک روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''فيعطهم اللّٰه مالا عينٌ رأت ولا أُذن سمعت و لم يخطر علىٰ قلب بشر''[4]

---

[1] سورۂ آل عمران، ۱۳۳۔

[2] سورۂ زخرف، آیت: ۷۱۔

[3] سورۂ توبہ، آیت: ۷۲۔

[4] نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسایل ج: ۶، ص: ۶۳۔

خداوند عالم انہیں (اپنے صالح بندوں) ایسی نعمتیں عطا کرے گا جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ ہی کسی قلب نے محسوس کیا ہوگا۔ مذکورہ خصوصیات پر توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید صرف اخروی زندگی کو زندگی سمجھتا ہے اور دنیا کی زندگی کو مقدمہ اور اس کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے اور جب دنیاوی زندگی اخروی زندگی کے حصول کا ذریعہ نہ ہو تو اسے کھیل بے خبری وغفلت کی علت، فخر کا ذریعہ نیز ظاہری آرائش اور جاہلانہ عمل شمار کرتا ہے اوراس کی فکر و جستجو میں ہونا اور اس کو پورا کرنے والی خواہشوں کو انتخاب کرنا ایک غیر عقلی فعل کہا ہے اور ایسی زندگی کو حیوانات کی زندگی اور انسان کے حیوانی پہلو کو پورا کرنا بتایا ہے۔

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنيَا إِلا لَهوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الآخِرَةَ لَهِيَ الحَيَوَانُ لَو كَانُوا يَعلَمُونَ﴾[1]

اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشا کے سوا کچھ نہیں اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ابدی زندگی تو بس آخرت کا گھر ہے۔

قدرت

اختیار میں تیسرا بنیادی عنصر قدرت ہے جو اس سلسلہ میں امکانات واسباب کا کردار ادا کرتا ہے۔ انسان جن خواہشات کو اپنے لئے حقیقی کمال کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس کے مقدمۂ حصول کو تشخیص دیتا ہے انہیں معارف کی روشنی میں حاصل کرنا چاہئے اور وہ امور جو اس کو اُس مکمل کمال کے حصول سے روکتے ہیں یا دور کرتے ہیں اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ قدرت اندرونی اعمال پر محیط ہے جیسے نیت، ایمان لانا، رضایت، غصہ، محبت دشمنی، قصد اور بیرونی ارادہ خارجی عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور قرآن کی نظر میں انسان ان تمام مراحل میں قدرت کو نافذ کرنے کے لئے

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیت: ۶۴

ضروری امکانات سے استوار ہے۔ قدرت کے مختلف اقسام ہیں کہ جسے ایک نظریہ کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف: قدرت طبعی: یعنی طبیعت سے استفادہ کرتے ہوئے چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان ہو اپنے مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔

ب۔ قدرت علمی: یعنی وہ قدرت جو ٹکنیکل آلات سے استفادہ کر کے اپنے اہداف کو حاصل کرلے اور اپنے مورد نظر امور کو انجام دے۔

ج۔ قدرت اجتماعی: ہماہنگی و تعاون کے ذریعہ یا طاقت و قبضہ اور اجتماعی مرکز کے حصول، جائز یا ناجائز طریقہ سے اپنے جیسے افراد کو ہی اپنے فائدہ کے لئے اپنی خدمت میں استعمال کرتا ہے اور ان کی توانائی سے استفادہ کر کے اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

د۔ قدرت غیر طبیعی: اپنی روحی قدرت سے استفادہ یا غیبی امداد اور الٰہی عنایت انسانوں کی جاندار بے جان طبیعت میں تصرف کر کے یا جن و شیاطین کی مدد سے جس چیز کو چاہتا ہے حاصل کرلیتا ہے۔

اختیار کی اصل و بنیاد کے عنوان سے جو باتیں قدرت کی وضاحت میں گذر چکی ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدرت کو جسمانی توانائی، اعضاء و جوارح کی سلامتی اور امور کی انجام دہی میں بیرونی شرائط کے فراہم ہونے سے مخصوص نہیں کرنا چاہیئے بلکہ توجہ ہونا چاہیئے کہ ان کے نہ ہونے کی صورت میں بھی اندورنی اختیاری عمل کا امکان موجود رہتا ہے جیسے محبت کرنا، دشمنی کرنا، نیت کرنا کسی کام کے انجا کا ارادہ کرنا یا کسی شخص کے عمل سے راضی ہونا وغیرہ۔ البتہ انسان اندورنی اعمال کے ذریعہ خود کو خدا سے نزدیک کرسکتا ہے اور اختیاری اصول مثال کے طور پر معرفت، خواہشات اور مذکورہ اندرونی امور کا ارادہ خصوصاً جو چیزیں حقیقی عمل کو ترتیب دیتی ہیں یعنی نیت، ان شرائط میں بھی فراہم ہیں اور جس قدر نیت خالص ہوگی اعتبار اور اس کے قرب کا اندازہ بھی زیادہ ہوگا لہٰذا

انسان اعمال ظاہری کے انجام پر بھی مامور ہے اور باطنی امور کے انجام کا بھی ذمہ دار ہے البتہ اگر کوئی ظاہری عمل انجام دے سکتا ہے تو اس کے لئے صرف باطنی عمل کی نیت کافی نہیں ہے اسی بنا پر ایمان و عمل صالح ہمیشہ باہم ذکر ہوئے ہیں اور دل کے صاف ہونے کا فائدہ ظاہری اعمال میں ہوتا ہے اگر چہ اعمال ظاہری سے ناتوانی اس کے اعمال کے سقوط میں، باطنی رضایت کا نہ تو سبب ہے اور نہ ہی باطنی رفتار سے اختلاف، ظاہری عمل میں اعلان رضایت کے لئے کافی ہے مگر یہ کہ انسان عمل ظاہری کے انجام سے معذور ہو۔

خلاصۂ فصل

۱۔اختیاری امور کوانجام دینے کے لئے ہم تین عناصر (معرفت، انتخاب اور قدرت) کے محتاج ہیں۔

۲۔اچھے اور برے کا علم، حقیقی کمال کی شناخت اور معرفت نیزاس کی راہ حصول کے بارے میں اطلاع اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم مبدا، معاد اور دنیاوآخرت کے رابطہ کو پہچانیں۔

۳۔قرآن مجید اگر چہ آنکھ اور کان (حواس) اور قلب (عقل و دل) کو معرفت اور سعادت کے حصول میں معتبر مانتا ہے لیکن یہ اسباب محدود ہونے کے ساتھ ساتھ امکان خطا سے لبریز نیز تربیت وارتقاء کے محتاج ہیں۔اس لئے ایک دوسرے مرکز کی ضرورت ہے تا کہ ضروری مسائل میں صحیح و تفصیلی معرفت کے ذریعہ انسان کی مدد کر سکے۔اور وہ منبع و مرکز، وحی الٰہی ہے جو ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔

۴۔خواہش یا ارادہ، اختیار وقصد کے لئے ایک دوسرا ضروری عنصر ہے البتہ یہ کوئی ایسا ارادے والا فعل نہیں ہے جس میں خواہش اور چاہت کا کردار نہ ہو حالانکہ بعض لوگوں نے ارادہ کو شدید خواہش یا مزید شوق کہا ہے۔

۵۔بہت سی جگہوں میں جہاں چند ناہماہنگ خواہشیں باہم ہوتی ہیں اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ کسی ایک کو ترجیح دے تو اس سلسلہ میں قرآن مجید کی سفارش یہ ہے کہ انسان اپنے کمال کو مدنظر قرار دے اور اس کو معیار انتخاب سمجھے۔

۶۔قرآن مجید ایسے بلند وبالا خواہشات کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس میں شخصیت و منزلت کی خواہش اور ایک معبود کی عبادت صرف خداوند عالم کی عبادت کے سایہ میں پوری ہو سکتی ہے۔

۷۔قرآن مجید اعلی خواہشوں کوایجاد کمال، پائدار اور زیادہ لذت بخش ہونے کے معیار پر ترجیح دیتا ہے اور اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ یہ مذکورہ امور صرف آخرت میں حاصل ہونگے جن کی نعمتیں پائدار، حقیقی، رنج وغم سے عاری اور با کمال ہیں۔

۸۔قدرت، مقدمات اختیار کے ایک مقدمہ کے عنوان سے کسی بھی عمل کے لئے درکار ہے۔مثلاً شناخت اور معرفت کے لئے انتخاب اور ارادے کی قدرت۔البتہ قرآن کی نظر میں ان تمام موارد کے لئے انسان ضروری قدرت سے آراستہ ہے۔

تمرین

۱۔اصول اختیار کی تین قسمیں ہیں جو اختیاری امور میں ایک ہی طرح کا کردار ادا کرتی ہیں یا بعض کا کردار دوسرے سے زیادہ ہے، اس اختلاف کا کیا سبب ہے؟

۲۔مقتضائے معرفت کے لئے کون سے امور معرفت سے انحراف کا سبب ہیں اور کس طرح یہ عمل انجام دیتے ہیں؟

۳۔معرفت کے اہم کردار کی روشنی میں انسان کے حقیقی کمال کے حصول کے لئے قرآن مجید میں ہر چیز سے زیادہ کیوں ایمان وعمل صالح کی تاکید ہوئی ہے؟

۴۔ایمان وتقوئی سے معرفت کا کیا رابطہ ہے؟

۵۔ایمان، عقل وانتخاب اور کردار کے مقولوں میں سے کون سا مقولہ ہے؟

۶۔اگر خواہشات کا انتخاب انسان کی عقل کے مطابق سب سے زیادہ پائدار، حقیقی لذت اور سب سے زیادہ ایجاد کمال کی بنیاد پر ہو تو کیا یہ معیار غیر دینی ہوگا؟ کیوں اور کیسے؟

۷۔اگر ایمان کے حصول اور قرب الٰہی میں معرفت کا اہم رول ہے تو میدان عمل میں کیوں بعض مفکرین بالکل ہی خدا اور معاد کے منکر ہیں یا اس کے مطابق عمل نہیں کرتے ہیں؟ اور کیوں علم بشر کی ترقی دینداری اور ایمان کی وسعت سے بلا واسطہ تعلق نہیں رکھتی ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۱۔ شناخت کے تمام گوشوں کے اعتبار سے انسان کی سعادت کے لئے ملاحظہ ہو:

— جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۵) تفسیر موضوعی قرآن کریم، تہران: رجاء ۱۳۶۵، ج ۴، ص ۹۳۔۱۱۱۔

— جوادی آملی، عبد اللہ (۱۳۷۰) شناخت شناسی در قرآن، تنظیم و پیش کش، حمید پارسانیا، قم: مرکز مدیریت حوزہ علمیہ قم۔

— محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (راہ وراہنما شناسی) قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

۲۔ قرآن کی نظر میں انسان کی مختلف خواہشات کے بارے میں ملاحظہ ہو:

— جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۸) تفسیر موضوعی قرآن، ج ۱۲ (فطرت در قرآن) قم: اسراء۔

— جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی قرآن، ج ۵، تہران: رجاء۔

— شیروانی، علی (۱۳۷۶) سرشت انسان پژوہشی در خداشناسی فطری، قم: نہاد نمایندگی مقام معظم رہبری در دانشگاہہا (معاونت امور اساتید و دروس معارف اسلامی)۔

— محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) اخلاق در قرآن، قم: موسسہ اموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

— ....— محمد تقی مصباح (۱۳۷۷) خودشناسی برای خودسازی، قم: موسسہ اموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ۔

— نجاتی، محمد عثمان (۱۳۷۲) قرآن و روان شناسی، ترجمہ عباس عرب، مشہد: بنیاد پژوہشہای آستانہ قدس۔

۹

آخری کمال

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔(کمال) کا معنی ذکر کرتے ہوئے اس کی تشریح کریں؟

۲۔انسان کے آخری کمال سے مراد کیا ہے؟ وضاحت کریں؟

۳۔قرب الٰہی کے حصول کی راہ کو آیات قرآن سے استدلال کرتے ہوئے بیان کریں؟

۴۔ایمان اور مقام قرب کے رابطے کی وضاحت کریں؟

کمال پسندی اور سعادت پسندی ہر انسان کی ذاتی وفطری خواہشات میں سے ہے اور انسان کی پوری کوشش اسی خواہش کو پورا کرنا اور نقائص کو دور کرنا ہے۔ البتہ یہ بات کہ کمال کی خواہش اور سعادت طلب کرنا خود ایک حقیقی اور مستقل رغبت وخواہش ہے، یا ایک فرعی خواہش ہے جو دوسری خواہشوں کا نتیجہ ہے جیسے خود پسندی وغیرہ میں یہ مسئلہ اتفاقی نہیں ہے اگرچہ نظریہ کمال کو مستقل اور حقیقی سمجھنا ہی اکثر لوگوں کا نظریہ ہے۔

انسان کی سعادت وکمال کی خواہش میں ایک اہم اور سرنوشت ساز مسئلہ، کمال اور سعادت کے مراد کو واضح کرنا ہے جو مختلف فلسفی ودینی نظریوں کی بنیاد پر متفاوت اور مختلف ہے۔ اسی طرح کمال وسعادت کے حقیقی مصداق کو معین کرنا اور ان کی خصوصیات نیز کیفیت اور اس کے حصول کا طریقہ کار ان امور میں سے ہے جن کے بارے میں بہت زیادہ تحقیق وتحلیل اور بحث ہو چکی ہے اور مزید ہوگی۔ ظاہر ہے کہ مادی مکاتب جو معنوی اور غیر فطری امور کے منکر ہیں، ان تمام مسائل میں دنیاوی پہلو اختیار کرتے ہیں اور کمال وسعادت کے معنی ومفہوم اور ان دونوں کا حقیقی مصداق اور اس کی راہ حصول کو مادی امور ہی میں منحصر جانتے ہیں لیکن غیر مادی مکاتب خصوصاً الٰہی مکاتب فکر، مادی ودنیاوی اعتبار سے بلند اور وسیع وعریض نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اس فصل میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ قرآنی نظریہ کے مطابق مذکورہ مسائل کا جواب تلاش کریں۔

مفہوم کمال اور انسانی معیار کمال

دنیا کی باحیات مخلوق جن سے ہمارا سروکار ہے، ان میں سے نباتات نیز حیوان وانسان گوناگوں صلاحیتوں کے حامل ہیں، جن کے لئے مناسب اسباب وعلل کا رفراہم ہونا ظاہر وآشکار اور پوشیدہ توانائیوں کے سرگرم ہونے کا سبب ہیں۔ اور ان صلاحیتوں کے سرگرم ہونے سے ایسی چیزیں معرض وجود میں آتی ہیں جو اس سے قبل حاصل نہیں تھیں۔ اس طرح تمام باحیات مخلوق میں اندرونی قابلیتوں کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کے لئے طبیعی تلاش جاری ہے۔ البتہ یہ فرق ہے کہ نباتات موجودات کے ان طبیعی قوانین کے اصولوں کے پابند ہیں، جو ان کے وجود میں ڈال دی گئی ہیں۔ جانوروں کی سعی وکوشش حب ذات جیسے عوامل پر مبنی ہے جو فطری الہام وفہم کے اعتبار سے اپنے امور انجام دیتے ہیں لیکن انسان کی جستجو اختیار وعلم کی روشنی میں ہوتی ہے۔

اس وضاحت کے مطابق جو اختیار اور اس کے اصول کی بحث میں گذر چکا ہے۔ اس کے مکمل کمال کا مقصد دوسری مخلوق سے بالکل علیحدہ اور جدا ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ''کمال'' ایک وجودی صفت ہے جو ایک وجود کا دوسرے وجود کے مقابلہ میں حقیقی توانائی وقوت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کامل وجود اگر فہم و شعور کی نعمت سے مالا مال ہو تو کمال سے مزین ہونے کی وجہ سے لذت محسوس کرتا ہے۔ گذشتہ مفہوم کی بنیاد پر کمال اگر طبیعی اور غیر اختیاری طور پر حاصل ہو جائے جیسے انسان کی حیوانی توانائی کا سرگرم ہونا (جیسے جنسی خواہش) تو اسے غیر اکتسابی وغیر طبیعی کمال کہا جاتا ہے اور اگر دانستہ اور اختیاری تلاش کی روشنی میں حاصل ہو تو کمال اکتسابی کہا جاتا ہے۔ پس جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہر موجود کا کمال منجملہ انسان کا کمال ایک قسم کی تمام قابلیت کا ظاہر اور آشکار ہونا ہے تو بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کا حقیقی کمال کیا ہے اور کون سی قابلیت کا ظاہر ہونا انسانی کمال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ بیشک

انسان کی قابلیتوں اور خواہشوں کے درمیان حیوانی اور مادی خواہشوں کے ظاہر ہونے کو انسانی کمالات میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ یہ خواہشیں انسان اور حیوان کے درمیان مشترک ہیں اور حیوانی پہلو سے ان قابلیتوں کے سرگرم ہونے کا مطلب انسان کا ارتقا پانا ہے۔

ایسے مرحلہ میں انسان کی انسانیت ابھی بالقوہ ہے اور اس کی حیوانیت بالفعل ہو چکی ہے اور یہ محدود، ناپائیدار اور سریع ختم ہونے والی صلاحیتیں انسان کی واقعی حقیقت یعنی نا قابل فنا روح، اور ہمیشہ باقی رہنے والی لامحدود خواہش سے سازگار نہیں ہے۔ انسان کی انسانیت اس وقت بالفعل ہوگی جب اس نا قابل فنا روح کی قابلیت سرگرم ہو اور کمال و سعادت اور ختم نہ ہونے والی خالص اور نا قابل فنا لذت بغیر مزاحمت و محدودیت کے حاصل ہو۔

انسان کا مکمل کمال

انسانی کمال و ارتقا اس کی عام خصوصیات کے واضح ہونے کے بعد یہ بنیادی سوال درپیش ہوتا ہے کہ انسانی کمال کا نقطۂ عروج اور مقصد حقیقی جسے ہر انسان اپنی فطرت کے مطابق حاصل کرنا چاہتا ہے اور اپنی تمام سرگرمیاں جن کے حصول کے لئے انجام دیتا ہے وہ کیا ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسان کا آخری کمال کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے وقت اس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ حوادث زندگی میں انسان کی طرف سے جن مقاصد کی جستجو ہوئی ہے وہ ایک جیسے مساوی اور برابر نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض اہداف، ابتدائی اہداف ہیں جو بلند و بالا اہداف کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور بعض مکمل اور حقیقی اہداف شمار ہوتے ہیں اور بعض درمیانی ہیں جو مقدماتی اور مکمل اہداف کے درمیان حد وسط کے طور پر واقع ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ تین طرح کے اہداف ایک دوسرے کے درمیان واقع ہیں۔ انسان کے مکمل کمال و ہدف سے مراد وہ نکتہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی کمال، انسان کے

لئے متصور نہیں ہے اور انسان کی ترقی کا وہ آخری زینہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ کوشش جاری ہے۔ قرآن مجید نے اس نقطۂ عروج کو فوز (کامیابی) فلاح (نجات) اور سعادت (خوشبختی) جیسے ناموں سے یاد کیا ہے اور فرماتا ہے:

﴿وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَد فَازَ فَوزاً عَظِيماً﴾ [1]

اور جس شخص نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ تو اپنی مراد کو بہت اچھی طرح پہنچ گیا۔

﴿أُولٰئِکَ عَلیٰ هُدًی مِن رَّبِّهِم وَ أُولٰئِکَ هُمُ المُفلِحُونَ﴾ [2]

یہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ اپنی دلی مرادیں پائیں گے۔

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا﴾ [3]

اور جو لوگ نیک بخت ہیں وہ تو بہشت میں ہوں گے۔

قرآن مذکورہ مفاہیم کے نقطۂ مقابل کو ناکامی: ﴿إِنَّهُ لا يُفلِحُ الظَّالِمُونَ﴾ [4] (اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے) ناامیدی اور محرومی: ﴿وَ قَد خَابَ مَن دَسَّيهَا﴾ (اور یقیناً جس نے اسے بنا دیا وہ نامراد رہا) شقاوت اور بدبختی سے تعبیر کرتا ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُم فِيهَا زَفِيرٌ وَ شَهِيقٌ﴾ [5] تو جو لوگ بد بخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اور اسی میں ان کی ہائے وائے اور چیخ پکار ہوگی۔

---

[1] سورۂ احزاب، آیت: ۷۱۔

[2] سورۂ بقرہ، آیت: ۵۔

[3] سورۂ ہود، آیت: ۱۰۸۔

[4] سورۂ قصص، آیت: ۳۷۔

[5] سورۂ ہود، آیت: ۱۰۶۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی توانائیوں میں سے ہر ایک کو کمال اور فعلیت کے مرحلہ میں پہنچنے کے لئے صرف اتنی ہی مقدار معتبر ہے جس میں ایجاد کمال نیز دائمی اور لازوال کمال کے وقوع پذیر ہونے کے اسباب فراہم کر سکیں اور مکمل کمال کے حصول کا مقدمہ بن سکیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کا رشد و کمال ایک مقدمہ ہے اور اگر مقدماتی پہلو کا فقدان ہو جائے تو انسان اپنی مطلوبیت اور اعتبار کو کھو دیتا ہے۔

قرب الٰہی

اہم گفتگو یہ ہے کہ اس مکمل کمال کا مقام و مصداق کیا ہے؟ قرآن کریم اس مکمل کمال کے مصداق کو قرب الٰہی بیان کرتا ہے جس کے حصول کے لئے جسمانی اور بعض نفسانی کمالات صرف ایک مقدمہ ہیں اور انسان کی انسانیت اسی کے حصول پر مبنی ہے اور سب سے اعلیٰ، خالص وسیع اور پائیدار لذت، مقام قرب پانے سے حاصل ہوتی ہے۔ قرب خدا کا عروج وہ مقام ہے جس سے انسان کی خدا کی طرف رسائی ہوتی ہے اور وہ رحمت الٰہی سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ اور زبان خدا کے حکم سے خدائی کام انجام دیتے ہیں۔ جملہ آیات جو مذکورہ حقیقت پر دلالت کرتی ہیں درجہ ذیل ہیں:

۱۔ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ۔

بے شک پرہیزگار لوگ باغوں اور نہروں میں پسندیدہ مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے بادشاہوں میں ہوں گے۔[۱]

۲۔ ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً﴾[۲]

---

[۱] سورۂ قمر، آیت: ۵۴، ۵۵۔ [۲] سورۂ نساء، آیت: ۱۷۶۔

پس جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور اسی سے متمسک رہے تو خدا بھی انہیں عنقریب ہی اپنی رحمت و فضل کے بے خزاں باغ میں پہنچا دے گا اور انہیں اپنی حضوری کا سیدھا راستہ دکھا دے گا۔

اس حقیقت کو بیان کرنے والی روایات میں سے جملہ حدیث قدسی بھی ہے۔

"ما تقرب إلیّ عبد بشیّء أحبّ إلیّ ممّا إفترضت علیه و أنّه لیتقرب إلی بالنافلة حتیٰ أحبه فإذا أحببته کنت مسعه الذی یسمع به و بصره الذی یبصر به و لسانه الذی ینطق به و یده التی یبطش بها"[1]

کوئی بندہ واجبات سے زیادہ محبوب شئی کے ذریعہ مجھ سے نزدیک نہیں ہوتا ہے۔ بندہ ہمیشہ (درجہ بہ درجہ) مستحب کاموں سے (واجبات کے علاوہ) مجھ سے نزدیک ہوتا ہے حتی کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں اور جب وہ مرا محبوب ہو جاتا ہے تو اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ گفتگو کرتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ اپنے امور کا دفاع کرتا ہے۔

قربت کی حقیقت

اگر چہ مقام تقرب کی صحیح اور حقیقی تصویر اور اس کی حقیقت کا دریافت کرنا اس مرحلہ تک پہنچنے کے بغیر میسر نہیں ہے لیکن غلط مفاہیم کی نفی سے اس کو چاہے ناقص ہی سہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کسی موجود سے نزدیک ہونا کبھی مکان کے اعتبار سے اور کبھی موقوع کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ قرب الٰہی اس مقولہ سے نہیں ہے اس لئے کہ زمان و مکان مادی مخلوقات سے مخصوص ہیں اور خداوند عالم زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ اسی طرح صرف اعتباری اور فرضی تقرب بھی مدنظر ہیں۔ ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس طرح کا قرب بھی اسی جہاں سے مخصوص

---

[1] کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی: ج ۲، ص ۳۵۲۔

ہے اور اس کی حقیقت صرف اعتبار کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اگر چہ اس پر ظاہری آثار مترتب ہوتے ہیں۔ کبھی قرب سے مراد دنیاوی موجودات کی وابستگی ہے منجملہ انسان خداوند عالم سے وابستہ ہے اور اس کی بارگاہ میں تمام موجودات ہمیشہ حاضر ہیں جیسا کہ روایات وآیات میں مذکور ہے:

﴿وَنحنُ أَقرَبُ إِلَيهِ مِن حَبلِ الوَرِيدِ﴾[1]

اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

قرب کا یہ معنی بھی انسان کے لئے مکمل کمال کے عنوان سے ملحوظ نظر نہیں ہے اس لئے کہ یہ قرب تو تمام انسانوں کے لئے ہے۔

دوست، نزدیک تر از من بہ من است   وین عجیب تر کہ من از وی دورم

''دوست میرے نفس سے زیادہ مجھ سے نزدیک ہے لیکن اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ میں اس سے دور ہوں''۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ انسان اس شائستہ عمل کے ذریعہ جو اس کے تقویٰ اور ایمان کا نتیجہ ہے اپنے وجود کو ایک بلندی پر پاتا ہے اور اس کا حقیقی وجود استحکام کے بعد اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ اپنے آپ کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرتا ہے اور اپنے نفسانی مشاہدے اور روحانی جلوے نیز خدا کے ساتھ حقیقی روابط اور خالص وابستگی کی بنا پر الٰہی جلوے کا اپنے علم حضوری کے ذریعہ ادراک کرتا ہے:

﴿وُجُوهٌ يَومَئِذٍ نَاضِرَةٌ ☆ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾[2]

اس روز بہت سے چہرے حشاش وبشاش اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

---

[1] سورۂ ق، آیت: ۱۶۔

[2] سورۂ قیامت: ۲۲، ۲۳۔

قرب الٰہی کے حصول کا راستہ

گذشتہ مباحث میں بیان کیا جا چکا ہے کہ انسانی ارتقا، کرامت اکتسابی اور مکمل کمال کا حصول اختیاری اعمال کے زیر اثر ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ ہر اختیاری عمل ہر انداز اور ہر طرح کے اصول کی بنیاد پر تقرب کا باعث نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اشارہ ہوا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اعمال، کارساز ہیں جو خدا، معاد اور نبوت پر ایمان رکھنے سے مربوط ہوں اور تقویٰ کے ساتھ انجام دیئے گئے ہوں۔ عمل کی حیثیت ایمان کی حمایت کے بغیر ایک بے روح جسم کی سی ہے اور جو اعمال تقویٰ کے ساتھ نہ ہوں بارگاہ رب العزت میں قابل قبول نہیں ہیں:

﴿ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴾[1]

خدا تو بس پرہیزگاروں سے قبول کرتا ہے۔

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ خداوند عالم سے تقرب کے عام اسباب و علل، ایمان اور عمل صالح ہیں۔ اس لئے کہ جو عمل تقویٰ کے ہمراہ نہ ہو خداوند عالم کے سامنے پیش ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسے عمل صالح بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ جو چیز حقیقت عمل کو ترتیب دیتی ہے وہ دراصل عبادی عمل ہے یعنی صرف خدا کے لئے انجام دینا اور ہر عمل کا خدا کے لئے انجام دینا یہ اس کی نیت سے وابستہ ہے ''إنّما الأعمال بالنیات ''[2] آگاہ ہو جاؤ کہ اعمال کی قدر و قیمت اس کی نیت سے وابستہ ہے اور نیت وہ تنہا عمل ہے جو ذاتاً عبادت ہے لیکن تمام اعمال کا خالصۃً لوجہ اللہ ہونا، نیت کے خالصۃً لوجہ اللہ ہونے کے اوپر ہے، یہی وجہ ہے کہ تنہا وہ عمل جو ذاتاً عبادت ہو سکتا

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت: ۲۷۔

[2] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج: ۶۷، ص: ۲۱۲۔

ہے وہ نیت ہے اور تمام اعمال، نیت کے دامن میں عبادت بنتے ہیں اسی بنا پر نیت کے پاک ہوئے بغیر کوئی عمل تقرب کا وسیلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام با اختیار مخلوقات کی خلقت کا مقصد عبادت بنایا گیا ہے:

﴿وَمَا خَلَقتُ الجِنَّ وَ الإنس إلا لِيَعبُدُونَ﴾[1]

اور میں نے جنوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی زبان میں مقام قرب الٰہی کو حاصل کرنا ہر کس و نا کس، ہر قوم و ملت کے لئے ممکن نہیں ہے اور صرف اختیاری عمل سے ہی (اعضا و جوارح کے علاوہ) اس تک رسائی ممکن ہے۔

مذکورہ تقریب کے عام عوامل کے مقابلہ میں خداوند عالم سے دوری اور بدبختی سے مراد خواہش دنیا، شیطان کی پیروی اور خواہش نفس (ہوائے نفس) کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے۔ حضرت موسیٰ کے دوران بعثت، یہودی عالم "بلعم باعور" کے بارے میں جو فرعون کا ماننے والا تھا قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ وَاتلُ عَلَيهِم نَبَأَ الَّذِی آتَیناهُ آیاتِنافَانسَلَخَ مِنهافَأتبَعَهُ الشَّيطَانُ فَكَانَ مِنَ الغَاوِینَ وَلَو شِئنَا لَرَفَعنَاهُ بِهاوَلٰكِنَّهُ أَخلَدَ إلَىٰ الارضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ﴾

اور تم ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور آخر کار وہ گمراہ ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم اسے انہی آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے مگر وہ تو خود ہی پستی کی طرف جھک پڑا اور اپنی نفسانی خواہش کا تابعدار بن بیٹھا۔[2]

---

[1] سورۂ ذاریات، آیت: ۵۶۔

[2] سورۂ اعراف، آیت: ۱۷۵، ۱۷۶۔

تقرب خدا کے درجات

قرب الٰہی جو انسان کا مکمل کمال اور مقصود ہے خود اپنے اندر درجات رکھتا ہے حتی انسان کا سب سے چھوٹا اختیاری عمل اگر ضروری شرائط رکھتا ہو تو انسان کو ایک حد تک خدا سے قریب کر دیتا ہے اس لئے انسان اپنے اعمال کی کیفیت و مقدار کے اعتبار سے خداوند قدوس کی بارگاہ میں درجہ یا درجات رکھتا ہے اور ہر فرد یا گروہ کسی درجہ یا مرتبہ میں ہوتا ہے:

﴿هُم دَرَجاتٌ عِندَاللّهِ﴾[1]

(وہ لوگ (صالح افراد) خدا کی بارگاہ میں (صاحب) درجات ہیں۔

اسی طرح پستی اور انحطاط نیز خداوند عالم سے دوری بھی درجات کا باعث ہے اور ایک چھوٹا عمل بھی اپنی مقدار کے مطابق انسان کو پستی میں گرا سکتا ہے۔ اسی بنا پر انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ اور توقف کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ ہر عمل انسان کو یا خدا سے قریب کرتا ہے یا دور کرتا ہے، ٹھہراؤ اس وقت متصور ہے جب انسان مکلف نہ ہو۔ اور خدا کے ارادہ کے مطابق عمل انجام دینے کے لئے جب تک انسان اختیاری کوشش و جستجو میں ہے مکلف ہے چاہے اپنی تکلیف کے مطابق عمل کرے یا نہ کرے تکامل یا تنزل سے ہمکنار ہوگا۔

﴿وَلِكُلٍّ دَرَجاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَمارَبُّكَ بِغافِلٍ عَمَّايَعمَلُونَ﴾

اور جس نے جیسا کیا ہے اسی کے موافق (نیکو کاروں اور صالحین کے گروہ میں سے) ہر ایک کے درجات ہیں اور جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں تمہارا پروردگار اس سے بے خبر نہیں ہے۔[2]

انسان کے اختیاری تکامل و تنزل کا ایک وسیع میدان ہے، ایک طرف تو فرشتوں سے بالاتر وہ مقام جسے قرب الٰہی اور جوار رحمت حق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ مقام جو

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت: ۱۶۳۔ [2] سورۂ انعام، آیت: ۱۳۲۔

حیوانات وجمادات سے پست تر ہے اور دونوں کے درمیان دوزخ کے بہت سے طبقات اور بہشت کے بہت سے درجات ہیں کہ جن میں انسان اپنی بلندی وپستی کے مطابق ان درجات وطبقات میں جائے گا۔

ایمان ومقام قرب کا رابطہ

ایمان وہ تنہا شئی ہے جو خدا کی طرف صعود کرتی ہے اور اچھا ونیک عمل ایمان کو بلندی عطا کرتا ہے:

﴿إِلَيهِ يَصعَدُ الكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالعَمَلُ الصَّالِحُ يَرفَعُهُ﴾[1]

اس کی بارگاہ تک اچھی باتیں پہنچتی ہیں اور اچھے کام کو وہ خوب بلند فرماتا ہے۔

انسان مومن بھی اپنے ایمان ہی کے مطابق خداوند عالم سے قریب ہے۔ اس لئے جس قدر انسان کا ایمان کامل ہوگا اتنا ہی اس کا تقرب زیادہ ہوگا[2] اور کامل ایمان والے کی حقیقی توحید یہ ہے کہ قرب الٰہی کے سب سے آخری مرتبہ پر فائز ہو اور اس سے نیچا مرتبہ شرک ونفاق سے ملا ہوا ہے جو تقرب کے مراتب میں شرک اور نفاق خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے نیچے کا درجہ جو مقام قرب کے ماسواء ہے شرک اور نفاق جلی کا ہے اور کہا جاچکا ہے کہ یہ شرک ونفاق صاحب عمل و فعل کی نیت سے مربوط ہیں پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

﴿نيّة الشرك في أمتي أخفى من دبيب النملة السوداءِ علىٰ صخرة الصّا في الليلة الظلماء﴾

میری امت کے درمیان نیتِ شرک، تاریک شب میں سیاہ سنگ پر سیاہ چیونٹیوں کی حرکت سے زیادہ مخفی ہے۔

---

[1] سورۂ فاطر، آیت: ۱۰۔

[2] مزید وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح خودشناسی برای خودسازی۔

خلاصۂ فصل

ا۔انسان کی تمام جستجو وتلاش کمالات کے حاصل کرنے اور سعادت کو پانے کے لئے ہے۔

۲۔وہ مادی مکاتب جو معنوی اور غیر فطری امور کے منکر ہیں دنیاوی فکر رکھتے ہیں نیز کمال وسعادت اور اس کے راہ حصول کے معانی ومفاہیم کو مادی امور میں منحصر جانتے ہیں۔

۳۔ ہر موجود کا کمال منجملہ انسان، اس کے اندر موجودہ صلاحیتوں کا فعلیت پانا نیز اس کا ظاہر وآشکار ہونا ہے۔

۴۔قرآن مجید انسان کے مکمل کمال کو فوز (کامیابی) فلاح (نجات) اور سعادت (خوش بختی) جیسے کلمات سے تعبیر کرتا ہے اور مکمل کمال کے مصداق کو قرب الٰہی بتاتا ہے۔

۵۔ اچھے لوگوں کے لئے مقام قرب الٰہی ایمان کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور شائستہ اختیاری عمل ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

۶۔قرب الٰہی جس انسان کا مکمل کمال اور مقصود ہے خود اپنے اندر درجات کا حامل ہے حتیٰ کہ انسان کا سب سے چھوٹا اختیاری عمل اگر ضروری شرائط کے ہمراہ ہو تو انسان کو ایک حد تک خدا سے قریب کر دیتا ہے۔ اس لئے اپنے اعمال کی کیفیت ومقدار کی بنیاد پر لوگوں کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ جس قدر انسان کا ایمان ہوگا اسی اعتبار سے اس کا تقرب الٰہی زیادہ ہوگا اور ایمان کامل اور توحید خالص، قرب الٰہی کے آخری مرتبہ سے مربوط ہے۔

تمرین

۱۔ صاحب کمال ہونے اور کمال سے لذت اندوز ہونے کے درمیان کیا فرق ہے؟

۲۔ انسان کی انسانیت اور اس کی حیوانیت کے درمیان کون سا رابطہ برقرار ہے؟

۳۔ مکمل کمال کے حاصل ہونے کا راستہ کیا ہے؟

۴۔ آیات و روایات کی زبان میں اعمال نیک کو عمل صالح کیوں کہا گیا ہے؟

۵۔ اسلام کی نظر میں انسان کامل کی خصوصیات کیا ہیں؟

۶۔ اگر ہر عمل کا اعتبار نیت سے وابستہ ہے تو اس شخص کے اعمال جو دینی واجبات کو خلوص نیت کے ساتھ لیکن غلط انجام دیتا ہے کیوں قبول نہیں کیا جاتا ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۔اذر باد مجانی، مسعود (۱۳۷۵) ''انسان کامل از دیدگاہ اسلام وروان شناسی'' مجلۂ حوزہ ودانشگاہ، سال نہم، شمارہ پیاپی۔

۔بدوی، عبدالرحمٰن (۱۳۷۶) الانسان الکامل فی الاسلام، کویت: وکالۃ المطبوعات.

۔جبلی، عبدالکریم، (۱۳۲۸) الانسان الکامل فی معرفتہ الاوایل و الاواخر، قاھرہ، المطبعۃ الاھریۃ المصریۃ.

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۲) تفسیر موضوعی قرآن، ج۶، تہران: رجاء۔

۔حسن زادہ آملی، حسن (۱۳۷۲) انسان کامل از دیدگاہ نہج البلاغہ، قم: قیام۔

۔زیادہ، معن، (۱۳۸۶) الموسوعۃ الفلسفیۃ العربیۃ، بیروت: معھد الانماء العربی.

۔سادات، محمد علی، (۱۳۶۴) اخلاق اسلامی، تہران: سمت۔

۔سبحانی، جعفر (۱۳۷۱) سیمای انسان کامل در قرآن، قم، دفتر تبلیغات اسلامی۔

۔شولتس، ڈوال (بی تا) روان شناسی کمال، ترجمہ، گیتی خوشدل، تہران: نشر نو۔

۔محمد تقی مصباح (بی تا) خود شناسی برای خود سازی، قم: موسسہ درراہ حق۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) انسان کامل، تہران، صدرا۔

۔نصری، عبداللہ سیمای انسان کامل از دیدگاہ مکاتب، تہران: انتشارات دانشگاہ علامہ طباطبائی۔

ملحقات

ناتالی ٹربو یک، انسان کے آخری ہدف اور اس کے حصول کے سلسلہ میں علماء علوم تجربی کے نظریات کو جو کہ صرف دنیاوی نقطہ نگاہ سے ہیں اس طرح بیان کرتا ہے۔

مغربی انسان شناسی کے اعتبار سے مکمل کمال

انسان کو بہتر مستقبل بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ انسان کی ترقی کے آخری مقاصد کیا ہیں؟

فرویڈ کے ماننے والے کہتے ہیں: انسان کا مستقبل تاریک ہے، انسان کی خود پسند فطرت اس کی مشکلات کی جڑ ہے اور اس فطرت کی موجودہ جڑوں کو پہچاننا اور اس کی اصلاح کرنا راہ کمال [1] کے بغیر دشوار نظر آتا ہے، فرویڈ کا دعویٰ ہے کہ زندگی کے نیک تقاضوں کو پورا کرنا (جیسے جنسی مسائل) اور برے تقاضوں کو کمزور بنانا (جیسے لڑائی جھگڑے وغیرہ) شاید انسان کی مدد کرسکتا ہے جب کہ فرویڈ خود ان اصولوں پر عمل پیرا نہیں تھا۔

ڈاکٹر فرویڈ کے نئے ماننے والے (مارکس، فروم): انسان کی خطائیں معاشرے کے منفی آثار کا سرچشمہ ہیں لہٰذا اگر سماج اور معاشرہ کو اس طرح بدل دیا جائے کہ انسان کا قوی پہلو مضبوط اور ضعیف پہلو نابود ہو جائے تو انسان کی قسمت بہتر ہو سکتی ہے، انسان کی پیشرفت کا آخری مقصد ایسے معاشرے کی ایجاد ہے جو تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ نیک کاموں کو انجام دینے کے لئے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کریں۔

مارکسزم مذہب کی پیروی کرنے والے (مارکس، فروم): جن کا مقصد ایسے اجتماعی شوسیلزم کا وجود میں لانا تھا جس میں معاشرے کے تمام افراد، ایجادات اور محصولات میں شریک ہوں، جب کہ انسان کی مشکلوں کے لئے راہ حل اور آخری مقصد اس کی ترقی ہے، معاشرے کے

افراد اس وقت اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوشنود پائیں گے جب سب کے سب اجتماعی طور پر مقصد کو پانے کے لئے ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

سرگرمی اور کردار کو محور قرار دینے والے افراد مثلاً اکینر کا کہنا ہے: انسان کی ترقی کا آخری مقصد، نوع بشر کی بقاء ہے اور جو چیز بھی اس مقصد میں مددگار ہوتی ہے وہ مطلوب و بہتر ہے۔ اس بقا کے لئے ماحول بنانا، بنیادی اصول میں سے ہے، اور وہ ماڈل جو تقاضے کے تحت بنائے جاتے ہیں وہ معاشرے کو مضبوط بنا سکتے ہیں نیز اس میں بقا کا احتمال زیادہ رہتا ہے (جیسے زندگی کی بہتری، صلح، معاشرہ پر کنٹرول وغیرہ)

نظریہ تجربیات کے حامی (ہابز) کا کہنا ہے: انسان کے طرز سلوک اور کردار کو کنٹرول اور پیشین گوئی کے لئے تجربیات سے استفادہ کرنا اس کی ترقی کی راہ میں بہترین معاون ہے۔

سودخوری کرنے والے (بنثام، میل) کا کہنا ہے: معاشرے کو چاہیئے کہ افراد کے اعمال وطرز سلوک کو کنٹرول کرے اس طرح کہ سب سے زیادہ فائدہ عوام کی کثیر تعداد کو ملے۔

انسان پسندی وگرویدگی کا عقیدہ رکھنے والے (مازلو، روجر): مازلو کے مطابق ہر شخص میں ایک فطری خواہش ہے جو اس کو کامیابی و کامرانی کی طرف رہنمائی کرتی ہے لیکن یہ اندرونی قوت اتنی نازک ولطیف ہے جو متعارض ماحول کے دباؤ سے بڑی سادگی سے متروک یا اس سے پہلوتہی کرلیتی ہے۔ اسی بنا پر انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کی کلید، معاشرے کو پہچاننے اور پوشیدہ قوتوں کی ہلکی جھلک، انسان کی حوصلہ افزائی میں مضمر ہے۔

روجر کا کہنا ہے: جملہ افراد دوسروں کی بے قید وشرط تائید کے محتاج ہیں تا کہ خود کو ایک فرد کے عنوان سے قبول کریں اور اس کے بعد اپنی انتہائی صلاحیت کے مطابق ترقی و پیش رفت کریں اسی لئے تائید کی میزانِ میں اضافہ انسان کی صورتحال کے بہتر بنانے کی کلید ہے اور ہر انسان کی اپنی شخصیت سازی ہی اس کی ترقی کا مقصد ہے۔

انسان پسندی کا عقیدہ رکھنے والے (می، فرینکل) کے مطابق:

می: کا کہنا ہے کہ دور حاضر کے انسان کو جاننا چاہیئے کہ جب تک وہ صاحب ارادہ ہے اپنے اعمال کے لئے مواقع کی شناخت کرنا چاہیئے اور اپنے حس ارادہ کو حاصل کر کے اپنی صورتحال بہتر بنانی چاہیئے۔

فرینکل کہتا ہے کہ: ہر وہ انسان جو کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی کے واسطے زندگی گذارنا چاہتا ہے، اس کو چاہیئے کہ وہ اس کی حیات کو اہمیت دے۔ یہ معنی اور نظریہ ہر ارادہ کرنے والے کو ایک مبنیٰ فراہم کراتا ہے اور انسان کو مایوسی اور تنہائی سے نجات دلاتا ہے۔

خدا کا یقین رکھنے والے (ببر، ٹیلچ، فورنیر): کا کہنا ہے کہ ہمارا خدا اور اس کے بندے سے دوگانہ رابطہ ہمارے آزادانہ اعمال کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور انسانی ترقی کا پیش خیمہ ہے۔

۱۰

دنیاوآخرت کا رابطہ

اس فصل کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات

۱۔قرآن مجید میں کلمہ دنیاوآخرت کے استعمالات میں سے تین موارد بیان کریں؟

۲۔ دنیاوآخرت کے بارے میں مختلف نظریات کا تجزیہ اوران کی تحلیل کریں؟

۳۔رابطہ دنیاوآخرت کے ضروری نکات کاذکر کریں؟

۴۔آخرت میں دنیاوی حالت سے مربوط افراد کے چار حصوں کے نام ذکر کریں؟

گذشتہ فصلوں میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ انسان مادی اور حیوانی حصہ میں منحصر نہیں ہے اور نہ ہی اس کی دنیا اس کی دنیاوی زندگی میں منحصر ہے۔ انسان ایک دائمی مخلوق ہے جو اپنے اختیاری کوشش سے اپنی دائمی سعادت یا بدبختی کے اسباب فراہم کرتی ہے اور وہ سعادت و بدبختی محدود دنیا میں سمانے کی ظرفیت نہیں رکھتی ہے۔ دنیا ایک مزرعہ کی طرح ہے جس میں انسان جو کچھ بوتا ہے عالم آخرت میں وہی حاصل کرتا ہے۔ اس فصل میں ہم کوشش کریں گے کہ ان دونوں عالم کا رابطہ اور دنیا میں انسان کی جستجو کا کردار اور آخرت میں اس کی سعادت و بدبختی کی نسبت کو واضح کریں، ہم قرآن مجید کی آیتوں کی روشنی میں اس رابطہ کے غلط مفہوم و مصادیق کو مشخص اور جدا کرتے ہوئے اس کی صحیح و واضح تصویر آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

قرآن مجید میں کلمۂ دنیا کے مختلف استعمالات

چونکہ قرآن مجید میں لفظ دنیا و آخرت کا مختلف و متعدد مرتبہ استعمال ہوا ہے لہٰذا ہم دنیا و آخرت کے رابطے کو بیان کرنے سے پہلے ان لفظوں کے مراد کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن میں دنیا و آخرت سے مراد کبھی انسان کی زندگی کا ظرف ہے جیسے ﴿فَأُولٰئِکَ حَبِطَت أَعمالُهُم فِي الدُّنیا وَ الآخِرَةِ﴾[۱] ان لوگوں (مرتد افراد) کا انجام دیا ہوا سب کچھ دنیا و آخرت میں اکارت ہے۔

---

[۱] سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۷۔

ان دولفظوں کے دوسرے استعمال میں دنیا و آخرت کی نعمتوں کا ارادہ ہوا ہے جیسے ﴿بَل تُؤثِرُونَ الحَیاۃَ الدُّنیا وَالآخِرَۃُ خَیرٌ وَأبقیٰ ﴾[1] مگر تم لوگ تو دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور دیر پا ہے۔

ان دولفظوں کا تیسرا استعمال کہ جس سے مراد دنیا و آخرت میں انسان کا طریقۂ زندگی ہے، اور جو چیز اس بحث میں ملحوظ ہے وہ ان دولفظوں کا دوسرا اور تیسرا استعمال ہے یعنی اس بحث میں ہم یہ مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں کہ طرز سلوک کا طریقہ نیز اس دنیا میں زندگی گذارنے کی کیفیت کا آخرت کی زندگی اور کیفیت سے کیا رابطہ ہے؟

اس سلسلہ میں تجزیہ وتحلیل کرنا اس جہت سے ضروری ہے کہ موت کے بعد کے عالم پر صرف اعتقاد رکھنا ہمارے اس دنیا میں اختیاری طرز سلوک پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ اسی وقت فائدہ مند ہے جب دنیا میں انسان کے طرز سلوک اور اس کی طریقۂ زندگی اور آخرت میں اس کی زندگی کی کیفیت کے درمیان ایک مخصوص رابطہ کے معتقد ہوں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی معتقد ہو کہ انسان کی زندگی کا ایک مرحلہ دنیا میں ہے جو موت کے آجانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور آخرت میں زندگی کا دوسرا مرحلہ ہے جو اس کی دنیاوی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا ہے تو صرف اس جدید حیات کا عقیدہ اس کے طرز سلوک و کردار پر کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ان مراحل کے درمیان کوئی رابطہ ہے یا نہیں ہے؟ اور اگر ہے تو کس طرح کا رابطہ ہے؟

---

[1] سورۂ اعلی، آیت: ۱۶ و ۱۷۔

دنیا وآخرت کے روابط کے بارے میں پائے جانے والے نظریات کا تجزیہ

ان لوگوں کے نظریہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے جو آخرت کی زندگی کو مادی زندگی کا دوسرا حصہ سمجھتے ہیں اسی لئے وہ اپنے مرنے والوں کی قبروں میں مادی امکانات مثال کے طور پر کھانا اور دوسرے اسباب زینت رکھنے کے قائل ہیں، تاریخ انسانیت میں دنیا وآخرت کے درمیان تین طرح کے رابطے انسانوں کی طرف سے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ انسان اور دنیا وآخرت کے درمیان ایک مثبت اور مستقیم رابطہ ہے جو لوگ دنیا میں اچھی زندگی سے آراستہ ہیں وہ آخرت میں بھی اچھی زندگی سے ہم کنار ہوں گے۔ قرآن مجید اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَداً وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيراً مِّنهَا مُنقَلَباً﴾

وہ کہ جس نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا تھا جب اپنے باغ میں داخل ہوا تو یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے تو اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ کبھی یہ باغ اجڑ جائے گا اور میں تو یہ بھی خیال نہیں کرتا تھا کہ قیامت برپا ہوگی اور جب میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جاؤں گا تو یقیناً اس سے کہیں اچھی جگہ پاؤں گا۔[1]

سورہ فصلت کی ۵۰ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

﴿وَلَئِن أَذَقنَاهُ رَحمَةً مِّنَّا مِن بَعدِ ضَرَّاءَ مَسَّتهُ لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّجِعتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِندَهُ لَلحُسنَىٰ﴾

اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچ جانے کے بعد ہم اس کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو یقینی کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ہی ہے اور میں نہیں خیال کرتا کہ کبھی قیامت برپا

---

[1] سورۂ کہف، آیت: ۳۵ و ۳۶۔

ہوگی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹایا بھی جاؤں تو بھی میرے لئے یقیناً اس کے یہاں بھلائی ہے۔

بعض لوگوں نے بھی اس آیہ شریفہ ﴿وَمَن كَانَ فِي هٰذِهِ أَعمىٰ فَهُوَ فِي الآخِرَةِ أَعمىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلا﴾ اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا اور راہ راست سے بھٹکا ہوا ہوگا'' [1] کو دلیل بنا کر کہا ہے کہ: قرآن نے بھی اس مستقیم ومثبت رابطہ کو صحیح قرار دیا ہے کہ جو انسان اس دنیا میں اپنی دنیاوی زندگی کے لئے تلاش نہیں کرتا ہے اور مادی نعمتوں کو حاصل نہیں کر پاتا ہے وہ آخرت میں بھی آخرت کی نعمتوں سے محروم رہے گا۔

بعض لوگوں نے اس رابطہ کے برخلاف نظریہ کا ذکر کیا ہے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر قسم کی اس دنیا میں لطف اندوزی اور عیش پرستی، آخرت میں غم واندوہ کا باعث ہے اور اس دنیا میں ہر طرح کی محرومیت، آخرت میں آسودگی اور خوش بختی کا پیش خیمہ ہے، یہ لوگ شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم دو زندگی اور ایک روزی ونعمت کے مالک ہیں اور اگر اس دنیا میں اس سے بہرہ مند ہوئے تو آخرت میں محروم ہوں گے اور اگر یہاں محروم رہے تو اس دنیا میں حاصل کرلیں گے۔

یہ نظریہ معاد کا اعتقاد رکھنے والوں کی ایک تعداد کی طرف سے مورد تائید ہے اور وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿أَذهَبتُم طَيِّبَاتِكُم فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنيَا وَاستَمتَعتُم بِهَا فَاليَومَ تُجزَونَ عَذَابَ الهُونِ﴾ [2]

تم تو اپنی دنیاوی زندگی میں خوب مزے اڑا چکے اور اس میں خوب چین کر چکے تو آج (قیامت کے روز) تم پر ذلت کا عذاب کیا جائے گا۔

---

[1] سورۂ اسراء، آیت: ۷۲۔

[2] سورۂ احقاف، آیت: ۲۰

دونوں مذکورہ نظریہ قرآن سے سازگار نہیں ہے اسی لئے قرآن مجید نے سیکڑوں آیات میں اس مسئلہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پہلے نظریہ کے غلط اور باطل ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن نے ایسے لوگوں کو یاد کیا ہے جو دنیا میں فراوانی نعمت سے ہمکنار تھے لیکن کافر ہونے کی وجہ سے اہل جہنم اور عذاب الٰہی سے دو چار ہیں۔ جیسے ولید بن مغیرہ، ثروت منداور عرب کا چالاک نیز پیغمبر اکرمؐ کے سب سے بڑے دشمنوں میں سے تھا اور یہ آیہ اس کے لئے نازل ہوئی ہے۔

ذَرنِی وَمَن خَلَقتُ وَحِیداً وَجَعلتُ لَهُ مَالاً مَمدُوداً وَبَنِینَ شُهُوداً مَهَّدتُ لَهُ تَمهِیداً ثُمَّ یَطمَعُ أَن أَزِیدَ کَلاَّ إِنَّهُ کَانَ لآیَاتِنَا عَنِیداً سَأُرهِقُهُ صَعُوداً[1]

مجھے اس شخص کے ساتھ چھوڑ دو کہ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا اور اسے بہت سا مال دیا اور نظر کے سامنے رہنے والے بیٹے اور اسے ہر طرح کے سامان میں وسعت دی پھر اس پر بھی وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اور بڑھاؤں یہ ہرگز نہ ہوگا یہ تو میری آیتوں کا دشمن تھا تو میں عنقریب اسے سخت عذاب میں مبتلا کروں گا۔

قارون کی دولت اور اس کی بے انتہا ثروت، دنیاوی سزا میں مبتلا ہونا اور اس کی آخرت کی بدبختی بھی ایک دوسرا واضح نمونہ ہے جو سورہ قصص کی ۷۶ ویں آیہ اور سورہ عنکبوت کی ۳۹ ویں آیہ میں مذکور ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید صالح لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو دنیا میں وقار و عزت اور نعمتوں سے محروم تھے لیکن عالم آخرت میں، جنت میں ہیں جیسے صدر اسلام کے مسلمین جن کی توصیف میں فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ مدثر، آیت: ۱۱ تا ۱۷۔

﴿لِلفُقَرَاءِ المُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخرِجُوا مِن دِيَارِهِم وَأَموَالِهِم يَبتَغُونَ فَضلاً مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضوَاناً وَيَنصُرُونَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ أُولٰئِکَ هُمُ الصَّادِقُونَ فَأُولٰئِکَ هُمُ المُفلِحُونَ ﴾[1]

ان مفلس مہاجروں کا حصہ ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے خدا کے فضل وخوشنودی کے طلبگار ہیں اور خدا کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ایماندار ہیں تو ایسے ہی لوگ اپنی دلی مرادیں پائیں گے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ آخرت میں شقاوت وسعادت کا معیار ایمان اور عمل صالح نیز کفر اور نامناسب اعمال ہیں، دنیاوی شان وشوکت اور اموال سے مزین ہونا اور نہ ہونا نہیں ہے۔

﴿ وَمَن أَعرَضَ عَن ذِکرِی فَإِنَّ لَهُ مَعِیشَةً ضَنکاً وَنَحشُرُهُ یَومَ القِیَامَةِ أَعمَىٰ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرتَنِی أَعمَىٰ وَقَد کُنتُ بَصِیراً قَالَ کَذٰلِکَ أَتَتکَ آیَاتُنَا فَنَسِیتَهَا وَ کَذٰلِکَ الیَوم تُنسَىٰ ﴾[2]

جو بھی میری یاد سے روگردانی کرے گا اس کے لئے سخت وناگوار زندگی کا سامنا ہے اور اس کو ہم قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے، تب وہ کہے گا الہی میں تو آنکھ والا تھا تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا خدا فرمائے گا جس طرح سے ہماری آیتیں تمہارے پاس پہنچیں تو تم نے انہیں بھلا دیا اور اسی طرح آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ غیر مطلوب دنیاوی زندگی اگر کفر وگناہ کے زیر اثر ہو تو ہوسکتا ہے کہ آخرت کی بدبختی کے ہمراہ ہو۔ لیکن بری زندگی خود معلول ہے علت نہیں ہے جو گناہ وکفر

---

[1] سورۂ حشر، آیت: ۸،۹۔

[2] سورۂ طہ، آیت: ۱۲۴ تا ۱۲۶

اور مطلوبہ نتائج (ایک دنیاوی امر دوسرا اخروی) کا حامل ہے، دوسرے نظریہ کے بطلان پر بھی بہت سی آیتیں دلالت کرتی ہیں جیسے:

﴿قُل مَن حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخرَجَ لِعِبادِهِ وَالطَّيِّباتِ مِنَ الرِّزقِ قُل هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الحَياةِ الدُّنيا خَالِصَةً يَومَ القِيامَةِ﴾

(اے پیغمبر کہہ دو) کہ جو زینت اور کھانے کی صاف ستھری چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کی ہیں کس نے حرام قرار دیں تم خود کہہ دو کہ سب پاکیزہ چیزیں قیامت کے دن ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگی میں ایمان لائے۔[1]

حضرت سلیمانؑ جن کو قران مجید نے صالح اور خدا کے مقرب بندوں میں شمار کیا ہے اور جو عظیم دنیاوی امکانات کے حامل تھے اس کے باوجود ان امکانات نے ان کی اخروی سعادت کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا ہے۔

آیۂ ﴿أذهبتُم طَيِّباتكُم﴾ بھی ان کافروں سے مربوط ہے جنہوں نے دنیاوی عیش و آرام کو کفر اور انکار خدا نیز سرکشی اور عصیان کے بدلے میں خریدا ہے جیسا کہ آیت کی ابتداء میں وارد ہوا ہے، ﴿وَقِيلَ لِلَّذِين كَفَرُوا......﴾ جن آیات میں ایمان اور عمل صالح اور اخروی سعادت کے درمیان نیز کفر و گناہ اور اخروی بدبختی کے درمیان رابطہ اتنا زیادہ ہے کہ جس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے اور یہ مطلب مسلم بھی ہے بلکہ اسلام وقرآن کی ضروریات میں سے ہے۔

رابطۂ دنیا وآخرت کی حقیقت

ایمان اور عمل صالح کا اخروی سعادت سے رابطہ اور کفر و گناہ کا اخروی شقاوت سے لگاؤ ایک طرح سے صرف اعتباری رابطہ نہیں ہے جسے دوسرے اعتبارات کے ذریعہ تبدیل کیا جاسکتا ہو

---

[1] سورۂ اعراف، آیت:۳۲۔

اوران کے درمیان کوئی تکوینی وحقیقی رابطہ نہ ہواوران آیات میں وضعی واعتباری روابط پر دلالت کرنے والی تعبیروں سے مراد، رابطہ کا وضعی واعتباری ہونانہیں ہے بلکہ یہ تعبیریں انسانوں کی تفہیم اور تقریب ذہن کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے تجارت[۱] خرید وفروش[۲] سزا[۳] جزا[۴] اوراس کے مثل، بہت سی آیات کے قرائن سے معلوم ہوتا ہے جو بیان کرتی ہیں کہ انسان نے جو کچھ بھی انجام دیا ہے وہ دیکھے گا اوراس کی جزا وہی عمل ہے۔

اچھے لوگوں کی جزا کا ان کے اچھے کاموں سے رابطہ بھی صرف فضل ورحمت کی بنا پرنہیں ہے کہ جس میں ان کے نیک عمل کی شائستگی اور استحقاق ثواب کا لحاظ نہ کیا گیا ہو کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو عدل وانصاف، اپنے اعمال کے مشاہدہ اور یہ کہ عمل کے مطابق ہی ہر انسان کی جزا ہے جیسی آیات سے قطعاً سازگار نہیں ہے۔

مذکورہ رابطہ کوایک انرجی کا مادہ میں تبدیل ہونے کی طرح سمجھنا صحیح نہیں ہے اور موجودہ انرجی اور آخرت کی نعمتوں کے درمیان مناسبت کا نہ ہونا اورایک انرجی کا اچھے اور برے کام میں

۱۔ ﴿یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمنُوا ھَل اَدُلُّکُم عَلَیٰ تِجَارَۃٍ تُنجِیکُم مِنَ عَذَابٍ اَلِیمٍ﴾ سورۂ صف، آیت: ۱۰۔ اے صاحبان ایمان! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتادوں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے۔

۲۔ ﴿إِنَّ اللّٰہَ اشتَرَیٰ مِنَ المُؤمِنِینَ اَنفُسَھُم وَأَموَالَھُم بِأَن لَھُمُ الجَنَّۃَ﴾ سورۂ توبہ، آیت: ۱۱۱۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اوران کے مال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ ان کے لئے بہشت ہے۔

۳۔ ﴿وَذٰلِکَ جَزَاءُ مَن تَزَکَّیٰ﴾ سورۂ طہٰ، آیت: ۷۶۔ اور جس نے اپنے آپ کو پاک وپاکیزہ رکھا اس کا یہی (جنت) صلہ ہے۔

۴۔ ﴿فَنِعمَ أَجرُ العَامِلِین﴾۔ جنہوں نے راہ خدا میں سعی وکوشش کی ان کے لئے کیا خوب مزدوری ہے۔ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۱۰۔

استعمال کا امکان نیز وہ بنیادی کردار جو آیات میں عمل و نیت کے اچھے اور برے ہونے سے دیا گیا ہے اس نظریہ کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔

گذشتہ مطالب کی روشنی میں ایمان و عمل صالح کا سعادت اور کفر و گناہ کا اخروی بدبختی سے ایک حقیقی رابطہ ہے اس طرح کہ آخرت میں انسان کے اعمال ملکوتی شکل میں ظاہر ہوں گے اور وہی ملکوتی وجود، آخرت کی جزا اور سزا نیز عین عمل قرار پائے گا۔

وہ جملہ آیات جو اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِأنفُسِکُم مِن خَیرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللهِ﴾[1]

اور جو کچھ بھلائی اپنے لئے پہلے سے بھیج دوگے اس کو موجود پاؤ گے۔

﴿یَومَ تَجِدُ کُلُّ نَفسٍ مَا عَمِلَت مِن خَیرٍ مُحضَراً وَمَا عَمِلَت مِن سُوءٍ تَوَدُّ لَو أَنَّ بَینَهَا وَبَینَهُ أَمَداً بَعِیداً﴾[2]

اس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے اور جو کچھ برائی کی ہے اس کو موجود پائے گا آرزو کرے گا کہ کاش اس کی بدی اور اس کے درمیان میں زمانہ دراز ہو جاتا۔

﴿فَمَن یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّةٍ خَیراً یَرَهُ وَ مَن یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً یَرَهُ﴾

جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے اسے بھی دیکھ لے گا۔[3]

﴿إِنَّمَا تُجزَونَ مَا کُنتُم تَعمَلُونَ﴾[4]

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۱۱۰۔

[2] سورۂ آل عمران، آیت: ۳۰۔

[3] سورۂ زلزال، آیت: ۷و۸۔

[4] سورۂ طور، آیت: ۱۶۔

بس تم کوانہیں کاموں کا بدلہ ملے گا جوتم کیا کرتے تھے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَموَالَ اليَتَامىٰ ظُلماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِم نَاراً﴾

بے شک جولوگ یتیم کے اموال کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے شکم میں آگ کھا رہے ہیں۔[1]

دنیا و آخرت کے رابطہ میں دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ آخرت کی زندگی میں لوگ صرف اپنا نتیجہ اعمال دیکھیں گے اور کوئی کسی کے نتائج اعمال سے غلط فائدہ نہیں اٹھا پائے گا اور نہ ہی کسی کے برے اعمال کی سزا قبول کر سکے گا۔

﴿أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ أُخرىٰ وَأَن لَيسَ لِلإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعىٰ﴾

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔[2]

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ آخرت میں لوگ اپنی دنیاوی حالت کے اعتبار سے چار گروہ میں تقسیم ہونگے۔

الف: وہ لوگ جو دنیا و آخرت کی نعمتوں سے فیض یاب ہیں۔

﴿وآتَينَاهُ أَجرَهُ فِي الدُّنيَا وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں بھی اچھا بدلہ عطا کیا اور وہ تو آخرت میں بھی یقینی نیکو کاروں میں سے ہیں۔[3]

ب: وہ لوگ جو دنیا و آخرت میں محروم ہیں۔

﴿خَسِرَ الدُّنيَا وَالآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الخُسرَانُ المُبِينُ﴾

---

[1] سورۂ نساء، آیت: ۱۰۔

[2] سورۂ نجم، آیت: ۳۸و۳۹۔

[3] سورۂ عنکبوت، آیت: ۲۸۔

اس نے دنیاو آخرت میں گھاٹا اٹھایا بے شک وہ صریحی گھاٹا ہے۔[1]

(ج) وہ لوگ جو دنیا میں محروم اور آخرت میں بہرہ مند ہیں۔

(د) وہ لوگ جو آخرت میں محروم اور دنیا میں بہرہ مند ہیں۔

آخری دو گروہ کے نمونے بحث کے دوران گذر چکے ہیں۔ دنیاو آخرت کے رابطے (ایمان وعمل صالح ہمراہ سعادت اور کفر وگناہ ہمراہ شقاوت) میں آخری نکتہ یہ ہے کہ قرآنی نظریہ کے مطابق انسان کا ایمان اور عمل صالح اس کے گذشتہ آثار کفر کو ختم کر دیتا ہے اور عمر کے آخری حصہ میں کفر اختیار کرنا گذشتہ ایمان وعمل صالح کو برباد کر دیتا ہے۔ (کہ جس کو حبط عمل سے تعبیر کیا گیا ہے)

﴿وَمَن يُؤمِن بِاللّٰهِ وَيَعمَل صَالِحاً يُكَفِّر عَنهُ سَيِّئَاتِهِ﴾[2]

اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے اور عمل صالح انجام دیتا ہے وہ اپنی برائیوں کو محو کر دیتا ہے۔

﴿وَمَن يَرتَدِد مِنكُم عَن دِينِهِ فَيَمُت وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰئِكَ حَبِطَت أَعمَالُهُم فِي الدُّنيَا وَ الآخِرَةِ﴾[3]

اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر گیا اور کفر کی حالت میں دنیا سے گیا، اس نے اپنی دنیاو آخرت کے تمام اعمال برباد کر دیئے۔

دوسری طرف اگر چہ اچھا یا برا کام دوسرے اچھے یا برے فعل کے اثر کو ختم نہیں کرتا ہے لیکن بعض اچھے امور، بعض برے امور کے اثر کو ختم کر دیتے ہیں اور بعض برے امور بعض اچھے امور کے آثار کو ختم کر دیتے ہیں مثال کے طور پر احسان جتانا نقصان پہنچانا، مالی انفاق (صدقات) کے اثر کو ختم کر دیتا ہے۔

---

[1] سورۂ حج، آیت: ۱۱۔ [2] سورۂ تغابن، آیت: ۹۔ [3] سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۷۔

﴿لا تُبطِلُوا صَدَقَاتِکُم بِالمَنِّ وَالأذیٰ﴾[1]

اپنی خیرات کو احسان جتانے اور ایذا دینے کی وجہ سے اکارت نہ کرو۔

اور صبح وشام اور کچھ رات گئے نماز قائم کرنا بعض برے کاموں کے آثار کو ختم کر دیتا ہے قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاًمِنَ اللَّيلِ إنَّ الحَسنَاتِ يُذهِبنَ السَّيِّاتِ﴾

دن کے دونوں طرف اور رات گئے نماز پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں بیشک گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔[2]

شفاعت بھی ایک علت وسبب ہے جو انسان کے حقیقی کمال وسعادت کے حصول میں موثر ہے۔[3]

1. سورۂ بقرہ، آیت:۲۶۴۔

2. سورۂ ھود، آیت:۱۱۴

3. قرآن مجید کی آیات میں ایمان اور عمل صالح، ایمان اور تقویٰ، ہجرت اور اذیتوں کا برداشت کرنا، جہاد نیز کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنا، پوشیدہ طور پر صدقہ دینا، احسان کرنا، توبہ نصوح اور نماز کے لئے دن کی ابتدا اور آخر نیز رات گئے قیام کرنا وغیرہ ان جملہ امور میں سے ہیں جن کو بعض گناہوں کے آثار کو محو کرنے کی علت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔(ملاحظہ ہو: سورۂ محمد، آیت:۲، سورۂ مائدہ، آیت:۱۲، سورۂ عنکبوت آیت:۷، سورۂ مائدہ، آیت:۶۵، سورۂ آل عمران، آیت:۱۹۵، سورۂ نساء، آیت:۳۱، سورۂ بقرہ، آیت:۲۷۱ سورۂ انفال، آیت:۲۹، سورۂ زمر، آیت:۳۵، سورۂ تحریم، آیت:۸، سورۂ ہود، آیت:۱۴۴)

اچھے اور برے اعمال کا ایک دوسرے میں اثر انداز ہونے کی میزان اور اقسام کی تعیین کو وحی اور ائمہ معصومینؑ کی گفتگو کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں کوئی عام قاعدہ بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔اچھے اور برے اعمال، حبط وتکفیر ہونے کے علاوہ اس دنیا میں انسان کی توفیقات اور سلب توفیقات، خوشی

بقیہ حاشیہ ۳ کا حاشیہ اگلے ص پر......

خلاصۂ فصل

۱۔ دنیا میں انسان کی کوشش وجدوجہد آخرت میں اس کی بدبختی وخوشبختی میں بہت ہی اہم کردارادا کرتی ہے۔

۲۔ دنیاوآخرت کے رابطے کے سلسلہ میں گفتگو کرنا اس جہت سے ضروری ہے کہ موت کے بعد کی دینا پر عقیدہ رکھنا صرف اس دنیا ہی میں ہمارے اختیاری اعمال ورفتار پر موثر نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ عقیدہ ثمر بخش ہے جب انسان کے اعمال ورفتار اور دنیا میں اس کے طریقۂ زندگی اور آخرت میں اس کی کیفیت زندگی کے درمیان رابطہ کا یقین رکھتے ہوں۔

۳۔ ایمان وعمل صالح کی سعادت اور کفر وگناہ کا اخروی بدبختی کے درمیان ایک حقیقی رابطہ ہے۔اس طرح کے آخرت میں انسان کے اعمال ملکوتی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اوراس کا وجود ملکوتی ہی آخرت میں حقیقی عمل نیز سزااور جزا ہے۔

۴۔ آخرت کی زندگی میں لوگ صرف اپنے اعمال کے نتائج دیکھتے ہیں اورکوئی کسی کے نتائج اعمال سے غلط فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے اور کسی کے برے اعمال کی سزا بھی نہیں قبول کرسکتا ہے۔﴿وان لیس للانسان الاماسعی﴾

۵۔ آخرت میں لوگ اپنی دنیاوی حالت کے اعتبار سے چار گروہ میں تقسیم ہیں:

پچھلے ص کا بقیہ حاشیہ ۳ کا حاشیہ.....

اور ناخوشی میں موثر ہیں، مثال کے طور پر دوسروں پر احسان کرنا خصوصاً والدین اور عزیز واقربا پر احسان کرنا آفتوں اور بلاؤں کے دفع اور طول عمر کا سبب ہوتا ہے اور بزرگوں کی بے احترامی کرنا توفیقات کے سلب ہونے کا موجب ہوتا ہے۔لیکن ان آثار کا مرتب ہونا اعمال کے پوری طرح سے جزاوسزا کے دریافت ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ حقیقی جزاوسزا کا مقام جہان اخروی ہے۔

شفاعت کے کرداراوراس کے شرائط کے حامل ہونے کی آگاہی اوراس سلسلہ میں بیان کئے گئے شبہات اوران کے جوابات سے مطلع ہونے کے لئے ملحقات کی طرف مراجعہ کریں۔

(الف) وہ لوگ جو دنیا و آخرت کی نعمتوں سے مستفیض ہیں۔

(ب) وہ لوگ جو دنیا و آخرت میں محروم ہیں۔

(ج) وہ لوگ جو دنیا میں محروم اور آخرت میں بہرہ مند ہیں۔

(د) وہ لوگ جو آخرت میں محروم اور دنیا میں بہرہ مند ہیں۔

۶۔ ایمان و عمل صالح اس وقت فائدہ مند ہیں جب انسان، آخری عمر تک اپنے ایمان کی حفاظت کرے۔

تمرین

۱۔عمر کے آخری حصہ میں کافر ہو جانے کی وجہ سے کیا کسی انسان کے تمام اعمال صالحہ کے تباہ و برباد ہو جانے کا کوئی عقلی جواز پیش کیا جا سکتا ہے؟اور کس طرح؟

۲۔انسان کا حقیقی کمال نیز بدبختی اور خوشبختی کے مسئلہ میں معاد کو تسلیم کرنے والوں کے نظریات اور منکرین معاد کے نظریات کا اختلاف کس چیز میں ہے؟ مفہوم و مصداق میں یا دونوں میں یا کسی اور چیز میں ہے وضاحت کریں؟

۳۔اگر ہر انسان عالم آخرت میں صرف اپنے اعمال کا نتیجہ پاتا ہے تو سورۂ نحل کی ۲۵ ویں آیت سے مراد کیا ہے؟

۴۔دنیاوی زندگی میں مندرجہ ذیل اقسام رابطہ میں سے کون سا رابطہ مفید ہے؟اور کون سا آخرت میں مفید نہیں ہے؟

الف—خاندانی رابطہ۔

ب—دوستی کا رابطہ۔

ج—اعتباری اور وضعی رابطہ (اعتباری اور وضعی قوانین) (تکوینی رابطہ) (علی قوانین)

۵۔مرے ہوئے لوگوں کی اخروی زندگی میں، زندہ لوگوں کی دعاؤں کا کیا اثر ہے اور کس طرح اس حقیقت سے (کہ ہر انسان صرف اپنے نتیجہ اعمال کو پاتا ہے) سازگار ہے؟

مزید مطالعہ کے لئے

۔حسینی طہرانی، محمد حسین، (۱۴۰۷) معاد شناسی، ج۹، تہران: حکمت۔

۔جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۳) دہ مقالہ پیرامون مبداء و معاد، تہران: الزہراء۔

۔محمد حسین طباطبائی، (۱۳۵۹) فرازہای از اسلام، تہران، جہان آراء۔

۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۰) آموزش عقاید، ج ۳، تہران: سازمان تبلیغات اسلامی۔

۔............(۱۳۶۷) معارف قرآن (جہان شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) قم موسسہ درراہ حق۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۶۸) مجموعہ آثار، ج ا، تہران، صدرا۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۶۹) مجموعہ آثار، ج ا، تہران، صدرا۔

۔مطہری، مرتضی (۱۳۵۴) سیری در نہج البلاغہ، قم، دار التبلیغ اسلامی۔

ملحقات

ا۔ شفاعت

شفاعت، شفع (جفت، زوج) سے لیا گیا ہے۔ اور عرف میں یہ معنی ہے کہ کوئی عزت دار شخص کسی بزرگ سے خواہش کرے کہ وہ اس کے (جس کی شفاعت کر رہا ہے) جرم کی سزا معاف کر دے۔ یا خدمت گذار فرد کی جزا میں اضافہ کر دے۔

شفاعت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان، شفیع کی مدد کے بغیر سزا سے بچنے یا جزا کے ملنے کے لائق نہیں ہے لیکن شفیع کی درخواست سے اس کے لئے یہ حق حاصل ہو جائے گا۔

شفاعت، برائیوں سے توبہ وتکفیر کے علاوہ ہے جو کہ گنہگاروں کی امید کی آخری کرن اور خداوند عالم کی رحمت کا سب سے عظیم مظہر ہے۔ شفاعت کا معنی شفیع کی طرف سے خداوند عالم پر اثر انداز ہونا نہیں ہے۔ شفاعت کا انکار کرنے والی آیات سے مراد جیسے ﴿لا یُقبَلُ مِنها شَفَاعَةٌ﴾ ''سورۂ بقرہ، آیت: ۴۸ و ۱۲۳'' کی آیت کا یہی معنی ہے۔ لفظ شفاعت کبھی وسیع تر معنی یعنی دوسرے انسان کے ذریعہ کسی انسان کے لئے کسی طرح سے اثر خیر ظاہر ہونے میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرزندوں کے لئے والدین کا موثر ہونا اور اس کے برعکس یعنی والدین کے لئے بچوں کا موثر ہونا یا اساتید اور رہنما حضرات کا شاگردوں اور ہدایت پانے والوں کے حوالے سے حتی مؤذن کی آواز ان لوگوں کے لئے جو اس کی آواز سے نماز کو یاد کرتے ہیں اور مسجد جاتے ہیں شفاعت کہا جاتا ہے۔ وہی اثر خیر جو دنیا میں تھا آخرت میں شفاعت کی صورت میں ظاہر ہوگا جس طرح گناہوں کے لئے استغفار نیز دوسری دنیاوی حاجات کے پورا ہونے کے لئے دعا کرنے کو شفاعت کہا جاتا ہے۔

شفاعت کے مندرجہ ذیل قوانین ہیں:

(الف) خداوند عالم کی طرف سے شفیع کو اجازت۔

(ب) شفاعت پانے والوں کے اعمال نیز اس کی اہمیت وعظمت سے شفاعت کرنے والوں کا آگاہ ہونا۔

(ج) دین وایمان کے حوالے سے شفاعت پانے والوں کا ممدوح اور پسندیدہ ہونا۔

حقیقی شفاعت کرنے والے خداوند عالم کی طرف سے ماذون ہونے کے علاوہ معصیت کار اور گنہگار نہ ہوں۔

اہل اطاعت ومعصیت کے مراتب کو پرکھنے کی ان کے اندر صلاحیت ہو نیز شفاعت کرنے والوں کے ماننے والے بھی کم ترین درجہ کے شفیع ہوں دوسری طرف وہی شفاعت پانے کے قابل ہیں جو خداوند کریم کی اجازت کے علاوہ خدا انبیاء حشر اور وہ تمام چیزیں جو خداوند عالم نے اپنے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں منجملہ ''شفاعت'' پر حقیقی ایمان رکھتے ہوں اور زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے ایمان کو محفوظ رکھے ہوں اور جو لوگ نماز کو ترک کریں اور فقرا کی مدد نہ کریں نیز روز قیامت کی تکذیب کریں اور خود شفاعت سے انکار کریں یا اس کو ہلکا سمجھیں تو ایسے لوگ شفاعت سے محروم ہیں۔

اس دنیا میں شفیع کی شفاعت کا قبول کرنا شفیع کی ہمنشینی اور محبت کی لذت کے ختم ہو جانے کا خوف یا شفیع کی طرف سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ یا شفیع سے شفاعت کے قبول کرنے کی ضرورت کی وجہ سے شفاعت انجام پاتی ہے لیکن خداوند عالم کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے قبول ہونے کی دلیل مذکورہ امور نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم کی وسیع رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ دائمی رحمت کے حاصل کرنے کی بہت کم صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے شرائط وضوابط کے ساتھ کوئی راستہ فراہم کرنے کا نام شفاعت ہے۔

۲۔شفاعت کے بارے میں اعتراضات وشبہات

شفاعت کے بارے میں بہت سے اعتراضات وشبہات بیان کئے گئے، یہاں پر ہم ان میں سے بعض اہم اعتراضات وشبہات کا تجزیہ کریں گے۔

پہلا شبہ: پہلا شبہ یہ ہے کہ بعض آیات قرآنی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روز قیامت کسی کی بھی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ سورہ بقرہ کی ۴۸ویں آیہ میں فرماتا ہے:

﴿وَاتَّقُوا يَوماً لا تَجزِى نَفسٌ عَن نَّفسٍ شَيئاً وَلايُقبَلُ مِنهَا شَفَاعَةٌ وَ لا يُؤخَذُ مِنهَا عَدلٌ وَلا هُم يُنصَرُونَ﴾

جواب: اس طرح کی آیات بغیر قاعدہ وقانون کے مطلقاً اور مستقل شفاعت کی نفی کرتی ہیں بلکہ جولوگ شفاعت کے معتقد ہیں وہ مزید اس بات کے قائل ہیں کہ مذکورہ آیات عام ہیں جو ان آیات کے ذریعہ خدا کی اجازت اور مخصوص قواعد وضوابط کے تحت شفاعت کے قبول کرنے پر دلالت کرتی ہیں تخصیص دی جاتی ہیں جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔

دوسرا شبہ: شفاعت کے صحیح ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر قرار پائے یعنی ان لوگوں کی شفاعت فعل الٰہی یعنی مغفرت کا سبب ہوگی۔

جواب: شفاعت کا قبول کرنا زیر اثر ہونے کے معنی میں نہیں ہے جس طرح توبہ اور دعا کا قبول ہونا بھی مذکورہ غلط لازمہ نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے ان تمام موارد میں بندوں کے اعمال کا اس طرح لائق وحقدار ہونا ہے کہ وہ رحمت الٰہی کو مبذول کرنے کا باعث بن سکیں، اصطلاحاً قابل کی شرط قابلیت اور فاعل کی شرط فاعلیت نہیں ہے۔

تیسرا شبہ: شفاعت کا لازمہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے خدا سے زیادہ مہربان ہوں، اس لئے کہ فرض یہ ہے کہ اگر ان کی شفاعت نہ ہوتی تو یہ گنہگار لوگ عذاب میں مبتلا ہو جاتے یا ہمیشہ معذب رہتے۔

جواب: شفاعت کرنے والوں کی مہربانی اور ہمدردی بھی خداوند عالم کی بے انتہا رحمت کی جھلک ہے۔ دوسرے لفظوں میں، شفاعت وہ وسیلہ اور راہ ہے جسے خداوند عالم نے خود اپنے بندوں کے گناہوں کو بخشنے کے لئے قرار دیا ہے اور جیسا کہ اشارہ ہوا کہ اس کی عظیم رحمتوں کا جلوہ اور کرشمہ اس کے منتخب بندوں میں ظاہر ہوتا ہے اسی طرح دعا اور توبہ بھی وہ ذرائع ہیں جنہیں خداوند عالم نے گناہوں کی بخشش اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قرار دیا ہے۔

چوتھا شبہ: اگر خداوند عالم کا گنہگاروں پر عذاب نازل کرنے کا حکم مقتضاء عدالت ہے تو ان کے لئے شفاعت کا قبول کرنا خلاف عدل ہوگا اور اگر شفاعت کو قبول کرنے کے نتیجہ میں عذاب الٰہی سے نجات پانا عادلانہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شفاعت کے انجام پانے سے پہلے عذاب کا حکم، غیر عادلانہ تھا۔

جواب: ہر حکم الٰہی (چاہے شفاعت سے پہلے عذاب کا حکم ہو یا شفاعت کے بعد نجات کا حکم ہو) عدل وحکمت کے مطابق ہے ایک حکم کا عادلانہ اور حکیمانہ ہونا دوسرے حکم کے عادلانہ اور حکیمانہ ہونے سے ناسازگار نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا موضوع جدا ہے۔

وضاحت: عذاب کا حکم ارتکاب گناہ کا تقاضا ہے۔ ان تقاضوں سے چشم پوشی کرنا ہی گنہگار کے حق میں شفاعت اور قبول شفاعت کے تحقق کا سبب ہوتا ہے اور عذاب سے نجات کا حکم شفاعت کرنے والوں کے شفاعت کی وجہ سے ہے، یہ موضوع اس طرح ہے کہ بلا کا دعا یا صدقہ دینے سے پہلے مقدر ہونا یا دعا اور صدقہ کے بعد بلا کا ٹل جانا ہی حکیمانہ فعل ہے۔

پانچواں شبہ: خداوند متعال نے شیطان کی پیروی کو عذاب دوذخ میں گرفتار ہونے کا سبب بتایا ہے جیسا کہ سورہ حجر کی ۴۲ و ۴۳ ویں آیتوں میں فرماتا ہے:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيسَ لَکَ عَلَيهِم سُلطَانٌ إِلاّمَنِ اتبَعَکَ مِنَ الغَاوِينَ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَو عِدُهُم أَجمَعِينَ﴾

جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تجھے کسی طرح کی حکومت نہ ہوگی مگر صرف گمراہوں میں سے جو تیری پیروی کرے اور ہاں ان سب کے واسطے وعدہ بس جہنم ہے۔

آخرت میں گنہگاروں پر عذاب نازل کرنا ایک سنت الٰہی ہے اور سنت الٰہی غیر قابل تغیر ہے جیسا کہ سورہ فاطر کی ۴۳ ویں آیت میں فرماتا ہے کہ:

﴿فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبدِيلاً وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحوِيلاً﴾

ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہیں آئے گی اور ہرگز خدا کی سنت میں تغیر نہیں پیدا ہوگا۔

جب یہ بات طے ہے تو کیسے ممکن ہے کہ شفاعت کے ذریعہ خدا کی سنت نقض ہو جائے اور اس میں تغیر پیدا ہو جائے۔

جواب: جس طرح گنہگاروں پر عذاب نازل کرنا ایک سنت ہے اسی طرح واجد شرائط گنہگاروں کے لئے شفاعت قبول کرنا بھی ایک غیر قابل تغیر الٰہی سنت ہے۔ لہٰذا دونوں پر ایک ساتھ توجہ کرنا چاہیئے، خداوند عالم کی مختلف سنتیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں ان میں جس کا معیار و اعتبار زیادہ قوی ہوگا وہ دوسرے پر حاکم ہو جاتی ہے۔

چھٹا شبہ: وعدۂ شفاعت، غلط راہوں اور گناہوں کے ارتکاب میں لوگوں کی جرأت کا سبب ہوتا ہے۔

جواب: شفاعت و مغفرت ہونا مشروط ہے۔ بعض ایسی شرطوں سے کہ گنہگار اس کے حصول کا یقین پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ شفاعت کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اپنے ایمان کو اپنی زندگی کے آخری لحات تک محفوظ رکھے اور ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی ایسی شرط کے پورا ہونے پر یقین (کہ ہمارا ایمان آخری لحہ تک محفوظ رہے گا) نہیں رکھ سکتا ہے۔ دوسری طرف جو مرتکب گناہ ہوتا ہے اگر اس کے لئے بخشش کی کوئی امید اور توقع نہ ہو تو وہ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جائے گا اور یہی ناامیدی اس میں ترک گناہ کے جذبے کو کمزور کر دے گی اور آخرکار خطا و انحراف

کی طرف مائل ہو جائے گا اسی لئے خدائی مربیوں کا طریقۂ تربیت یہ رہا ہے کہ وہ ہمیشہ لوگوں کو خوف وامید کے درمیان باقی رکھتے ہیں نہ ہی رحمت خدا سے اتنا امیدوار کرتے ہیں کہ خداوند عالم کے عذاب سے محفوظ ہوجائیں اور نہ ہی ان کو عذاب سے اتنا ڈراتے ہیں کہ وہ رحمت الٰہی سے مایوس ہوجائیں اور ہمیں معلوم ہے کہ رحمت الٰہی سے مایوس اور محفوظ ہونا گناہ کبیر شمار ہوتا ہے۔

ساتواں شبہ: عذاب سے بچنے میں شفاعت کی تاثیر یعنی گنہگار شخص کو بدبختی سے بچانے اور سعادت میں دوسروں (شفاعت کرنے والے) کے کام کا موثر ہونا ہے۔ جبکہ سورۂ نجم کی ۳۹ ویں آیت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف یہ انسان کی اپنی کوشش ہے جو اسے خوش قسمت بناتی ہے۔

جواب: منزل مقصود کو پانے کے لئے کبھی خود انسان کی کوشش ہوتی ہے جو آخری منزل تک جاری رہتی ہے اور کبھی مقدمات اور واسطوں کے فراہم کرنے سے انجام پاتی ہے۔ جو شخص مورد شفاعت قرار پاتا ہے وہ بھی مقدمات سعادت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کہ ایمان لانا اور استحقاق شفاعت کے شرائط کا حاصل کرنا حصول سعادت کی راہ میں ایک طرح کی کوشش شمار ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوشش ناقص و بے فائدہ کیوں نہ ہو۔

اسی وجہ سے مدتوں برزخ کی سختیوں اور غموں میں مبتلا ہونے کے بعد انسان میدان محشر میں وارد ہوگا لیکن بہر حال خود ہی سعادت کے بیج (یعنی ایمان) کو اپنے زمین دل میں بوئے اور اس کو اپنے اچھے اعمال سے آبیاری کرے اس طرح کہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک خشک نہ ہونے دے تو یہ اس کی انتہائی سعادت و خوش بختی ہوگی جو خود اسی کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ شفاعت کرنے والے بھی ایک طرح سے اس درخت کے ثمر بخش ہونے میں موثر ہیں جس طرح اس دنیا میں بھی بعض لوگ بعض دوسرے افراد کی تربیت و ہدایت میں موثر واقع ہوتے ہیں لیکن ان کی یہ تاثیر اس شخص کی جستجو کی نفی کا معنی نہیں دیتی ہے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو: محمد تقی مصباح، آموزش عقاید، ج ۳ سازمان تبلیغات، تہران ۱۳۷۰۔

فہرست منابع

۱۔قرآن کریم۔

۲۔آرن ریمن (۱۳۷۰) مراحل اساسی اندیشه در جامعه شناسی، ترجمه باقر پرهام، تہران، انتشارات آموزش انقلاب اسلامی۔

۳۔آلوسی، سید محمود (۱۴۰۸) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی، بیروت، دار الفکر.

۴۔ابوزید، منیٰ احمد (۱۴۱۴) الانسان فی الفلسفته الاسلامیة، بیروت مؤسسة الجامعیة للدراسات.

۵۔احمدی، بابک (۱۳۷۳) مدرنیتہ و اندیشہ انتقادی، تہران، مرکز۔

۶۔احمدی، بابک (۱۳۷۷) معماری مدرنیتہ، تہران، مرکز۔

۷۔استیونسن، لسلی (۱۳۶۸) ہفت نظریہ دربارہ طبیعت انسان، تہران، رشد۔

۸۔ایزوتسو، توشی ہیکو (۱۳۶۸) خدا و انسان در قرآن، ترجمہ احمد آرام، تہران: دفتر نشر فرہنگ اسلامی۔

۹۔باربور، ایان (۱۳۶۲) علم و دین، ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی، تہران، مرکز نشر دانشگاہی۔

۱۰۔ بارس، بولک، ودیگران (۱۳۶۹) فرہنگ اندیشہ نو، ترجمہ ع، پاشائی تہران: مازیار۔

۱۱۔ بدوی، عبدالرحمٰن (۱۹۸۴) موسوعة الفلسفة، بیروت: المؤسسة العربية للدراسات و النشر۔

۱۲۔ بوکائی، موریس (۱۳۶۸) مقایسہ ای تطبیقی میان تورات، انجیل، قرآن وعلم، ترجمہ ذبیح اللہ دبیر، تہران: نشر فرہنگ اسلامی۔

۱۳۔ پاکر، ڈونیس (۱۳۷۰) آدم سازان، ترجمہ حسن افشار، تہران: بہبہانی۔

۱۴۔ پاپر، کارل (۱۳۶۹) جستجوی ناتمام، ترجمہ ایرج علی آبادی، تہران۔

۱۵۔ تھانوی، محمد علی (۱۹۹۶) کشاف اصطلاحات الفنون و العلوم بیروت: مکتبة لبنان ناشرون۔

۱۶۔ ڈیوس ٹونی (۱۳۷۸) ہیومنزم، ترجمہ عباس منجر، تہران: مرکز۔

۱۷۔ جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۶۶) تفسیر موضوعی قرآن کریم: توحید و شرک، قم نہاد نمایندگی رہبری در دانشگاہ ہا۔

۱۸۔ جوادی آملی، عبداللہ (۱۳۷۸) تفسیر موضوعی قرآن کریم: اسراء۔

۱۹۔ الحر العاملی، محمد بن الحسن (۱۴۰۳) وسایل الشیعه ج ۱۹، تهران، المكتبة الاسلامية۔

۲۰۔ دفتر ہمکاری حوزہ دانشگاہ (۱۳۷۲) در آمدی بہ تعلیم و تربیت اسلامی، فلسفہ تعلیم و تربیت، تہران: سمت۔

۲۱۔ حسن زادہ، صادق (۱۳۷۸) اسوۂ عارفان، قم: انتشارات امیر المؤمنین۔

۲۲۔ دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ (۱۳۶۹) مکتبہای روان شناسی ونقد آن، ج ۱ تہران: سمت۔

۲۳۔دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ (۱۳۷۲) مکتبہای روان شناسی ونقد آن، ج ۲ تہران: سمت۔

۲۴۔ ڈورانٹ، ویل (۱۳۷۱) تاریخ تمدن، ترجمہ صفدر تقی زادہ و ابو طالب صارمی، ج ۵، تہران، انتشارات وآموزش انقلاب اسلامی، ایران۔

۲۵۔ڈورکھیم، امیل (۱۳۵۹) قواعد روش جامعہ شناسی، ترجمہ علی محمد کاردان تہران: دانشگاہ تہران۔

۲۶۔رشید رضا، محمد۔المنار فی تفسیر القرآن، بیروت: دار المعرفته.

۲۷۔رضی موسوی، شریف محمد (۱۴۰۸) نهج البلاغه، مصحح صحبی صالحی، قم: دار الهجرة.

۲۸۔رنڈل، جان ہرمان (۱۳۷۶) سیر تکامل عقل نوین، ترجمہ ابوالقاسم پایندہ تہران، انتشارات علمی وفرہنگی، ایران۔

۲۹۔روزنتال، یودین، ودوسرے افراد (۱۹۷۸) الموسوعة الفلسفية ترجمه سمير كرم، بيروت: دار الطبيعة.

۳۰۔زیادہ، معن (۱۹۸۶) الموسوعة الفلسفية، بيروت، معهد الانماء العربی۔

۳۱۔سبحانی، جعفر (۱۴۱۱) الالهيات على ضوء الكتاب والسنة والعقل قم، المركز العالمی للدراسات الاسلامية.

۳۲۔شفلر، ایزرائل (۱۳۷۷) درباب استعداد ہای آدمی (گفتاری در فلسفہ تعلیم و تربیت) تہران، جہاد دانشگاہی۔

۳۳۔سلطانی نسب، رضا وفرہاد گرجی (۱۳۶۸) جنین شناسی انسان (بررسی تکامل طبیعی و غیر طبیعی انسان، تہران: جہاد دانشگاہی۔

۳۴۔شاکرین، حمید رضا ''قرآن درویان شناسی'' مجلّہ حوزہ ودانشگاہ، شمارہ ۸ص ۲۲، ۲۵۔

۳۵۔صانع پور، مریم (۱۳۷۸) نقدی بر مبانی معرفت شناسی ہیومنیسٹی، تہران: دانش و اندیشہ معاصر۔

۳۶۔صدوق، ابو جعفر حسین (۱۳۷۸) التوحید، تہران: مکتبة الصدوق.

۳۷۔طبارہ، عبدالفتاح، خلق الانسان، دراسته علمية قرآنية، ج ۲ بيروت.

۳۸۔طباطبائی، محمد حسین (۱۳۸۸) المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ۲، ۱۵، ۷، تهران: دارالکتب الاسلامية.

۳۹۔طوسی، خواجہ نصیر الدین (۱۳۴۴) اوصاف الاشراف، تہران: وزارت فرہنگ و ہنر۔

۴۰۔طبرسی، ابو علی فضل (۱۳۷۹) مجمع البیان لعلوم القرآن، تهران مكتبة العليمة الاسلامية.

۴۱۔طہ، فرج عبدالقادر (۱۹۹۳) موسوعة علم النفس والتحليل النفسی، کویت: دار السعادة الصباح.

۴۲۔عبودیت، عبدالرسول (۱۳۷۸) ہستی شناسی، ج ۱، قم: موسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینیؒ۔

۴۳۔ العطاس، محمد نقیب (۱۳۷۴) اسلام و دنیوی گروی، ترجمہ احمد آرام تہران: موسسہ مطالعاتی اسلامی دانشگاہ تہران۔

۴۴۔فرینکل، ویکٹورامیل (۱۳۷۵) انسان در جستجوی معنی، ترجمہ اکبر معارفی تہران: دانشگاہ تہران۔

۴۵۔فرینکل، ویکٹور امیل (۱۳۷۲) پزشک روح، ترجمہ فرخ سیف، بہزاد تہران: درسا۔

۴۶۔ فرینکل، ویکٹور امیل (۱۳۷۱) ریاد ناشنیدہ معنی، ترجمہ علی علوی نیا و مصطفیٰ تبریزی، (بی جا) یادآوران۔

۴۷۔فولادوند، عزت اللہ ''سیر انسان شناسی در فلسفہ غرب از یونان تا کنون'' نگاہ حوزہ، شمارہ ۵۳، ۵۴۔

۴۸۔قاسم لو، یعقوب (۱۳۷۹) طبیب عاشقان، قم: نسیم حیات۔

۴۹۔کیسیرر، ارنسٹ (۱۳۶۰) فلسفہ و فرہنگ، ترجمہ بزرگ نادرزادہ، تہران: موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی۔

۵۰۔کیسیرر، ارنسٹ (۱۳۷۰) فلسفہ روشنگری، ترجمہ یداللہ موقن، تہران: نیلوفر۔

۵۱۔کلینی، محمد بن یعقوب (۱۳۸۸) اصول کافی، ج ۱و۲، تہران: دار الکتب الاسلامیہ۔

۵۲۔کوزر، لوئیس (۱۳۶۸) زندگی و اندیشہ بزرگان جامعہ شناسی، ترجمہ محسن ثلاثی، تہران: علمی۔

۵۳۔لالانڈ، اینڈریو (۱۹۹۶) موسوعة لالاند الفلسفیه، ترجمہ خلیل احمد خلیل بیروت: منشورات عویدات۔

۵۴۔لالانڈ، اینڈریو (۱۳۷۷) فرہنگ علمی انتقادی فلسفہ، ترجمہ غلام رضا وثیق تہران: فردوسی ایران۔

۵۵۔مان، مائکل (۱۴۱۴) موسوعة العلوم الاجتماعية، ترجمه عادل مختار الهواری، مکتبة الفلاح الامارات العربية المتحدة.

۵۶۔مجلسی، محمد باقر (۱۳۶۳) بحار الانوار، ج ۱، ۵، ۱۱، ۲۱، ۶۷، تہران: دار الکتب الاسلامیہ۔

۵۷۔محمد تقی مصباح (۱۳۶۵) آموزش فلسفہ ج ۲، تہران: سازمان تبلیغات۔
۵۸۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۵) اخلاق در قرآن، ج ا قم: موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینیؒ۔
۵۹۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۶) معارف قرآن (خدا شناسی، کیہان شناسی، انسان شناسی) موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینیؒ۔
۶۰۔محمد تقی مصباح خودشناسی برای خودسازی، قم موسسہ در راہ حق۔
۶۱۔محمد تقی مصباح (۱۳۷۰) آموزش عقاید ج ۳، تہران: سازمان تبلیغات۔
۶۲۔محمد تقی مصباح (۱۳۶۸) جامعہ وتاریخ از دیدگاہ قرآن، تہران سازمان تبلیغات اسلامی۔
۶۳۔محمد تقی مصباح، راہنما شناسی، قم: حوزہ علمیہ قم۔
۶۴۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۰) مجموعہ آثار ج ۳، تہران: صدرا۔
۶۵۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) مجموعہ آثار، ج ۶، تہران: صدرا۔
۶۶۔مطہری، مرتضی (۱۳۷۱) انسان کامل، تہران: صدرا۔
۶۷۔مطہری، مرتضی (۱۳۴۵) سیری در نہج البلاغہ، قم، دار التبلیغ اسلامی۔
۶۸۔ملکیان، مصطفیٰ (۱۳۷۵) اگزیستانسیالیزم، فلسفہ عصیان وشورش، محمد غیاثی قم۔
۶۹۔نوذری، حسین علی، صورتبندی مدرنیتہ وپست مدرنیتہ، تہران: چاپخانہ علمی وفرہنگی، ایران۔
۷۰۔نوری، میرزا حسین (۱۴۰۸) مستدرک الوسائل، ج ۶، بیروت: موسسہ آل البیت لاحیاء التراث.
۷۱۔وعظی، احمد (۱۳۷۷) انسان در اسلام، سمت (دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ)
(72).Webster Mariam, (1988) Webster's Nineth Collegiate Dictionary, U.S.A.

(73). Kupet Adam, (1958) the social Sciences Encyclopedia,Rotlage and Kogan Paul.

(74). Theordorson, George,(1969) abnd Acilles, G.A. Modern Dictionary of sociology,NEW YORK,Thomas, Y. Prowerl.

(75).Lw. R.I.Z. Encyclopedia of Religion, (1974) the New (15th).

(76). Paul, Edward,(1976). Encyclopedia of Philosophy, NEW YORK, Macmillan.

قابل ذکر بات یہ کہ بہت سے مذکورہ ذرائع ''مزید مطالعہ'' کے عنوان سے اس کتاب کے ہر فصل کی تالیف میں مورد استفادہ واقع ہوئے ہیں۔لیکن چونکہ ان کی معلومات اسی موضوع فصل کے تحت تھیں اور ان ذرائع سے ان کے استفادہ کی مقدار بھی کم ہونے کی بنا پر دوبارہ ذکر کرنے سے پرہیز کیا جارہا ہے۔

سوالات

۱۔ انسان شناسی سے خدا شناسی، نبوت و معاد کے رابطہ کی وضاحت کیجئے؟

۲۔ دور حاضر میں انسان شناسی کے بحران کی چار مرکزی بحثوں کو بیان کیجئے؟

۳۔ ہیومنزم کے چار نتائج و پیغامات کو بیان کرتے ہوئے ہر ایک کی اختصار کے ساتھ وضاحت کیجئے؟

۴۔ ہیومنزم کے تفکرات کو بیان کرتے ہوئے تبصرہ وتنقید کیجئے؟

۵۔ خود فراموش انسان کی خصوصیات اور خود فراموشی کے نتائج کو بیان کرتے ہوئے کم از کم پانچ موارد کی طرف اشارہ کیجئے؟

۶۔ خود فراموشی کے علاج کے عملی طریقوں کی تحلیل کیجئے؟

۷۔ قرآن مجید کی تین آیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے خلقت انسان کی وضاحت کیجئے؟

۸۔ انسان کے جانبہ ہونے کی دلیلیں پیش کیجئے؟

۹۔ دینی اعتبار سے انسان کی مشترکہ فطرت کا سب سے مرکزی عنصر کیا ہے؟

۱۰۔ فطرت کے لازوال ہونے کی سورۂ روم کی تیسویں آیت سے وضاحت کیجئے اور مذکورہ آیہ میں ﴿لا تبدیل لخلق اللّٰہ﴾ سے مراد کیا ہے وضاحت کیجئے؟

۱۱۔قرآنی اصطلاح میں ان کلمات، روح، نفس، عقل وقلب کا آپس میں کیا رابطہ ہے وضاحت کیجئے؟

۱۲۔کرامت انسان سے کیا مراد ہے وضاحت کرتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اس کی اقسام کا ذکر کیجئے؟

۱۳۔کیا آیۂ شریفہ ﴿ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی ﴾ عقیدہ جبر کی تائید نہیں کرتی ہے؟ اور کیوں؟

۱۴۔جبر الٰہی کے سلسلہ میں جو شبہات پیدا ہوئے ہیں ان کا جواب دیجئے؟

۱۵۔ان تین عناصر کو بیان کیجئے جن کا انسان ہر اختیاری عمل کے انجام دینے میں محتاج ہے؟

۱۶۔امور انسانی کے انتخاب کے معیار کی وضاحت کیجئے؟

۱۷۔قرآن وروایات کی زبان میں کیوں اچھے اعمال کو ''عمل صالح'' کہا گیا ہے؟

۱۸۔اسلام کی نظر میں انسان کامل کی خصوصیات کیا ہیں؟

۱۹۔قرآن میں ذکر کئے گئے کلمات دنیا اور آخرت کے تین موارد استعمال کو بیان کیجئے؟

۲۰۔اواخر عمر میں کفر کی وجہ سے کسی شخص کے تمام اچھے اعمال برباد ہو جانے کے بارے میں مناسب جواز پیش کیجئے؟

ہماری مطبوعات

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
صحیفۂ سجادیہ (مجموعۂ ادعیہ امام زین العابدینؑ)	۲۰۰	مترجمین صحیفۂ سجادیہ	۱۲۵
فقہی مسائل کا مجموعہ (آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ العالی)	۲۰۰	تاریخ اسلام	۲۳۰
اعمال و مسائل حج (رنگین)	۷۰	اسلام پر مغربی تمدن کی یلغار	۸۰
حج کے مسائل	۵۰	اسلام اور آج کا انسان	۱۷۵
حج بیت اللہ الحرام (انسانی و اسلامی اتحاد کا مظہر)	۷۰	اسلام اور بیسویں صدی کی تہذیب	۱۰۰
بہار قرآن اور آداب ماہ رمضان	۳۰۰	اسلامی بیداری	۱۱۰
تحفۂ رمضان	۱۲۵	اسلامی بیداری میں شہید مطہریؒ کا کردار	۱۲۰
فہرست نہج البلاغہ	۴۰	اسلامی اتحاد شہید مطہریؒ کی نظر میں	۱۰۰
شارحین نہج البلاغہ	۲۵۰	اتحاد اسلامی	۱۲۰
منظوم نہج البلاغہ	۲۲۰	عرفان اسلامی (ایک تحقیقی جائزہ)	۲۲۰
مطالعۂ نہج البلاغہ	۱۷۵	حافظ اسرار	۱۵۰
مؤلفین غدیر	۲۰۰	خط امان (امام زمانہؑ دیگر ادیان کی نظر میں)	۲۵۰
انوار فاطمہؑ	۲۰۰	مجموعہ مقالات (جلد اول، دوم)	۲۷۵
سیرت نگاری فاطمہ زہراؑ	۱۰۰	علامہ یوسف حسین حیات اور خدمات	۱۰۰
تجلیات عصمت	۱۵۰	جوان اور شریک حیات کا انتخاب	۱۵۰
اخلاق محمدی	۶۰	خواہشیں احادیث اہلبیتؑ کی روشنی میں	۲۰۰
فوائد نماز	۴۵	کلام رہنما	۲۱۰
منظوم کلام معصومینؑ	۲۲۰	ستون شیعیت	۵۰

۳۰۰	Nahjul-Balagha	۲۵۰	فلسطین
۲۵۰	Sahifa-e-Sajjadiyyah	۲۰۰	۷۲ عاشورائی کلام
۴۰	Nahjul-Balagha in the Eye Imam Khamnaie	۲۵۰	شہدائے کربلا کے خونچکاں اوراق کا تحقیقی مطالعہ
۲۵۰	An Introduction to Islamic Mysticism	۲۲۰	کربلا ایک ابدی حقیقت
۱۵۰	The Mystical Maktubat	۲۱۰	محرم الحرام اور نوجوانوں کے سوالات
۲۵۰	The Impact of the Andalusian Mystic	۱۵۰	مدینہ سے مدینہ تک
۱۵۰	Commandment of Life	۱۰۰	وہابیت دوراہے پر!!
۱۵	आमाल व मसाइले हज		

Welayat Foundation

Contact:09958225575
E-mail: welayatfoundation@gmail.com
Web:www.welayat.com-www.welayat.in

مجمع جہانی اہل بیت